سیّد فارغ بخاری

سید فارغ بخاری کی

خود نوشت یادداشتوں پہ مبنی سوانح
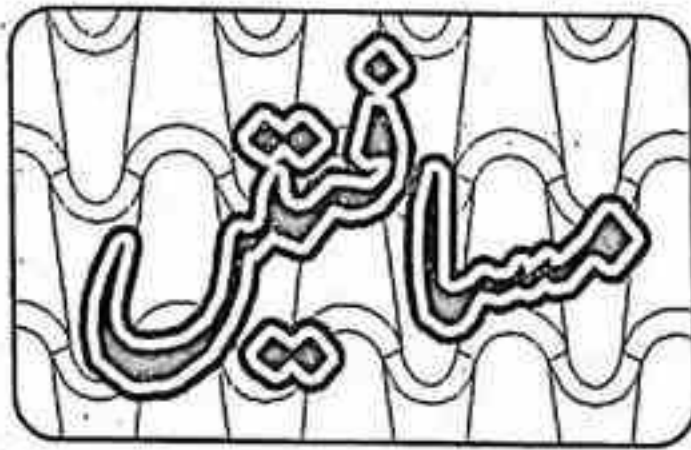
مرتب :-

سید قمر عباس بخاری

مکتبہ سنگ میل قمر عباس ہاؤس مدینہ سٹریٹ گلبہار کالونی نمبر 4 پشاور

کتاب ---- مسافتیں
مولف ---- سید فارغ بخاری
مطبع ---- گولڈن پرنٹنگ پریس
جہانگیر پورہ بازار پشاور شہر
ناشر ---- سید قمر عباس مدینہ سٹریٹ عشرت سینما روڈ
گل بہار کالونی نمبر 4 پشاور شہر
قیمت ---- 200/=

انتساب

دشمنوں کے نام جو

دشمنی میں اس قدر ستے نہ تھے
دوستی کے بھیس میں ڈستے نہ تھے

قاتلوں کے نام

قتل تو کرتے تھے تڑپاتے نہ تھے
بے کفن لاشوں کو دفناتے نہ تھے

حاکموں کے نام

آمر مطلق تھے گو عادل نہ تھے
اپنے فن میں اس قدر ماہر نہ تھے

عہد میں ان کے یہاں

کون سی حسرت جو دل میں نہ تھی
زندگانی اتنی مشکل میں نہ تھی

موضوع نما

پیش لفظ

میرے والد کی آخری خواہش اپنی زندگی کی یاداشتیں لکھنی تھی انہوں نے بے تحاشا لکھا لیکن بدقسمتی سے جب آخر میں اپنی زندگی کے حالات لکھنے کی باری آئی تو ان کی یاداشت نے جواب دے دیا - لندن کی جلا وطنی سے پاکستان واپس آئے تو صورت حال یہ تھی کہ سوانح عمری کا لکھنا جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا جو ملتا اس سے یہی کہتے کہ آج کل سوانح عمری لکھنے میں مصروف ہوں لیکن اب ذہنی طور پر اس قابل نہ تھے کہ یہ کام مکمل کرسکتے نتیجتاً" کچھ صفحے لکھے اور پھر ایک واقعے کو بار بار لکھنا شروع کردیا - کچھ نوٹس غالباً" لندن کی ایک ڈائری سے ملے اور پھر یاداشت نے مکمل ساتھ چھوڑ دیا - میں نے گھر کی لائبریری کی صفائی کی تو بہت سے نامکمل صفحات ہاتھ آئے - کچھ نوٹس بھی ملے جو میں نے اکٹھے کرلئے اور خیال تھا کہ ان کو مرتب کرکے ماموں رضا ہمدانی کے حوالے کردوں گا کہ ان سے زیادہ اس کام کو اچھے طریقے سے مکمل کرنا کسی کے لئے ممکن نہ تھا - بدقسمتی سے ماموں بھی فوت ہوگئے اور یہ یاداشتیں اسی طرح میرا منہ چڑاتی رہ گئیں -

جب میں سانحہ وزیر باغ کے سلسلے میں پشاور سنٹرل جیل پہنچا تو میں نے یہ تمام کاغذات منگوا لئے میرا بھانجا اسد علی بھی بے گناہ اس واقعے میں میرے ساتھ جیل میں تھا ہم نے وقت کو غنیمت جانا اور کمر باندھ کر سوانح عمری مکمل کرنے میں لگ گئے - اسد علی آخوندزادہ نے میرے ساتھ بڑی محنت کی اور دو ماہ کے اندر اندر ہم نے کتاب مکمل کرلی - اس کتاب میں وہ تمام نوٹس جو ابو نے خود تیار کئے تھے میں نے ترتیب دے کر شامل کرلئے جہاں انہیں نامکمل دیکھا وہاں اپنی یاداشت اور والدہ صاحبہ سے مدد حاصل کی آخری باب مکمل طور پر خود

ساری دنیا سے بھوک افلاس جہالت کے خاتمے کے لئے خود بھوکا پیاسا رہ کر جدوجہد کرتا رہا۔ جدوجہد بھی کیسی۔ عملی اور سچ مچ کی مار کھانے بے روزگار رہنے اور جیل جانے والی' سارے سماج کو انصاف و صداقت فراہم کرنے کے لئے خود طرح طرح کی سماجی نا انصافیوں اور جھوٹ کے پیمبروں سے ٹکراتا سر پھوڑتا رہا۔

اولاد آدم کے دکھ درد بانٹنے کے سپنے دیکھنے والے فارغ اپنی آل اولاد کو درود آلام میں مبتلا کرتے رہے۔ فارغ کی آگ میں اس کے بال بچے بھی جلتے رہے۔ اب تک جل رہے ہیں۔ فارغ کے دل میں انقلاب اوراشتراکی انصاف و اقتصاد کی بھٹی نہ جلتی تو ان کا اپنا وجود' گھربار' خاندان ان شعلوں کی لپیٹ میں کیوں کر آتا۔ وہ بھی عام انسانوں کی طرح روٹی روزگار کے چکروں میں پڑ کر ایک مستحکم و پائیدار زندگی بناتے سنوارتے' یقیناً" ترقی کرتے' دولت جائیداد بناتے۔ خود بھی خوش رہتے اور بال بچے بھی خوش رہتے' شاعری کا کیا ہے شاعری تو وہ لوگ بھی کئے جاتے ہیں کر رہے ہیں جن کے دل میں فارغ جیسی تخلیقی آگ کی ایک رمق ایک شمہ بھی موجود نہیں ہے۔ ننانوے فیصد شعراء کے لئے شاعری محض عروض اور ناپ تول کے فیتوں کے نام ہے۔ نظریہ انقلاب اور گھر پھونک تماشہ دیکھ افکار و تصورات کس چڑیا کا نام ہے۔ دانشوری صوفے پر بیٹھ کر اور چائے کی پیالی میں طوفان اٹھا کر بھی بگھاری جاسکتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دھواں دھار انقلابی نظمیں لکھ کر سٹیج سے نشر بھی کی جاسکتی ہے عملی طور پر جدوجہد کے سمندر میں کودنے کا نسخہ کس ڈاکٹر نے بتایا ہے۔

فارغ بخاری کو کسی ڈاکٹری نسخے کی ضرورت نہ تھی کہ وہ خود چھوٹے موٹے ڈاکٹر بھی تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ عجب آزاد آدمی تھا۔ جھوٹے

دھرم، فرسودہ رسوم و روایات، نقلی جکڑ بندیوں کا باغی، زنجیریں توڑنے والا، بار بار اپنا شہر گھر بار چھوڑ چھاڑ پتہ نہیں کس کس نگری میں پھرنے نکل جاتا یہ آزاد مسافر کبھی کلکتہ و بمبئی کی سڑکیں ناپتا رہا ہے تو کبھی برما و رنگون کے جنگلوں کی خاک چھاننے نکل جاتا ہے کبھی لندن و نیو یارک میں پھر رہا ہے تو کبھی ڈھاکہ بنگال میں گھوم پھر رہا ہے۔ اک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔ کسی کی نہیں مانتا کسی سے نہیں ڈرتا جو جی میں آتا ہے کرتا ہے۔ جیل اس طرح جاتا ہے جس طرح کوئی پیا کے گھر جائے۔ ترقی پسندی، روشن خیالی، لبرلزم، حق گوئی و بے باکی اور سب سے بڑھ کر انقلاب ہی انقلاب اس کی رگ و پے میں سرایت ہی نہیں کئے ہوئے تھا دوڑ پھر بھی رہا تھا۔

فارغ بخاری نچلے بیٹھنے والے آدمی ہی نہ تھے۔ دل بدست، شعلہ بد امن، انقلاب بہ سر، رومان بلب، فارغ مشکلات و مصائب کو ایک کھیل سمجھ کر اس میں حصہ لیتے تھے۔ ایک آتش سیال تھے ہوا خوشبو، آگ کی طرح آزاد، علاقے اور جغرافیے سے بے نیاز، زبان کا تعصب نہ نسل و نسب کے امتیاز کا زعم، انسان پرستی اور انسان دوستی کی لہکتی مہکتی مثال، اللہ تعالیٰ نے فارغ کو ہر قسم کی تنگ نظری اور بت پرستی سے آزاد پیدا کیا تھا۔ چھوٹا سا مختصر آدمی، ہنستا کھیلتا مسکراتا مصائب کے پہاڑوں سے ٹکراتا زندگی گزار گیا۔ خوف و ہراسانی کو خاطر میں لائے بغیر۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ عجب تھا آزاد تھا اس کے ساتھ مردوں کا مرد۔ کسی شاو نسب نکتہ نظر کا مرد نہیں بلکہ مرد میدان، قلم و علم کو تلوار نہیں "مرحٹی" سمجھ کر چار سو گھمانے والا اور آ بیل مجھے مار قسم کا بے رحمی کی حد تک نڈر، ہتھیلی پر سر اور گھر رکھنے والا جیدار مرد، ان کی مردانگی اس کے شعر و سخن سے لے کر اس کے کردار عمل کے ایک ایک ذرے میں

سرایت کئے ہوئے تھی - اسی لئے میں کہتا ہوں حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا کی دعا ان کے لئے بنی تھی - وہ مغفرت کے براہ راست طلب گار بھی نہ تھے ان کا نام شاید خدا کے براہ راست طلب گاروں کی فہرست میں درج نہ ہو۔ مگر ان لوگوں کی فہرست میں سب سے اوپر تھا جن سے خدا بھی محبت کرتا ہے یعنی مستضعفین جہاں Wretched Of The Earth - اس کرّہ کے کچلے مسلے ٹھکرائے ہوئے کروڑوں بے نام و چہرہ انسان' فارغ ان میں سے تھے۔ ان کے ہی شیدائی تھے - ان کے ہی غلام اسیر اور شہید تھے - فارغ ایک غریب کی آہ سے ڈرتے تھے باقی خدا کی پوری خدائی میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے -

فارغ صاحب زندہ دل ہنسنے مسکرانے اور ہر حال میں خوش رہنے والے انسان تھے - بذلہ سنج' ہر دم گدگدی اور چہلیں کرنے والے فارغ سب کے دوست تھے - ان لوگوں کے بھی جو ان کے دشمن تھے - انداز ایسا بے تکلفی کا تھا کہ مخالف کو محبت و مروت کے پہلے ہی حملے میں زیر کرلیتا - مجھے یاد ہے کہ فارغ صاحب اپنی خود ساختہ جلا وطنی کے بعد جب لندن سے واپس پاکستان آئے تو اس وقت بھی ضیاء الحق حکومت اور مارشل لاء جاری تھا - اس وقت فارغ صاحب کو سینے سے لگانے والوں میں سب سے نمایاں شخص کرنل عنایت اللہ خان تھے - کرنل صاحب نے نہ صرف فارغ بخاری کی اوپر نیچے تین چار کتابیں اپنے ادارہ علم و فن کے بینر تلے چھاپیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کئی بھرپور شامیں ان کے ساتھ منائیں - اس وقت کی حکومت نے کرنل صاحب کے ان اقدامات کو پسند نہیں کیا - کرنل صاحب کو یہ تاثرات پہنچا دیئے گئے - اس کا جواب انہوں نے اس طرح دیا کہ فارغ بخاری کی باقی کتابیں چھاپنے کا بھی اعلان کردیا -

ایک دن فارغ صاحب نے مجھے کہا یار یہ کرنل کیسا آدمی ہے - میں تو

مارشل لاء کے بعد فوجیوں سے نفرت کرنے لگا تھا مگر اس بڑی بڑی مونچھوں والے کرنل نے تو مجھے اپنی محبت و مروت کے سمندر میں نہلا دیا ہے - یہ کیسا فوجی ہے - ہزاروں روپے میری کتابوں پر خرچ کر رہا ہے - میری پذیرائی کے لئے تقاریب منعقد کر رہا ہے سرکار کو ناراض کر رہا ہے - خود فوجی ہے مگر فوج کے ایک مخالف سے اس قدر پیار کر رہا ہے - میں نے کہا فارغ صاحب سارے فوجی ایک جیسے نہیں ہوتے پھر آپ بھی تو اس سے پیار کرتے ہیں - اس نے کہا ہاں کرتا ہوں - میں نے کہا بس پیار کا کوئی وطن قبیلہ تاریخ جغرافیہ نہیں ہوتا - دل کو دل سے راہ ہوتی ہے فارغ صاحب کرنل عنایت پر اور کرنل عنایت فارغ پر ریجھ گئے تھے -

جب فارغ صاحب بیمار ہوئے سب لوگ انہیں دیکھنے جاتے تھے مگر کرنل نہیں جایا کرتے تھے - مجھے معلوم تھا کیوں - میں پھر بھی پوچھتا تھا کیوں - وہ کہتے میں فارغ کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا - ایک دن جب ہمارے اصرار پر کرنل صاحب انہیں دیکھنے گئے تو فارغ صاحب جو مدتوں سے کسی آدمی کو نہیں پہچانتے تھے - انہیں دیکھتے ہی کہنے لگے یار کرنل تم آگئے - کرنل کو انہوں نے پہچان لیا تھا - کرنل ان کے شعور میں ہی نہیں تحت الشعور میں موجود بھی تھا - کرنل صاحب کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں - ہم بھی بے حال ہوگئے -

مجھے یاد ہے جب فارغ صاحب کی واپسی کے بعد کرنل صاحب نے ان کی آمد کی خوشی میں پہلا فنکشن ترتیب دیا تو اس کی صدارت کے لئے اکیڈمی ادبیات کے اس وقت کے سربراہ اور صوبہ سرحد کی نامور ادبی شخصیت جناب پریشان خٹک کو بطور مہمان خصوصی دعوت دی - پریشان خٹک اس وقت ضیاء الحق کی ناک کا بال اور مارشل لاء کے ہم نواؤں میں سرفہرست تھے - میں حیران و پریشان تھا کیونکہ اس سے دو تین سال قبل جب فارغ صاحب لندن میں تھے

ایک محفل میں جناب پریشان خٹک نے نام لے کر جن ادیبوں کو بھگوڑا قرار دیا تھا۔ ان میں فیض احمد فیض اور احمد فراز کے ساتھ فارغ بخاری کا نام بھی آیا تھا۔ میں اس وقت اس بات پر پریشان خٹک سے الجھ پڑا تھا اسی لئے اب سوچ رہا تھا کہ کرنل صاحب یہ فنکشن کس طرح کر پائیں گے مگر واہ رے فارغ صاحب کی محبت اور پریشان خٹک کی مروت۔ دونوں اس طرح ملے جس طرح صدیوں کے بچھڑے دوست ملتے ہیں۔ کوئی اختلافی بات نہ ہوئی۔ پریشان خٹک نے دل کھول کر فارغ کے فن فکر اور نظریات کو سراہا۔ انہیں ایک بہادر اور بلند کردار شاعر و فنکار قرار دیا۔ فارغ صاحب نے پریشان خٹک کو محبت کرنے والا صاحب جمال ادیب کہہ کر پکارا اور کہا کہ وہ دونوں کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے۔ اس طرح چہرے روشن، بال کالے اور جسم مستعد و متحرک رہیں گے اس تقریب نے میرے سامنے فارغ اور پریشان خٹک کے ظرف کی کتنی وسعتوں کو کھول دیا تھا۔ واقعی بڑے لوگوں میں خاص قسم کی بڑائیاں ہوتی ہیں۔ اس سے بڑی بات کہ محبت ضرور رنگ لاتی ہے اور بڑے بڑے زخموں کو مندمل کر دیتی ہے۔

فارغ بخاری کو سب کچھ آگیا تھا دنیاداری کرنی نہیں آئی تھی۔ نہ آتی تھی نہ سیکھی تھی۔ جس چیز کو ورلڈ لی وزڈم کہتے ہیں فارغ صاحب اس سے بالکل عاری تھے۔ اس لئے مادی ناکامیاں رج کر ان کے چاروں طرف آبسیں، جو نہیں بسیں اور راستے میں انہیں مل گئیں انہیں بھی وہ شب فراق کی طرح گھر ہی لے چلے کہ بے چاری کیا رات بھر سڑکوں پر ماری ماری پھریں گی۔ فارغ نے ان ناکامیوں سے منہ بسورنے اور چہرہ بگاڑنے۔ ۔ کا کام نہیں لیا بلکہ مردانہ وار کارزار حیات میں ڈٹ جانے کا قرینہ بنا کر زندگی کے زخموں پہ سجا لیا۔

فارغ بخاری میرے دوست نہیں تھے میرے ممدوح تھے۔ میں ان جیسا بنا

چاہتا تھا مگر ان مراحل کی تاب نہیں لا سکتا تھا جن سے وہ گزرے تھے - سچ ہے آلام کی کٹھالی میں تن من دھن پگھلا دینا کم نصیب لوگوں کا کام ہوتا ہی نہیں - یہ لوگ حسد کرسکتے ہیں یا رشک - میں فارغ صاحب کو دیکھ کر رشک ہی کرتا رہا - وہ سب کچھ ہار کر بھی خوش تھے معمور اور بھرے پُرے تھے - ہم بزعم خویش بہت کچھ پاکر بھی مضمحل و ملول تھے -

سچ ہے کہ وہ بڑے آدمی تھے اور بڑے آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں اور یہ لوگ روز پیدا ہوتے ہیں - میری ان سے یہ خاموش عقیدت ہمیشہ قائم رہی یہی وجہ ہے کہ میں بھی کرنل عنایت کی طرح ان کو اس علالت کے عالم میں نہیں دیکھ سکتا تھا - پوچھ لیتا تھا پاس جانے سے گریزاں رہتا - میری آنکھوں میں ایک اور ہی فارغ بسے ہوئے تھے بسے ہوئے ہیں - ساون کی طرح سہانے بھادوں کی طرح برستے - محبت مروت مسکراہٹ کی پھواریں اور بوچھاڑیں لئے دمکتے چہرے والے دلدار و دوست نواز انسان -

فارغ بخاری کے بارے میں اب تک بہت کم لکھا گیا ہے - ایک کتابچہ فارغ بخاری کی صحافتی زندگی کے بارے میں کسی زمانے میں عمر عامر نے تحریر کیا تھا جو اب ناپید ہے - ایک کتاب فارغ بخاری کے ایک مداح و پرستار اوکھے اور انوکھے دانشور جناب نوید شبلی نے حال ہی میں تحریر کی ہے - اس کتاب میں فارغ کے فن فکر اور شخصیت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے علاوہ کچھ دوسرے مضامین بھی ہیں جو مختلف کتابوں اور رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں -. ممکن ہے کبھی کوئی فارغ پسند مولف ان سب کو جلد میں باندھ کر کتابی صورت میں سامنے لے آئے -

فارغ صاحب نے خود بہت کچھ لکھا ہے وہ بیک وقت بہت بڑے شاعر نثر نگار اور جریدہ کار تھے قیام پاکستان سے پہلے سنگ میل جیسے ادبی رسالے کی

ایڈیٹری کرتے رہے ہیں - اس کے بعد بھی مختلف رسالوں کی ادارت بھی کی اور ان کے لئے لکھتے بھی رہے - صوبہ سرحد کی اولین ادبی تاریخ " ادبیات سرحد " لکھنے کا اعزاز بھی ان کو حاصل ہے - اب تک صوبہ سرحد پر لکھی جانے والی یہ واحد ادبی تاریخ بھی ہے - صوبہ سرحد کے پشتو ادب کو برصغیر کی اردو دنیا میں متعارف کروانے کا اعزاز بھی ان کو حاصل ہے - فارغ و رضا کی یہ اتنی بڑی ادبی خدمت ہے جسے جتنا سراہا جائے کم ہے - انہیں خاکہ نگاری کے فن پر بھی قدرت حاصل تھی - ان کے قلمی خاکوں کے دو مجموعے البم نمبر 1 اور البم نمبر 2 چھپ چکے ہیں - ان کے یہ خاکے پشاور یونیورسٹی کے ایم اردو کے کورس میں بھی شامل ہیں - ادبی تاریخ نگاری اور خاکہ نگاری کے ساتھ ساتھ انہیں صوبہ سرحد میں رپورتاژ نگاری میں بھی اولیت کا شرف حاصل ہے - صوبہ سرحد کا سب سے پہلا رپورتاژ "برات عاشقاں" ان کی ہی تحریر ہے جسے انہوں نے 1968ء میں تحریر کیا تھا - ان کی دوسری رپورتاژ "لوح غیر محفوظ" 1985ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی عالمی کانفرنس منعقدہ لندن کی یادگار ہے یہ کانفرنس فارغ صاحب کی کوششوں سے ہی منعقد ہوئی تھی - انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین لندن کے صدر کی حیثیت سے اس کانفرنس کے انعقاد کو یقینی بنایا - ان کی شاعری کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں - بے چہرہ سوال' محبتوں کے نگارخانے' آیات زندگی' زیرو بم' شیشے کے پیراہن ان کے شعری کمالات کے گلدستے ہیں - فارغ اول و آخر ترقی پسند تھے - کسی باہر کی تحریک نے ان کو ترقی پسند نہیں بنایا تھا وہ اندر سے ترقی پسند تھے - ان کردار و عمل پر اس تصور کی پوری چھاپ تھی - وہ زندگی کے آخری لمحات تک ان تصورات کے گرویدہ رہے - سویت روس میں اشتراکیت ہار چکی تھی مگر فارغ کے دل میں اس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے - کیونکہ فارغ ہتھیار ڈالنے والے آدمی تھے ہی نہیں -

فارغ بخاری کی یہ خود نوشت ایک منفرد تحریر ہے - ایک ایسے شخص کی داستان حیات جس نے اپنی زندگی اپنے ضمیر نظریے اور تصور انقلاب کی خاطر وقف آلام کر رکھی تھی - ایک ایک لمحے سے خراج وصول کیا - لڑے بھڑے، نفرتیں کیں محبتیں کیں دوستیاں دشمنیاں کیں - اپنا دل دکھایا مگر کسی ذی روح کا دل نہیں دکھایا - کسی چڑیا کے بچے کو زخمی نہیں کیا - کسی کا حق نہیں مارا اس کے باوجود جیلیں جلاوطنیاں برداشت کیں - اس کتاب میں ان کی فعال جلتی بلتی زندگی کے رنگ برنگے عکس ملیں گے - فارغ بخاری سچ نویس تھے - اپنے بارے میں بھی سچ لکھنے سے نہیں چوکتے تھے - اس کتاب میں بھی طرح طرح کے سچ ملیں گے - ممکن ہے بعض پیشانیوں پہ شکنیں پڑیں - بعض طبقے ان سے ناراض ہو جائیں - تاہم اب وہ ان چیزوں سے بے نیاز ہو چکے ہیں -

اس آتش نوا ادیب و شاعر کی سوانح عمری پڑھتے ہوئے لطف تو آتا ہے مگر افسوس اور احساس بھی ہوتا ہے کہ کاش زندگی کے آخری برسوں میں یاداشت ان کا ساتھ نہ چھوڑ جاتی اور وہ با قائمی ہوش و حواس لکھنے والی اور بھی بہت سی باتیں لکھ جاتے -

یہ سوانح ان کی بہت سے لکھے ادھ لکھے کاغذات کی مدد سے ان کے پابند سلاسل فرزند نے جیل کے اندر بیٹھ کر مرتب کی ہے - فارغ صاحب کے تین بیٹے ظفر، قمر اور طاہر ہیں ظفر مدتوں سے امریکہ میں ہے - طاہر سماجی سطح پر کچھ کام کرتا ہے قمر ایک نظریاتی سیاست دان ہے - کئی بار جیل گیا دو بار وزیر بنا، پیشے کے لحاظ سے وکیل ہے - نظریے کے لحاظ سے انسان دوست، انقلاب پسند انسان کے لحاظ سے ہنس مکھ بے تکبر اور بے ضرر، مالی لحاظ سے غریب، ذہنی لحاظ سے توانا و زرخیز اور کردار و عمل کے لحاظ سے فارغ بخاری کی سچی تصویر - جھکنے والا نہ بکنے والا، بیٹے تینوں اپنے باپ کے رنگ میں رنگے ہیں - نظریاتی لحاظ

سے تینوں مستحکم اور مستقل مزاج ہیں۔ سیاست کی گدی قمر نے سنبھالی ہے شعر و ادب کی گدی کوئی نہیں سنبھال سکا۔ گو شعری و ادبی ذوق سبھی کو وافر ملا ہے۔ ظفر کا ذوق شعری بہت عمدہ ہے۔ شاید شعر بھی کہہ لیتا ہے۔

فارغ صاحب ترقی پسند تحریک کی تاریخ کا ایک روشن باب تھے۔ وہ بہت کچھ جانتے تھے بہت کچھ لکھ سکتے ہیں۔ منہ زور جرأت اظہار کے مالک تھے۔ آخری عمر کا ذہنی عارضہ اور جسمانی عجز آڑے نہ آتا تو شاید اپنی سوانح عمری کی صورت میں ادب کو سب سے بیش بہا تحفہ دے جاتے۔ ان کی تہلکہ خیز زندگی کے ستر سالوں میں رومان بھی بہت تھے اور انقلاب بھی بہت' یہ دنیائے ادب کی بد نصیبی ہے کہ ایسا شخص جب اپنا اور دوسروں کا حال لکھنے بیٹھا تو یادوں کے چراغ پہلے ٹمٹمائے پھر کچھ عرصہ بعد بے نور ہوگئے۔ قمر عباس نے بڑی محنت کی ہے۔ جیل میں ذاتی صدموں سے چور وہ عظیم والد کے مسودوں سے موتی چن کر سوانح کا چراغاں کرتا رہا۔ قمر اس حوالے سے دنیائے ادب سے بھی داد کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ یوں اس حوالے سے میں اسے ایک ادھوری سوانح عمری ہی کہوں گا۔ با ایں ہمہ جو کچھ دستیاب ہے غنیمت ہے۔ ایک تبرک ہے۔ گو دنیائے ادب و سیاست بڑے انکشافات سے محروم رہ گئی تاہم اسے ایک مستند لکھنے والے کی مستند خود نوشت دستیاب ہوگئی۔

فارغ بخاری نے جب آخری ہچکی لی میں اس وقت دہلی میں تھا۔ ٹیلی فون پر بیوی سے بات ہوئی تو اس نے سب سے پہلی خبر یہی سنائی۔ اس کے لئے بھی اس وقت اس سے بڑی اور کوئی خبر نہ تھی۔ میں نے ٹیلی فون بند کردیا۔ دہلی میں کس سے تعزیت کروں کس سے تسلی چاہوں دو دن پہلے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے سربراہ ڈاکٹر امیر عارفی اور عالمی شہرت یافتہ ادیب و محقق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے فارغ صاحب کا احوال پوچھا تھا۔ میں نے ان کو بتایا تھا کہ وہ

وہاں پہ ہیں جہاں سے ان کو اپنی بھی خبر نہیں آتی یعنی ایک عرصے سے فارغ ازہوش ہو چکے ہیں - انہوں نے افسوس کا اظہار کیا تھا - فارغ کی شہرت ہندوستان میں بھی موجود تھی مجھے اس بات کی خوشی ہوئی تھی - دہلی میں جس بڑے ادیب شاعر سے ملا اس نے فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کا تذکرہ ہی چھیڑا اور فارغ بخاری کی ترقی پسندی اور جیداری کی باتیں ہوئیں -

چند ماہ قبل گرمیوں کی ایک گرم دوپہر کو میرے دروازے پر دستک ہوئی - باہر نکلا تو ایک برخوردار کاغذوں کا ایک پلندہ بمع ایک خط کے لئے کھڑا تھا - کہا فارغ بخاری کا نواسہ ہوں - خط کھولا تو فارغ کے بہادر مگر اسیر فرزند قمر عباس کی تحریر تھی - لکھا تھا فارغ صاحب کی خود نوشت کا مسودہ بھجوا رہا ہوں - اس کی نوک پلک میں نے سنوار دی ہے کچھ حصوں کو فارغ صاحب کے نوٹس کی مدد سے پورا کردیا ہے اب اس کی ترتیب و تنظیم اور چھپنے چھپانے کے لئے تیار کرنے کی ذمہ داری آپ کی ہے - یہ مسودہ پا کر ایسا لگا جیسے مجھے ایک بڑا انعام مل گیا ہو - میں فارغ کی آخری رسومات میں شرکت نہیں کرسکا تھا جس کا مجھے شدید افسوس تھا مگر فارغ صاحب کی آخری خدمت کرنے کے لئے جیل کے ایک زندانی نے میرا انتخاب کیا تھا میری آنکھیں احساس ممنونیت و عقیدت سے پرنم ہوگئیں - میں سارے کام چھوڑ کر اس مسودے کے مطالعہ میں مصروف ہوگیا - واقعی قمر عباس نے بڑی محنت کی تھی اور اصل تحریروں پر فارغ صاحب کے کاغذات اور ڈائریوں کی مدد سے ایسی نظر ثانی کی تھی کہ زندگی کی کہانی کا تسلسل بغیر جھول کے سامنے آگیا تھا - دوستوں کے اصرار پر فارغ صاحب نے خود نوشت کے کام کا آغاز کر دیا تھا - یہی یاداشتیں اور ڈائریاں قمر کے ہاتھ لگی تھیں - ایک بیٹے نے جیل میں اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنے عظیم والد کی سوانح عمری انہی کے الفاظ میں مرتب کرنے کا مشن مکمل کرلیا - میں نے

مسودے کی ترتیب کو درست کیا' ابواب سازی کی اور اس کا پرنٹ لے کر کمپیوٹر کے حوالے کردیا اس کے بعد اس کی پروف ریڈنگ کی - سینئر شاعر اور ادیب جناب خادم حسین ساجد سرحدی نے پروف ریڈنگ میں میری معاونت کی - اس کے بعد اس کا آخری ڈرافٹ قمر عباس کو جیل بھجوایا گیا - میں اِن کا ازحد مشکور ہوں اس نے ایک بار پھر اس پر نگاہ ڈالی - یوں یہ مسودہ تیار ہو کر طباعت کے مراحل سے گزرا اور اس کتاب کی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے -

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

دوست کہتے ہیں کہ 80 سال کے ہونے لگے ہو اب اپنی سوانح عمری لکھ ڈالو تا کہ تمہارے تجربات سے لوگ کچھ سیکھ سکیں گزشتہ 15 سال سے دوستوں کا یہی مطالبہ ہے آخر سوچا یہ کام بھی کر ہی ڈالوں۔

اب لکھنے بیٹھا ہوں تو کبھی قلم رک جاتا ہے کبھی کاغذ کی معصومیت آڑے آجاتی ہے۔ شروع شروع میں جی چاہا کہ ہر تجربے ہر خیال کو کاغذ پر اتار لوں مگر آہستہ آہستہ جب فنی شعور کی گرفت مضبوط ہوئی تو مہینوں کچھ نہ لکھ سکا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ قلم روکے سے نہ رکتا۔ شعور و لاشعور میں کوئی ایسی سیدھی جنگ تو نہیں ہوئی کہ صفحۂ قرطاس پہ کشتوں کے پشتے لگ جائیں۔ ہاں ایک کشمکش چلتی رہتی ہے۔ وہی ہملٹ کا تجزیاتی سوال یعنی کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں، قلم اور کاغذ کا رشتہ بہر حال ابھی قائم ہے۔

فلابیر نے موپاساں سے کہا تھا وہ سامنے پیڑ ہے۔ اس پیڑ پر کہانی لکھ ڈالو جب موپاساں کہانی لکھ کر لے گیا تو فلابیر نے کہا تم نجانے کیا لکھ کر لے آئے ہو، پھول پتیاں، پھل سبھی کچھ ہے۔ لیکن کہانی تو پیڑ پر لکھنی تھی جانے کتنی بار موپاساں نے پیڑ پر نظریں جما کر اسکے آرپار دیکھا اور پھر وہ پیڑ پر کہانی لکھ پایا۔ کیونکہ یہ بات اسکی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اصل پیڑ تو زمین کے اندر ہوتا

ہے۔ میں بھی اتنی مخلوق میں ایک اکائی ہوں اسلئے۔ . کچھ سمجھنے سے پہلے خود کو سمجھنا ضروری سمجھتا ہوں فن کسی شخص کے اندر سوتے کی طرح نہیں پھوٹتا۔ یہ نہیں کہ آپ رات کو سوئیں اور صبح فنکار بن کر جاگیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی پیدائشی طور پر فنکار ہے۔ البتہ صلاحیتیں ہوتی ہیں جن کا ہونا لازمی ہے۔ چاہے وہ جبلی ہوں یا وہبی ہوں یعنی ریاضت سے حاصل ہوئی ہوں۔ دوسرا ہر بات دوسرے سے زیادہ محسوس کرے۔ جسکے لئے ایکطرف داد و تحسین پائے دوسری طرف دکھ اٹھائے جیسے اسکے بدن سے کھال کھینچ لی گئی ہو۔ اور اسے نمک کی کان سے گزرنا پڑے۔

دوسری خصوصیت اسکے کام و دہن کی اس چرند کی طرح ہو جو منہ چلانے میں خوراک کو ریت اور مٹی سے الگ کر سکے۔ اور پھر یہ بھی نہ سوچے کہ بجلی کا خرچ وقت سے زیادہ صرف کر ڈالا۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہو کہ قدرت کے بنیادی اصول کے تحت کوئی چیز کبھی ضائع نہیں ہوتی پھر ڈھیٹ ایسا ہو کہ نقش اول پر نقش ثانی کو ہمیشہ فوقیت دے سکے۔ پھر اپنے فن سے پرے کی باتوں پر کان دھرے۔ مثلاً موسیقی میں یہ جان لے کہ استاد کیوں سر کی تلاش میں بہت دور نکل گیا۔ اور یہ بھی سمجھے کہ مصوری میں خطوط کیسے رعنائی اور توانائی سے ابھرتے ہیں۔

جب تک آدمی خطرے سے دوچار نہیں ہوتا اس میں مدافعت کی وہ قوتیں نہیں ابھرتیں جنکا اسکے اندر بڑا ذخیرہ ہے۔ نوعمری میں وہ سب باتیں میرے ساتھ ہوئیں جو بے سلامتی کا احساس دلاتی ہیں۔ پھر میں نے جی میں ٹھان لی کہ مجھے اس بے رحم اور بے تعارف دنیا میں اپنی جگہ خود بنانی ہے۔ اکثر لوگوں کو یہ حادثہ پیش آتا ہے لیکن وہ فن کے راستے سے ہو کر گزرنے کی بجائے کسی اور طرف مڑ کر اپنی منزل کھوٹی کر دیتے ہیں۔

خانہ داری اور روزگار کے مسائل ہی غم عشق سے کم نہیں ہوتے لیکن فنکار کی آزمائش ہی اسی دوراہے پر ہوتی ہے کیونکہ اسی مرحلے پر اسے فیصلہ کرنا ہوتا ہے "کہ ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر آتا ہے پروانہ" اپنے اور دوسروں کے تقاضے پورے کرنے میں یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ ایمان ہاتھ سے جاتا ہے اور نہ ہی یہ سوچیں کہ آپ امیج کے قیدی ہو کر رہ جائیں گے۔

مجھے فخر ہے کہ بہت اچھے مخلص اور پیارے دوست مجھے میسر آئے اور شاید میرا رویہ بھی ایسا ہے کہ ان " 80 " سالوں میں زیادہ دوست ہونے کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی دوست سے قطع تعلق ہو کبھی کبھی ناراضگی تک نہیں ہوئی تاہم دوستوں کی بھی کیٹیگری میں فرق تو ہوتا ہے۔

میرے دوست نہ صرف پاکستان میں خاصی تعداد میں ہیں۔ چونکہ میں زیادہ آوارہ گرد ہوں اسلئے تقریباً" نصف دنیا میں کچھ نہ کچھ ہر جگہ پر موجود ہیں۔

اسکے باوجود کسی کو شکایت کا موقع نہ دینا کوئی آسان کام نہیں آیئے یہ نسخہ بھی آپ کو بتاتا چلوں اور وہ یہ کہ کسی دوست پر کبھی بوجھ نہیں بنتا اور نہ ہی اسے خود پر بوجھ بننے دیتا ہوں۔ میری پیدائش 1917ء میں ہوئی جو انقلاب روس کا سال ہے۔ اگر وہ انقلاب نہ آتا تو شاید ہم ابھی تک انگریزوں کے غلام ہوتے انقلاب روس نے نفسیاتی طور پر صدیوں کی غلام قوتوں کو برسوں کی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکنے پر مجبور کر دیا۔ اس انقلاب نے ہندوستان جیسے غلام ملکوں کے باشندوں کے لئے آزادی کی ایک راہ کھول دی۔

میں اپنے متعلق سوچتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میرے انقلابی خیالات اور دہشت ناک سوچیں ہی مجھے اسی سال پیدائش کا باعث لگتی ہیں کچھ یہ بھی ہے اور کچھ یہ بھی کہ غاصب حکمرانوں کے دو سو سالہ غلامانہ زمانے نے ہمیں وقت

سے پہلے ہی بالغ کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ دور ہی ایسا تھا کہ شب و روز ہر بات سے انقلاب زندہ باد اور انگریز حکمران مردہ باد کے نعرے لگتے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں پیدا ہونے، پلنے اور جوان ہونے والی نئی نسل کو انقلابی سوچ تو ورثے میں ملی تھی کیونکہ پیدا ہوتے ہی انقلاب زندہ باد اور انگریز حکمران برباد کے نعرے لوزان کی طرح ہمارے کانوں میں شب و روز گونج رہے تھے۔

ظاہر ہے اس ماحول میں ہم نے ہوش سنبھالا تو ہمیں انقلابی ہی بننا تھا خصوصاً" جبکہ انقلاب ہماری گھٹی میں پڑا ہو۔

انقلاب روس نے عالمی نظام میں ایک ایسا توازن پیدا کیا جس سے دنیا میں کسی ایک طاقت کی اجارہ داری کا احتمال نہ رہا۔ اور دائیں بائیں کی طاقتوں میں سے کسی ایک کی طاقت کی برتری ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

اس انقلابی سال پیدائش کے اثرات نے میری زندگی اور کردار کو نہایت متاثر کیا چنانچہ بچپن ہی سے میرے تیور بڑے تیکھے اور عام بچوں سے خاصے مختلف تھے ویسے بھی وہ ہندوستانی سیاست کا بڑا انقلابی دور تھا۔ انگریز سامراج کی دو سو سالہ غلامی سے گلو خلاصی کی تحریک ملک میں ہمہ گیر صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ پورے برصغیر میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ملک کے ہر طبقے میں حصول آزادی کے لئے بیداری پیدا ہو گئی تھی۔ اور یوں لگتا جیسے مردوں، خواتین، جوانوں، بوڑھوں اور بچوں تک میں ملکی آزادی کے لئے ایک تڑپ اور بے چینی کی طوفانی لہر دوڑ گئی ہے۔ ہر شخص کچھ کر گزرنے کے لئے بے چین تھا۔ جسکے نتیجے میں ملک بھر میں آزادی کی تحریکیں اپنے پورے عروج پر نظر آتی تھیں۔

انگریز حکمرانوں کو بھی اسکا احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے کچھ مراعات دے کر حالات کو سازگار بنانے کے لئے اپنی سی کوشش کی لیکن انگریز سامراج کے

خلاف نفرت کی خلیج روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی۔ شاید اسی جذبے کے تحت ترکی کی تحریک خلافت میں اور انقلاب افغانستان میں بھی ہندوستان کے مسلمان سر دھڑ کی بازی لگا کر کود پڑے خلافت کمیٹی کی ہجرت کی تحریک میں مسلمان دیوانوں کی طرح اپنی جائیدادیں اور مال و املاک کوڑیوں کے مول بیچ کر جہاد کے لئے افغانستان چل پڑے۔

چنانچہ اس دور کے والی افغانستان کے لئے انہیں سنبھالنا ایک مسئلہ بن گیا اور یہ مہینوں کھلے میدانوں میں بھوکے پیاسے پڑے رہے۔ اکثر بیمار ہوئے اور بیشتر مر گئے اور افسوس تو یہ ہے کہ ان سینکڑوں شہیدوں کے نام تک کوئی نہیں جانتا۔

افغانستان میں اتنی جگہ کہاں تھی وہ تو چھوٹا سا ملک ہے۔ آخر انہیں بعد از خرابی بسیار اپنے وطن کو لوٹنا پڑا۔ ان میں سے کچھ راستے ہی میں مر کھپ گئے جو یہاں واپس پہنچے ان کے لئے زندگی گزارنا ایک مسئلہ بن گیا۔

پھر ملک میں نوجوان بھارت سبھا آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی۔ ینگ پیپلز فیڈریشن بھی سرگرم کار تھے۔ جو انتہا پسند جماعتیں تھیں۔ اور پرامن تحریک چلانے کی بجائے حصول آزادی کے لئے انگریز حکمرانوں سے براہ راست جنگ کرنے کی حامی خاص تھیں جبکہ مسلم لیگ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور ہندو سبھا عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے۔ تاہم ان تمام مذہبی اور قومی جماعتوں کا مقصد ایک ہی تھا۔ اور وہ تھا ہندوستان کی مکمل آزادی جس کے لئے وہ سالہا سال تک جانی و مالی ہر قسم کی قربانیاں دیتے رہے۔ بہر حال یہ تھا وہ بیک گراؤنڈ جس میں میں نے آنکھ کھولی۔

بچپن

میری زندگی کا کاروان 80 سال سے رواں ہے۔ اس طویل عمر میں کوئی ایسا درخشاں باب نہیں جو پڑھنے والوں کو چونکا سکے یا ان کے لئے حکایت لذیذ ثابت ہو سکے کوئی ایسا کارنامہ ہی نہیں جسے فخر سے پیش کر سکوں یہ نہ تو کسی جاگیردار کی مہم جوئی کا افسانہ ہے نہ ہی کسی صنعتکار کی ہنرمندی کی کہانی ہے اور نہ ہی کسی وزیر سفیر کی ششدر کر دینے والی سٹوری۔ یہ تحریر ایک غریب قلمکار کی سادہ اور بے رنگ جدوجہد کی ایک عمومی سی داستان ہے۔

میں نے ایک نہایت مفلوک الحال گھرانے میں آنکھ کھولی بچپن ہی میں والد داغ مفارقت دے گئے مجھ سے بڑے دو بھائی محنت مزدوری کر کے گھر کی گاڑی چلا رہے تھے۔ طبعی خودداری نے بھائیوں کا دست نگر ہونا گوارا نہ کیا اور گھر سے بھاگ کر سارے ہندوستان کی خاک چھانتا رہا بلکہ برما کی آخری سرحد تک پہنچا۔ اس دوران کئی کام کئے کبھی منشی کا کام، کبھی پریس کی ملازمت، کبھی کار نیوال کی نوکری، کبھی فروٹ کا کاروبار اور کبھی صحافت۔

طالبعلم کے طور پر میں نہایت شریر لڑکا تھا۔ اساتذہ مجھ سے کبھی مطمئن نہ ہو سکے۔ نت نئی شرارتوں سے ان کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اسی بناء پر کئی سکولوں سے نکالے جانے کا شرف حاصل ہوا۔ زیادہ شرارتیں وہی بچے کرتے ہیں جو پڑھنا نہیں چاہتے، میرا معاملہ بھی ایسا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ کھیل کود کے دن ہیں انہیں فضول کاموں میں کیوں ضائع کیا جائے۔

پھر جوانی بھی اسی لاابالی پن میں گزری۔ کچھ حالات کی ستم ظریفی اور کچھ طبعی آوارگی نے کہیں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ اگرچہ اس کاروبار میں گھاٹا

ہی گھاٹا تھا لیکن دیوانگی کے عالم میں ان باتوں کو کون سوچتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دل زدگی میں بہت کچھ کھویا تاہم کچھ نہ کچھ پایا بھی۔ شخصیت کی تعمیر میں ہر عمل ایک اینٹ کا کام دیتا ہے۔ زندگی کے تجربات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ کتابی علم بڑی چیز سہی لیکن وہی سب کچھ نہیں جب تک اس میں عملی زندگی کی روح نہ پھونکی جائے۔ یہ جسم ایک بے جان لاش سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تجربات انسان کو بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ ان سے وہ علم حاصل ہوتا ہے جو بھاری بھرکم کتب سے میسر نہیں آ سکتا۔ بڑھاپا ایسی چیز ہے جس سے خسارے کے سوا کوئی سودا نہیں کیا جا سکتا لیکن جو لوگ باقی عمر میں بہت کچھ کھو چکے ہوں ہر حرف انہی کے لئے سود مند ہوتا ہے کہ ان کے پاس اور کچھ ہو نہ ہو تجربات و مشاہدات کی وہ دولت ہوتی ہے جسے وہ بہت کچھ کھو کر حاصل کرتے ہیں اور یہ ایسی دولت ہے جسکے ضائع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

میں زیادہ نیک نام آدمی نہیں ہوں نمائشی نیکی سے مجھے ہمیشہ چڑ رہی ہے دوسرے لوگوں کی طرح مجھ میں بھی بڑی کمزوریاں ہیں لیکن میں نے انہیں کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی نہ ہی ان پر فخر کیا ہے۔ ان سے سمجھوتہ بھی نہیں کیا ہار بھی نہیں مانی۔ میرے اندر ان کے خلاف ہمیشہ جنگ جاری رہی ہے۔ صرف میرے اندر ہی نہیں ہر شخص کے اندر یہ پیکار جاری رہتی ہے۔ اور بھی کئی جنگیں ہمارے اندر لڑی جا رہی ہیں۔ جھوٹی انا کے خلاف' جھوٹی وضع داری کے خلاف' بے جا خواہشات کے خلاف' بے یقینی کے خلاف' بزدلی کے خلاف' نفرت کے خلاف اور عصبیت کے خلاف۔ کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں۔ اور ہمیں علم ہی نہیں ہوتا ہر شخص کے اندر ایک باغی انسان بغاوت کا پرچم لئے' انحراف کی تلوار سونتے اندھے عقیدوں' توہمات اور جہالت سے بر سر پیکار ہے۔

ہماری شخصیت کے کئی رنگ ہیں اور کئی چہرے ہیں۔ جنہیں ہم خود بھی

نہیں پہچانتے جب کبھی اچانک ان میں سے کوئی چہرہ سامنے آتا ہے۔ تو ہم ڈر جاتے ہیں۔ اور حیران ہو کر خود سے پوچھتے ہیں۔ کہ کیا یہ ہم ہیں؟

نہیں یہ نہیں ہو سکتا ہم اسے پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن ظاہری انکار سے کیا ہوتا ہے؟ ہم مہربان بن کر دوسروں کے لئے جان نثار کرتے ہیں، قاتل بن کر دوسروں کی جان کے بیری بنتے ہیں، رحم دل بن کر دوسروں کی خطائیں بخشتے ہیں۔ غاصب بن کر دوسروں کا استحصال کرتے ہیں۔ ہم کیا ہیں ہم کیا نہیں ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے۔ ہم بھیڑیئے بھی ہیں ناگ بھی ہیں۔ فرشتے بھی ہیں۔ شیطان بھی ہیں۔ لیکن ہمارا سب سے اچھا روپ ایک ہی ہے اور وہ انسان کا روپ ہے۔ جو ہمارا اصلی خلقی روپ ہے۔ جس کسی نے اس روپ کو اپنایا وہ اور کسی کے سامنے ہو نہ ہو۔ اپنے ضمیر کے آگے ضرور سرخرو ہوتا ہے۔

میں نے اپنی شخصیت کے سارے رخ دیکھے ہیں اور سوائے انسان کے کوئی دوسرا رخ مجھے پسند نہیں آیا۔ انسان، جس میں نیکی بھی ہو برائی بھی ہو۔ گناہ بھی ہو اچھائی بھی ہو۔ کمزوری بھی ہو بڑائی بھی ہو۔ میرے نزدیک انسانی زندگی میں گناہ کی بڑی اہمیت بڑی عظمت ہے۔ گناہ آدم اول کا وہ معجزہ ہے جس سے یہ جہان رنگ و بو وجود میں آیا جو اسے مصنوعی جنت سے نکال کر دنیا کی حقیقی جنت میں لایا۔ گناہ جس نے انسان کو فرشتے سے انسان بنایا۔ جس نے اس دہرناپائیدار کو رنگوں اور خوشبوؤں سے سجایا۔ میں گناہ کے اعجاز کا بہت مداح ہوں اور اپنی شاعری میں اس پر میں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ بلکہ میرے فن کا یہ ایک نہایت اہم موضوع ہے میں انسان کو اسکے بغیر مکمل نہیں سمجھتا۔ اس انسانی پیکر کو اپنانے کے لئے میں نے ساری عمر بڑے جتن کئے ہیں لیکن آج بھی یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس میں کہاں تک کامیابی

ہوئی تاہم اتنا جانتا ہوں کہ اسکے علاوہ اپنا کوئی بھی دوسرا رخ جب میرے سامنے آئے میں اسے فوراً پہچان کر اسکے جھانسے میں آنے سے انکار کر دیتا ہوں۔

میری پیدائش والدہ مرحومہ کے مطابق ایک طوفانی رات میں ہوئی شام ہی سے شدید آندھی چل رہی تھی پھر بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک گھنٹوں دلوں کو دہلاتی رہی اور آخر میں بادو باران نے وہ قیامت برپا کر دی کہ شہر کے کئی مکان گر گئے سینکڑوں درخت جڑوں سے اکھڑ گئے ہمارے گھر کے پردے بھی اس دھماکے سے گرے تویوں لگا جیسے اوپر والی چھت آپڑی ہو۔ پھر جب حسب معمول گلی کی نالی بند ہو گئی تو اس مختصر کوچے کے سارے مکانوں (جنکی تعداد دس تھی) کی نچلی چھتیں جل تھل ہو گئیں۔ ہماری چھت بھی جگہ جگہ سے ٹپکنے لگی اور کہیں سر چھپانے کا ٹھکانہ نہ رہا۔

ماں کو تکلیف تھی۔ گھر میں ابا کے سوا دائی بلانے کو اور کوئی مرد نہ تھا۔ دونوں بڑے بھائی کہیں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ مجھ سے بڑا بھائی ابھی بچہ تھا۔ اسے اس ہولناک رات میں باہر بھیجا نہیں جا سکتا تھا۔ والد بیمار تھے ان کا بھی ایسے حالات میں گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ جب تکلیف بڑھنے لگی تو پڑوسن کو امی نے خود ہی کھڑکی پر دستک دے کر بلایا اس بیچاری کا گھر ہم سے زیادہ خستہ حالت میں تھا وہ پانی کی زد سے بچے کچے سامان کو سنبھالنے میں بری طرح بھیگ چکی تھی۔ لیکن بی بی جی (ہمارے سید گھرانے کا سب احترام کرتے تھے اور میری والدہ کو بی بی جی اور ابا کو آغا جی کہتے تھے) کا بلاوہ سنتے ہی وہ سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی، سب کام چھوڑ چھاڑ کر ادھر لپکی اسے حالات کا علم تھا بلکہ جیسے دستک کے انتظار میں تھی اب جو دیکھا تو عجیب سا منظر نظر آیا سارے گھر میں اتنی پناہ گاہ نہ تھی جہاں ایک چارپائی ڈال کر ہماری تشریف آوری کا اہتمام کیا جاتا۔

پھر اچانک ایسا معجزہ ہوا کہ موسلا دھار بارش تھم گئی۔ بادل چھٹ گئے آسمان چمکتے ہوئے ستاروں سے جگمگانے لگا۔ درودیوار چاند کی دودھیا چاندنی میں نہا گئے۔ اور ملیدولت بغیر کسی تکلف کے بڑے آرام سے اس جہان رنگ و بو میں آوارد ہوئے۔ پڑوسن حیران تھی کہ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے کیسے ہو گیا اور ماں کو تو جیسے اس حسن اتفاق پر سکتہ سا ہو گیا۔ وہ ہاتھ پھیلا کر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہتی تھی لیکن صرف لب ہل رہے تھے۔ الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ابو جائے نماز بچھا کر کلام پاک کی تلاوت میں مصروف تھے میرے رونے کی آواز سن کر شکرانے کا سجدہ ادا کرنے لگے۔

والدین جو بچے کے رونے کی آواز پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ ایسے موقع پر یہی رونے کی صدا ان کے لئے مژدہ جانفزا بن جاتی ہے ان کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ چہرے پہ مسکراہٹ کھل جاتی ہے اور دلوں میں غنچے چٹکتے محسوس ہوتے ہیں۔ حالات و واقعات زندگی کی بنیادوں پر اسطرح بھی اثر انداز ہوتے ہیں کہ عام طور پر اسکا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک میری آمد کا تعلق ہے۔ والدین کے لئے یہ کوئی خوشی کا سندیسہ نہیں تھا۔ یہ خوشی تو ایسے تشویشناک حالات میں غیر متوقع طور پر بغیر تکلیف کے مشکل آسان ہونے اور نحیف و نزار ماں کا اس کڑی آزمائش میں صحت و سلامتی سے فراغت پانے کے باعث تھی۔ دراصل میں تو بن بلائے آن ٹپکا تھا۔ مجھ سے پہلے تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ بہن شادی کے بعد ایک بچی کو جنم دے کر اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ بھائیوں میں کوئی بھی کماؤ نہ تھا۔ والد کی آمدنی اتنی قلیل تھی کہ گھر میں عموماً" فقروفاقہ کا سماں نظر آتا۔

تیسرے بھائی کی پیدائش کے بعد ماں نے مزید اولاد نہ ہونے کے لئے بڑی دعائیں کیں۔ زیارتوں پہ جا کے منتیں مانگیں' نذر نذرانے دیئے اسوقت

برتھ کنٹرول کا شعور نہ تھا اور شاید ایسی ادویات بھی دریافت نہیں ہوئی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ اس سے بچنے کے لئے سادہ دل لوگ دعاؤں' زیارتوں اور پیروں فقیروں پر ہی آس لگائے رہتے یا پھر ٹونا تعویز سے اسکا مداوا کرنا چاہتے گڑگڑا کر خدا سے رجوع کرتے کہ وہی کوئی بند باندھ دے اور آنے والی روح کو کسی اور مستحق کی جھولی میں ڈال دے۔ لیکن وہ بچارے اتنے نہیں جانتے تھے۔ کہ جو بویا وہ تو کاٹنا ہی پڑے گا۔ بھلا اسے کون روک سکتا ہے۔

ادھر ہمیں بھی غالباً" اس دھرتی پر فاقہ کشی کے لئے اور بیکار و نادار' مجہول و نالائق لوگوں کی تعداد میں ایک فرد کا اضافہ کرنے کے لئے آنے پر اصرار تھا۔ اور کچھ ایسا اضطراب تھا کہ ایسی جان لیوا رات میں اور ایسے افلاس زدہ ماحول میں چپکے سے بن بلائے مہمان کی طرح آن ٹپکے ہر چند کہ ہم پسندیدہ مہمان نہیں تھے لیکن جب بدوبدی آہی گئے تو بادل ناخواستہ ماں کو بھی سینے سے لگانا پڑا اور باپ کو بھی گوارہ کرنا پڑا کہ اسکے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کیونکہ میرا گلا گھونٹنے کی ان میں جرات نہیں تھی۔ یہ مجبوریاں بھی انسان سے کیا کچھ نہیں کراتیں۔ پہلے شوق جسم و جاں کی مجبوریاں پھر ممتا کی مجبوریاں۔ پیٹ کی بھوک بڑی سفاک مجبوری ہے لیکن جنسی بھوک کے آگے وہ بھی ہار مان جاتی ہے۔ دوسرے لوگ ان مجبوریوں کو کہاں دیکھتے ہیں۔ سارا خاندان میری پیدائش پر برہم تھا آپس میں تو سبھی لعن طعن کرتے کچھ منہ پھٹ کھلے بندوں بھی کہنے سے نہ ٹلتے "گھر میں نہیں کھانے کو اور بانو چلی لٹانے کو" پہلے ہی بھوکوں مر رہے ہیں۔ لیکن بچہ کشی کا شوق ہے۔ کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ کوئی کہتا "کونسی جاگیر تھی ایسی شاہ صاحب کی جو وارثوں کی لائن لگا رہے ہیں" پہلے بچوں کا دانہ پانی چلے تو غنیمت ہے مفت میں ایک نیا بکھیڑا گلے ڈال لیا۔ کوئی منہ پھاڑ کر فقرہ کستی " ہائے بی بی جی اب آپ اس بڑھاپے میں بچے پالیں گی" غرض جتنے

منہ اتنی باتیں۔
جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد کی ابریشم کی دکان تھی میں اکثر سوچتا ہوں کہ والد کی طبیعت میں جو نرمی لور گداز تھا وہ اسی پیشے کی وجہ سے تھا۔ بعد میں یہ دکان ساتھ کے بڑے دکاندار نے (جو لن کا رشتہ دار بھی تھا) چالاکی سے ہتھیا لی لور وہ صبر و شکر کر کے گھر آبیٹھے۔ بس یہیں سے ہمارے برے دنوں کا آغاز ہوا۔ ہم ایک بہن لور چار بھائی تھے۔ لور ان میں سے میں سب سے چھوٹا اور آخری بیٹا تھا۔ مجھ سے بڑے تین بھائی لور ایک بہن بھی اسوقت خوردسال تھے یعنی گھر میں والد کے سوا کوئی کمانے والا نہ تھا۔ والد بڑھاپے لور کمزوری کے باوجود سارا دن محنت مزدوری کرنے پر مجبور تھے۔ میں چونکہ سب سے چھوٹا تھا اس لئے اکثر دکان پر مجھے ساتھ لے جاتے مجھے ریشم کی چمک اور رنگ بہت اچھے لگتے تھے یہ رنگ لور گداز کچھ اسطرح میرے اندر حلول کر گئے کہ میری شاعری لور فن کا مستقل حصہ بن گئے۔

پھر اچانک ایکدن وہ شریف النفس آغہ جی وفات پا گئے اب گھر میں فقروفاقہ نے لودھم مچا دیا۔ بھائیوں میں کوئی بھی کمانے والا نہ تھا۔ دو درزی کا کام سیکھ رہے تھے۔ جبکہ دو بہت ہی چھوٹے تھے۔ گھر کے حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ ہفتوں چولہا نہیں جلتا تھا۔ ماں دیگچی میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھ دیتی اور ہمیں کہتی بس ہانڈی پک رہی ہے اسی طرح بہلا پھسلا کر بھوکا سلا دیتی۔ ہمارے گھر کی نچلی منزل کی ڈیوڑھی کی دیوار کے ساتھ ایک زیارت تھی جہاں لوگ شمع لور پھول جلایا کرتے تھے۔ شہر کے اکثر گھروں کے ساتھ ایسی زیارتوں کا ان دنوں بہت رواج تھا۔ ایک دفعہ جمعرات کے دن جبکہ گھر میں ہم سب دو روٹیوں کے چھ حصے کر کے کھا رہے تھے۔ ماں نے مجھے 4 آنے دیئے کہ جا کر پھول اور موم بتیاں لاؤں تا کہ زیارت پر چڑھاوا دیا جائے۔ مجھے بڑی

حیرت ہوئی کہ ہم فاقے سے مر رہے ہیں اور ماں چڑھاوے چڑھا رہی ہے۔ میں نے پیسے لئے اور جاکر ان سے کباب اور روٹیاں لے آیا۔ اس پر ماں سے سخت مار پڑی لیکن میں نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم بھوک سے مر رہے ہیں روٹی ہمارے لئے زیادہ ضروری ہے۔ زیارت کا کیا ہے۔ دو روز بعد کہیں سے فالتو پیسے آگئے تو اس پر پھول چڑھانے کا شوق بھی پورا کر لیجئے گا۔ اتنے سے بچے کی یہ ہمت ماں نے تاڑ تاڑ مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ اب اس صورتحال میں ہماری نانی اماں نے کپڑے سینے شروع کر دیئے۔ اس وقت تک مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ ہوتی بھی تو اتنے پیسے کس کے پاس تھے۔ وہ ہاتھ سے سلائی کرتی تھیں۔ سلائی خاصی مشکل تھی۔ سیٹھیوں کا بہت بڑا کنبہ تھا وہ سارے اسوقت کھاتے پیتے لوگ تھے۔ پیری مریدی تو ہمارے خاندان میں کبھی نہیں رہی البتہ سیٹھیوں کو ہمارے گھرانے سے بڑی عقیدت تھی۔ ہمارے رشتے کی نانی یعنی ماں کی خالہ جسے ہم بی جی کہتے تھے اور حقیقی نانی سمجھتے تھے وہ سیٹھیوں کے کپڑوں کی سلائی کرتی تھی۔ اور ان کی خواتین کو بی جی سے بڑی گہری عقیدت بھی تھی ماں نے بھی بی جی سے سلائی کا کام سیکھا اور دم درود کا " ہدا " بھی حاصل کیا۔ نانی کی زندگی ہی میں ماں نے بھی سلائی کا کام شروع کر دیا اور نانی کے انتقال کے بعد تو یہ دونوں کام مکمل طور پر ماں کو منتقل ہو گئے۔ کپڑوں کی سلائی کی اجرت اچھی خاصی تھی یعنی 70 سال پہلے دو روپے جوڑا ملتا تھا۔ نانی سلائی میں بڑی تیز تھیں دو جوڑے دن میں نکال دیتیں اور کام بھی ایسا ستھرا کہ شہر بھر میں اور کوئی یہ صفائی نہ لا سکتا۔ ماں کے ہاتھ میں بھی ویسی ہی صفائی تھی لیکن ان میں وہ پھرتی نہیں تھی ایک جوڑا دو دن تین دن میں جا کر مکمل ہوتا اور یہ بھی تھا کہ انہیں گھر کا کام بھی نمٹانا پڑتا اور بچوں کو بھی پڑھانا ہوتا جنکی تعداد دس سے پندرہ ہوتی پھر بھی اچھی خاصی آمدنی

کا ذریعہ بن گیا تھا۔ لیکن ماں بڑی شاہ خرچ تھیں خصوصاً مہمان نوازی میں تو پوری حاتم تھیں۔ کپڑے سلانے یا دم درود کے لئے جو سیٹھی گھرانے کی خواتین آتیں ان کی خاطر مدارات میں یہ سلائی کی مزدوری نصف سے زیادہ خرچ کر دیتیں اور پھر گھر میں وہی فقر و فاقہ کا عالم رہتا۔

نانی کے گھر بچہ نہ تھا۔ شاہ خرچ دراصل وہی تھیں ماں ہر کام میں انہیں کے نقش قدم پر چل رہی تھیں۔ لیکن نانی کی بات کچھ اور تھی اسکی صرف سلائی کی آمدنی تین روپے روزانہ سے کم نہ تھی یہ اسوقت بہت بڑی رقم تھی جبکہ دس روپے میں گھر کے مہینے بھر کا خرچ آتا تھا۔ دو روپے میں آتا۔ تین روپے کا اصلی گھی کا بڑا ٹین۔ دو آنے سیر دودھ۔ آٹھ آنے ماہانہ بہشتی لیتا تھا؟ تین چار مشکیں پانی کی روزانہ ڈالا کرتا تھا۔ کیا بتاؤں ارزانی ہی ارزانی تھی۔ سونے کا بھاؤ پندرہ روپے تولہ تو ہمیں یاد ہے۔ اس سے پہلے ماں بتاتی کہ 10 روپے تولہ بھی رہا ہے۔ لیکن پیسہ کہاں تھا۔ جتنی گرانی بڑھ گئی۔ آمدنی بھی زیادہ ہوتی گئی۔

بی جی کی شادی ہمارے چچا سے ہوئی۔ بی جی ہماری ماں کی خالہ تھیں لیکن ان کی کبھی نبھی نہیں۔ چار دن بھی گزارا نہیں ہوا۔ اور انہوں نے شوہر کے جیتے جی ساری زندگی رنڈاپے میں کاٹ دی۔ بڑی حسین و جمیل خاتون تھیں۔ بڑھاپے میں بھی سرخی سفیدی چہرے پر ٹھاٹھیں مارتی نظر آتی۔ آخر وقت تک سارے خاندان کی کفیل بنی رہیں۔ ہمارے ماموں اور ان کے بیوی بچے نانی کے مکان کی اوپر والی منزل میں رہتے تھے ان کی ہانڈی روٹی بھی یہی کرتیں اپنا کھانا پکانے کے لئے عموماً دو تین عقیدت مند عورتیں خدمت کے لئے ہر وقت موجود رہتیں۔ ہماری ہمشیرہ مرحومہ حضرت جان کی یتیم لیسر اکلوتی بیٹی بہرہ ور جان (جو حسن و جمال میں بے مثال تھی) کو بی جی نے اپنی بیٹی بنا لیا

اور اسے پال پوس کر جوان کیا اور پھر بڑی دھوم دھام سے اسکی شادی کی ہماری والدہ کی بھی وقتاً" فوقتاً" مدد کرتی رہتی تھیں۔

ہماری نانی بی جی کی وفات تقریباً" سو سال کی عمر میں ہوئی لیکن پورے خاندان کے لئے یہ ایک ناقابل تلافی المیہ تھا اسلئے کہ وہ سارے کنبے کی کفیل تھیں - اپنی حقیقی نانی کی وفات مجھے تو کیا میرے بڑے بھائیوں کو بھی یاد نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کی دائمی جدائی کا بھی کسی کو اتنا دکھ نہ ہوا ہو گا جتنا اس رشتہ کی نانی کا صدمہ ہوا۔ دراصل رشتے ناطوں کی بنیاد یہی ذاتی مفاد اور اغراض سے وابستہ ہوتی ہے۔ بچے ماں باپ' بیوی' اولاد' بھائی' بہنیں' سب اپنے بندھنوں میں بندھے ہوتے ہیں۔ کسی قریبی رشتے سے بھی جب انسانی توقعات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی جاذبیت نہیں رہتی۔ والد کی وفات پر مجھے سب سے زیادہ دکھ اسلئے ہوا کہ چھوٹا ہونے کے ناطے ان کو مجھ سے بڑا لگاؤ تھا وہ مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے۔ ماں پر چونکہ تمام عذاب اکٹھے آن پڑے تھے اسلئے ان کی توجہ مجھ پر وہ نہیں رہی جو باپ نے دی تھی۔ ان پر گھر کے کام کاج کے علاوہ گھر کا خرچ چلانے کے لئے محنت مزدوری کا بوجھ بھی آن پڑا تھا۔ جس سے ان کا مزاج چڑچڑا ہو گیا تھا۔ یہ محرومی میرے بچپن کا دوسرا المیہ بن گئی - جس سے میرا بچپن بہت بری طرح متاثر ہوا۔ گھر میں ابا کے آخری ایام میں معذوری کی وجہ سے میں ان کی توجہ کا واحد مرکز بن کر رہ گیا تھا۔ شاید اسی لئے میں ان کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر رویا۔

چونکہ میں بے حد شرارتی تھا اسلئے بڑے بھائیوں نے تربیت کے خیال سے مجھ پر خاصی سختی رکھی جس سے میرے اندر ہی اندر ایک سرکشی جنم لیتی رہی۔ ماں بڑی متقی اور پرہیزگار خاتون تھی۔ نماز' روزہ' تلاوت' اسکی گھٹی میں پڑے تھے۔ میں اسکی مجبوری سمجھتا تھا۔ اسکے دکھوں کا مجھے شدید احساس تھا۔

اسلئے اسکے لئے میں کڑھتا رہتا۔ لیکن دوسرے بچوں کی طرح میری خواہش تھی کہ وہ مجھے گود میں لے کر پیار کرتی رہے چومتی رہے۔ گلے سے لگائے رکھے، دعائیں دے۔ گھر میں ایک فرد کی طرح میری اہمیت ہو لیکن وہاں کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں تھی۔ خصوصاً" جب اپنے رشتہ داروں کے بچوں کو دیکھتا کہ ان کے والدین، بھائی، بہنیں انہیں کتنا پیار دیتے ہیں۔ انکے لئے پہننے کو عمدہ کپڑے دیکھتا۔ انکے پاس کھیلنے کو اچھے کھلونے دیکھتا انکی جیب میں پیسے ہیں تو شدید احساس کمتری سے میرے اندر جیسے نفرت اور غم و غصے کا لاوہ کھولنے لگتا۔ میں اس ماحول میں اپنے آپ کو بالکل اجنبی محسوس کرتا۔ اور یہی جی چاہتا کہ یہاں سے بھاگ کر کہیں دور بہت دور چلا جاؤں۔ جہاں مارپیٹ نہ ہو بددعائیں اور پھٹکار نہ ہو۔

میں چھوٹی عمر ہی سے بڑا حساس تھا۔ میرا مزاج پیدائشی طور پر ہر اعتبار سے اپنے خاندان سے بالکل مختلف تھا۔ گالی گلوچ تو ہمارے ہاں بالکل نہیں تھی لیکن بددعاؤں سے مجھے بڑی چڑ تھی۔ مارپیٹ کو میں اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ کہ اسکا عادی ہو گیا تھا۔ لیکن اپنی سبکی اپنی توہین میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ ہمارا گھرانہ بحیثیت مجموعی ایک کلچرڈ گھرانہ تھا۔ ہماری فیملی میں گالی گلوچ تو کبھی نہیں تھی۔ البتہ بچوں کو مارپیٹ کا بری طرح ہدف بنایا جاتا۔

آبائی گھر اور محلّہ

پشاور میں ہمارا آبائی مکان گور گٹھڑی کی تاریخی عمارت سے اترائی پر
تھا۔ گور گٹھڑی کی عمارت جو کم و بیش تین جریب پر واقع ہے۔
یہ عمارت مُغلیہ عہد کے ابتدائی دور میں ایک مُغل شہزادی، جہاں بیگم نے تعمیر
کروائی تھی۔ کیونکہ دہلی سے کابل تک کے سفر میں موسم کی تبدیلی کے پیش نظر پشاور کا
پڑاو بڑا اہم ہوتا تھا۔ خواص کیلئے تو سرکاری مہمان خانے وغیرہ موجود تھے مگر عوام اور
خاص طور پر تاجروں کو بڑی دِقت پیش آتی تھی۔ اس وسیع و عریض عمارت میں مسافر
اپنے تجارتی سامان سمیت بے خوف ہو کر رہتے اور کابل تک کے سفر کی تیاری بھی کرتے۔
یہ عمارت اس حوالے سے ایک منڈی کی صورت بھی اختیار کر چکی تھی۔ لہٰذا ایک ہندو
پنڈت گورکھ ناتھ نے آکر اس عمارت کے کونے میں ڈیرا جمایا اور مذہبی پرچار کے علاوہ
حکمت کی دکان بھی بنا لی۔ ہندکو زبان میں دکان کو "ہٹی" کہتے ہیں لہٰذا اس عمارت یعنی
سرائے، جہاں بیگم میں گورکھ ناتھ کی ہٹی بھی بن گئی لوگ مختصراً اسے "گورکھ ہٹی" کہنے
لگے۔ یہی نام بگڑتے بگڑتے گورکھ ہٹی سے گورکھ ہٹری اور پھر گور کٹھڑی" بن گیا۔

اسکے مغربی
گوشے میں مہاتما بدھ کے پیروؤں کی عبادت گاہ کے باعث سالہا سال سے بیرونی
سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ جسکے صدر دروازے پر تعمیر شدہ کمروں
میں تحصیل دار اور اسکے عملے کا دفتر ہے۔ اسی رعایت سے اب وہ تحصیل کے
نام سے مشہور ہے۔ اسکی پچھلی طرف پولیس کا تھانہ اور حوالات کے سیل اور
دوسری طرف فائر بریگیڈ کی مشینیں اور عملہ رہتا ہے۔ تحصیلدار کے دفتر سے
تھوڑا آگے ایک بہت پرانا مندر ہے۔ جسکے متعلق مشہور ہے۔ کہ یہ ہندوؤں کا
استھان تھا جسکے نیچے تہہ خانے میں ایک دروازہ اس لمبی سرنگ کی طرف کھلتا

ہے۔ جسکے متعلق روایت ہے کہ وہ شہر سے تین میل دور گورکھ ڈبی میں جا نکلتی ہے۔ جو ہندوؤں کا ایک اور متبرک۔ تاریخی مقام ہے۔ گورکھ ڈبی میں ایک بہت بڑا تالاب بھی ہے۔ جسے شہر کے لوگ "نی دا ہسہ" کہتے ہیں "گرمیوں میں اس تالاب میں نہاتے ہیں۔ اس سرنگ میں بعض بزرگوں کے کہنے کے مطابق بدھوں سادھوؤں کی عبادت کے لئے استھان بنے ہوئے ہیں۔ جہاں وہ برسوں چلہ کشی کرتے رہے ہیں اسکے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ ایک دفعہ چند غیر ملکی سیاح اس پراسرار سرنگ کا بھید پانے کے لئے اس میں رینگ کر داخل ہوئے کیونکہ اس کا دھانہ بہت تنگ تھا۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ آگے جاکر یہ سرنگ قد آدم تک کشادہ ہو جاتی ہے اور وہاں کچھ ایسی کیمیائی شمعیں جل رہی ہیں جو صدیوں سے روشن ہیں اور ابد تک روشن رہیں گی۔ لیکن اندر داخل ہونے کے بعد وہ کبھی نہ لوٹ سکے۔

اس مندر کے دروازے سے ہٹ کر ایک گیٹ سے دوسرے گیٹ تک بیچوں بیچ جانے والی سڑک کے کنارے ایک پختہ تالاب ہے۔ جہاں پولیس کا عملہ کپڑے دھوتا اور غسل کرتا ہے۔ یہ تالاب جو خاصا بڑا اور تقریباً" 8 فٹ گہرا ہے آس پاس کے علاقوں کے بچوں کی محبوب سیرگاہ بنی ہوئی ہے۔ جہاں گرمیوں میں بچے جاکر نہاتے ہیں اور خوب ہنگامہ برپا کرتے ہیں۔ اپنے بچپن میں ان بچوں کا سرغنہ میں ہوا کرتا تھا۔ گور گٹھڑی کے چاروں کونوں پر چار برج ہیں باہر چاروں طرف میدان ہیں۔ جو ہمارے کھیل کود کا مرکز تھا۔ عصر کے وقت اس علاقے کے سارے بچے وہاں جمع ہو جاتے اور رات گئے تک کبڈی' توپ ڈنڈا' گلی ڈنڈا' شاں شاں کے ٹب کتڑبے اور دوسرے کئی کھیل کھیلے جاتے۔ گرمیوں میں پتنگ بازی کا بازار گرم رہتا۔

مہاتما بدھ نے اپنی تعلیمات کی اشاعت کے لئے برصغیر میں چار بڑے مرکز بنائے تھے۔ جن میں سے ایک بڑا مرکز پشاور میں تھا۔ پشاور شہر میں گنج

دروازے کے باہر قبرستان کے پاس اس عہد کی یادگار "شاہ جی کی ڈھیریاں" ہیں دوسری جنگ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے آثار قدیمہ کے محکمے نے کھدائی کی تو وہاں سے ایک بہت بڑا لکڑی کا صندوق برآمد ہوا جسکا تالہ توڑا گیا تو اس میں سے ایک صندوق نکلا پھر اسکے اندر سے دوسرا نکلا اس طرح دسویں صندوق سے ایک چھوٹی سی صندوقچی برآمد ہوئی۔ جسے کھولا گیا تو اس میں ایک سونے کی ڈبیا میں سے مہاتما بدھ کے جسم کی راکھ برآمد ہوئی۔ جسے حکومت نے برما کے بودھوں کے بڑے پگوڈا (عبادت گاہ) کے حوالے کر دیا۔ صوبہ سرحد سے ٹیکسلا تک کا علاقہ بدھ مذہب کی اشاعت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ پشاور کے ایک قریبی گاؤں چمکنی کے پاس ایک بدھ یونیورسٹی بھی تھی۔ جس میں دور دور سے طلبہ حصول تعلیم کے لئے آتے تھے اس یونیورسٹی کے سکول اس سارے خطے میں پھیلے ہوئے تھے۔ جنکے آثار صوابی اور ٹیکسلا میں اب بھی موجود ہیں۔ ٹیکسلا کے عجائب گھر میں بھی مہاتما بدھ کے بیش بہا نوادرات محفوظ ہیں۔

گورگٹھڑی کے قریب رہنے سے شہر بھر میں کہیں بھی آگ لگتی ہمیں سب سے پہلے پتہ چل جاتا۔ نہ صرف یہ بلکہ آگ بجھنے کی اطلاع بھی گھر بیٹھے مل جاتی کیونکہ فائر بریگیڈ کی بھاری بھرکم مشینیں جب تحصیل سے نکل کر سو میل کی رفتار سے ساعت پاش الارم دیتی ہوئیں روانہ ہوتیں تو آس پاس کے ہر گھر میں زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوتے اس سے سب کو علم ہو جاتا کہ شہر میں کہیں آگ بھڑک اٹھی ہے اسی طرح اسکی واپسی پر بھی آگ پر قابو پانے کی خوشخبری مل جاتی۔

گورگٹھڑی ہندومت کا ایک متبرک مقام تھا۔ شہر بھر کی ہندو عورتیں اور لڑکیاں پو پھٹتے ہی پیتل کی تھال میں پھول سجائے موم بتی جلائے ننگے پاؤں گورگٹھڑی کی طرف پرارتھنا کے لئے گروہ در گروہ اشلوک پڑھتے ہوئے روانہ ہوتیں یہ ایسا رومانی سماں ہوتا تھا جسے دیکھنے کے لئے دوپہر تک چارپائیاں توڑنے

والے کئی نوجوان سحر خیز بن گئے تھے۔ لیکن لوگ دور سے کھڑے ہو کر صرف اس نظارے سے ہی لذتیاب ہوتے۔ کبھی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی نے چھیڑ چھاڑ کی ہو یا کسی قسم کی بے ہودگی کی ہو۔

البتہ سردیوں کی دھند کے ایام میں سحری نماز کے لئے جاتے ہوئے نمازی اکثر بے خبری میں ان سے ٹکرا جاتے -اور بعض نوجوان مسلمان لڑکوں اور ہندو لڑکیوں کے معاشقے بھی اسی بہانے پروان چڑھتے رہے۔

اس سلسلے میں ایک ہندو لڑکی بسنتو اور مسلمان نوجوان افضل کا رومان یہاں لوک رومانوں کی سی شہرت رکھتا ہے۔ اسکے متعلق دو مختلف روایتیں تھیں۔ ایک ہے کہ ان کا رومان پہلے سے چل رہا تھا ملاقات کے لئے یہ راہ نکالی گئی کہ علی الصبح عبادت کے لئے مندر جاتے ہوئے راستے میں مل کر تھوڑی دور ساتھ جائیں اسطرح ایک دوسرے کو دیکھنے اور بات چیت کرنے نیز خطوط کے تبادلے کی صورت نکالی جائے۔ لڑکی منہ اندھیرے اپنی کسی رازدار سہیلی کے ساتھ آنے لگی اور لڑکا راستے میں منتظر رہنے لگا۔ یہ سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا رہا۔ لیکن آخر میں یہ راز کھل گیا لڑکی سے خطوط پکڑے گئے اور اسے نہ صرف مندر جانے سے بلکہ سکول سے بھی اٹھا کر گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن عاشقی صبر طلب کہاں ہوتی ہے۔ اور اس پر راستے کون بند کر سکتا ہے۔ سوہنی تو کچے گھڑے پر تیر کر بھی مہینوال سے ملنے کا خطرہ مول لے لیتی ہے اور فرہاد پہاڑ کھود کر نہریں نکالتے رہے۔

بسنتو اور افضل بھی یہ حدبندیاں توڑ کر ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لئے اپنانے کو اپنے گھر سے بھاگ کر کچھ ایسے الوپ ہوئے کہ ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا - افواہ یہ مشہور ہوئی کہ لڑکی نے اسلام قبول کر کے لڑکے سے شادی کر لی ہے۔ لڑکی کے والدین نے لڑکی کے نابالغ ہونے کی بناء پر افضل کے

خلاف اغواء کا مقدمہ درج کر دیا۔

سیاستدانوں نے اسے مذہبی مسئلہ بنا کر ہندو مسلم فساد کرا دیئے۔ جس میں کئی دنوں تک خاصا خون خرابہ ہوتا رہا۔ یہ بیسویں صدی کے آغاز کا واقعہ ہے۔ جس کے متعلق افسانہ سازی اور مبالغہ آرائی نے کئی گل کھلائے ان کے باہم مل کر خودکشی کرنے عیسائی مذہب قبول کر کے لندن جانے' اور ہندوستان کے کسی دور دراز گمنام شہر میں مستقل رہائش اختیار کرنے کی روایتیں بھی ہیں۔

ویسے تو ہر جگہ ایسی کہانیاں ملتی ہیں۔ لیکن بسنتو اور افضل کے رومان میں وارفتگی کے جو واقعات سننے میں آتے تھے۔ ان میں کچھ ایسا والہانہ جذبہ نظر آتا ہے کہ کہانی لوک داستانوں کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ مثلاً" یہ کہ ان پر ملنے کی پابندی لگنے کے بعد ایک دن افضل انکی گلی سے گزر رہا تھا کہ بسنتو کی کھڑکی سے اس پر نظر پڑی اور اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ لیکن بجلی کی تاروں پر گری جہاں سے اچھل کر افضل کی باہوں میں جھول گئی۔ اسکے کمرے سے بارہا والدین کو افضل سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں ۔لیکن دروازہ کھلنے پر اسکے سوا اور کوئی بھی وہاں موجود نہ تھا۔

اسکے جانے کے بعد اسکے کئی عزیزوں نے انہیں شہر کے مندروں اور بزرگوں کے مزاروں پر دیکھا لیکن قریب جانے پر وہ غائب ہو گئے۔ گویا وہ خود نہیں تھے بلکہ ان کی روحیں تھیں۔ ایک دفعہ بسنتی کی ماں نے بسنتی کو اس روپ میں دیکھا کہ اس کے ایک دھڑ میں دو چہرے لگے تھے۔ ایک بسنتو کا اپنا اور دوسرا افضل کا اور گورکھڑی کے مندر میں جہاں بسنتی موم بتیاں روشن کرتی تھی۔ وہاں مدتوں اسے موم بتی جلاتے ہوئے دیکھا گیا۔ لیکن دیکھنے والا اس کے قریب جاتا تو وہ غائب ہو جاتی۔

ہمارے گلی محلے اور بازاروں میں افلاس برستا تھا اور غربت جہالت کھلے بندوں اینٹھتی پھرتی تھی۔ کہنے کو تو دو منزلہ' سہ منزلہ مکان تھے۔ لیکن دراصل وہ

کھولیوں سے بھی بدتر تھے۔ بچہ کشی جو غربت کا لازمی نتیجہ ہے۔ زوروں پر تھی ہر گھر سے درجنوں بچے نالی کے کیڑوں کی طرح رینگتے ہوئے نکل آتے اور پوری گلی میں پھیل جاتے۔ ننگ دھڑنگ بچے' فاقہ زدہ' میلے کچیلے' سر جوؤں سے اٹے ہوئے' جسم پر میل کی تہیں جمی ہوئیں' کسی کھاتے پیتے گھر سے فروٹ کے چھلکے گلی میں گرتے تو یوں ان پر ٹوٹ پڑتے جیسے آسمان سے من و سلویٰ اترا ہو۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے' ننگی گالیاں بکتے' لہو لہان ہو جاتے ان کا شور سن کر ان کے والدین مرد و زن گھروں سے امنڈ پڑتے اور لعن و طعن کے بعد دست و گریبان ہونے تک نوبت پہنچ جاتی۔ بسا اوقات چھریاں چاقو چل جاتے۔ کبھی کبھی کوئی قتل کی واردات بھی ہو جاتی۔

اکثر و بیشتر نوجوان بھی بے کار روٹیاں توڑنے کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ بازار کی دکانوں یا تھڑوں پر بیٹھ کر سارا دن تاش کھیلتے' تمباکو کی چلم اور چرس پیتے' گپیں ہانکتے' ایک دوسرے کو ننگی گالیاں دیتے یا پھر گلیوں میں دائرے کی صورت بیٹھ کر جواء کھیلتے۔ بازار میں ایک آدمی نگرانی کے لئے مقرر ہوتا تاکہ کہیں گشت پر پولیس آجائے تو وہ آکر انہیں اطلاع کر دے تاکہ یہ بھاگ کر جان بچائیں۔ ویسے عموماً" پولیس والے بھی اس کاروبار میں حصہ دار ہوتے تھے۔

ان دنوں یہاں مرد پرستی زوروں پر تھی کسی بڑے چھوٹے گھرانے کے لڑکے غنڈوں کے ہاتھوں محفوظ نہیں تھے۔ خصوصاً" چٹی چمڑی والے لڑکوں کا تو گھر سے باہر نکلنا ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ صرف غنڈے ہی اس بدعت میں شریک نہیں تھے۔ بڑے بڑے شریف گھرانوں کے لوگ اور بعض بزرگ صورت حضرات بھی چوری چھپے کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔

"چوں بہ خلوت می روند آن کار دیگر میکنند یہ کار دیگر" دراصل یہی

تھا۔ کیونکہ اس سے زیادہ قبیح کام اور کیا ہو سکتا تھا۔ جس کی طرف شاعر اشارہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔

پیر، فقیر، ملا، خطیب، فقیہہ، عالم فاضل کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس لعنت سے محفوظ ہو۔ اب سوچتا ہوں تو اسکا سبب واضح طور پر یہ سمجھ میں آتا ہے، کہ عورت پر پردے کی قدغن کے باعث لوگ اس غیر فطری فعل پر راغب ہونے پر مجبور تھے یہ بات اسلئے بھی صحیح لگتی ہے کہ پردے کی شدت کم ہوتے ہی اس کا زوال شروع ہوا اور اب تو اس کا سلسلہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔

ویسے تو پورے برصغیر میں ان دنوں ہم جنسی کا کاروبار عام تھا لیکن صوبہ سرحد کے لئے تو جیسے یہ رسوائی وجہ شہرت بن گئی تھی۔ ہوش سنبھالنے پر مجھے پنجاب، یوپی، سی پی، بنگال، جانے کا اتفاق ہوا تو یہ وبا ہر جگہ متعدی مرض کی طرح پھیلی ہوئی پائی بلکہ بعض جگہ یعنی دہلی، لکھنؤ، کلکتہ، راولپنڈی، لاہور، کراچی میں تو یہ کاروبار بڑے زوروں اور کھلے بندوں پایا۔ لکھنؤ میں تو سنا تھا پیشہ ور لونڈوں کا مخصوص بازار ہے۔ جاکر دیکھا بازار تو نہیں لیکن وہاں کے مشہور چوک میں لوگوں کو بجے سجائے لونڈوں کی خریداری کے کھلم کھلا سودے چکاتے اور رقم وصول کر کے ان کے ساتھ روز روشن جاتے دیکھا۔

ہماری گلی کے باہر دائیں طرف حکیمو چائے والے کی دکان تھی۔ اسکے ساتھ ہی اسکا بڑا بیٹا قیوم، پنساری کی دکان کرتا تھا اسکے آگے ہمارے پڑوسی ''گلا داڑھا'' کی کبوتروں اور بٹیروں کی دکان تھی ساتھ ہی وہ گرمیوں میں تربوز اور سردیوں میں کوئی اور موسمی پھل سنگترے سیب کیلے اور امرود وغیرہ بیچ کر گزر اوقات کرتا۔ اسکی ناف تک پھیلی ہوئی سفید داڑھی تھی لیکن بچوں کی طرح ہر ایک سے ٹھٹھا مخول گالی گلوچ پر زندہ تھا۔ دن کو جو کچھ کماتا رات کو جوئے میں ہار کر سو جاتا۔ اسکے دو بچے تھے ایک لڑکا ایک لڑکی لڑکے نے اس ماحول میں جو

کچھ سیکھا وہی کچھ اختیار کیا وہ گھر میں جواء کرانے لگا چرس بھنگ سارے نشے اسکے گلے کا ہار تھے لڑائی جھگڑا دنگہ فساد تو روزمرہ کا معمول تھا۔

ماں محنت مزدوری کر کے گھر کا خرچ چلاتی بیٹی کی گھر بیٹھے بیٹھے جوانی ڈھلنے لگی تو گلی محلے کے جوان لڑکوں سے پینگیں بڑھانے میں لگ گئی آخر ایک بوڑھے پٹواری کے ساتھ بھاگ کر اس ماحول سے نجات پائی جو اسے دو بچے دے کر چند برسوں میں ہی رنڈھاپا دے گیا۔ گلا یہ ستم دیکھنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ لڑکا ٹی بی اور دمہ کا شکار ہو کر اس دنیا سے سدھارا۔

ان دنوں پشاور کے ڈبگری بازار میں چوباروں پر ہار سنگھار کر کے لونڈے لوگوں کو اشارے کر کے بلاتے لیکن یہ لونڈے یہاں کا مخصوص ناچ ناچنے والے رقاص لڑکے ہوتے تھے۔ جنہیں یہاں کی اصطلاح میں لختئی کہتے تھے۔ ان سے یہ کسب کرانے والے عموماً" میراثی ہوتے تھے۔ جو دور دراز دیہات سے لاوارث معصوم لڑکوں کو لالچ دے کر یہاں لاتے اور تربیت دے کر شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں ان کے ناچ سے روپیہ کماتے یہ لڑکے اکثر خوبصورت اور شکیل ہوتے۔ عورتوں کی طرح لمبے لمبے بال ہوتے کپڑے بھی زنانہ پہنتے اور میک اپ بھی انہیں کی طرح کرتے ان میں بعض تو اتنے خوبصورت ہوتے کہ سولہ سنگھار کے بعد عورتیں بھی ان کے سامنے پانی نہ بھرتیں۔ ان چوباروں میں یوں تو ان کو رقص کی دکان لگا کر بٹھایا جاتا لیکن اسکے درپردہ ان سے پیشہ بھی کرایا جاتا۔ سب سے زیادہ اس سلسلے میں یہ بے حیائی بنوں میں انتہا پر تھی۔ جو پورے صوبہ سرحد کی رسوائی کا باعث بنی ہوئی تھی۔

اسکے علاوہ تیسری صنف یعنی ہیجڑوں کی وجہ سے بھی اس فحاشی نے بڑا فروغ پایا۔ اس زمانے میں پشاور میں سردی بھی بے پناہ پڑتی تھی۔ اور گرمی بھی اسقدر شدید کہ الامان الحفیظ ابھی اس شہر میں بجلی نہیں آئی تھی۔ گرمیوں میں

ہاتھ کے پنکھے سے کام چلاتے سردی میں لوہے کی منقل (کشمیری انگیٹھی) میں لکڑیاں جلا جلا کر وقت گزارتے سردیوں میں نالیوں میں پانی جم جاتا نہروں کی سطح پر برف جمی ہوتی ہر گھر میں بچے رات کو مکانوں کی ممٹیوں پر رکابیوں اور پیالیوں میں پانی ڈال کر رکھ دیتے صبح ککر (برف) جمع ہوتا۔ جس پر شکر ڈال کر مزے لے لے کر کھایا جاتا۔

سردی سے بچاؤ کے لئے بچوں کو روئی کے بنے ہوئے کنٹوپ سروں پر پہنائے جاتے جس سے سر کے علاوہ کان بھی ڈھکے رہتے اسی طرح روئی کی جیکٹ بھی بڑے چھوٹے سبھی پہنتے جو واسکٹ سے ذرا لمبی ہوتی اور آستینوں والی ہوتی ماں ہمیں کنٹوپ اور جیکٹ پہنا کر سکول بھیجتی جو ہم نچلے کمرے میں اتار کر پھینک جاتے اور سکول سے واپسی پر آکر پہن لیتے۔ تاکہ ماں کو پتہ نہ چلے کیونکہ کھیل کود میں یہ لباس حارج ہوتا تھا۔

سردیوں میں گھروں میں صندلی کا رواج تھا۔ جو اب بھی اکثر پرانے گھروں میں چلا آتا ہے۔ صندلی غالباً ایران سے اس علاقے میں آئی کیونکہ ایرانی ایک عرصے تک یہاں حکمران رہے اور ان کے کئی خاندان یہاں آباد ہو گئے۔ صندلی لکڑی کی چھوٹی میز کو کہتے ہیں جس کے نیچے منقل میں کوئلے ڈال دیئے جاتے۔ اور میز کے اوپر بہت بڑا لحاف ڈال دیا جاتا۔ جس کے اردگرد خاندان کے سب بڑے چھوٹے لیٹ جاتے۔ کھانا پینا سب کچھ اسی گرم لحاف کے اندر بیٹھ کر کیا جاتا یہاں تک کہ عموماً رات کو سوتے بھی اسی کے اندر۔

کھاتے پیتے گھرانوں میں صندلی کے اندر ڈرائی فروٹ اور شیری چائے (کشمیری چائے) کی عیاشی بھی کی جاتی، اور نانی اماں، خالہ اماں، دادی اماں، ماسی اماں بچوں کو کہانی سناتی روایتی کہانیاں، جو ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ سے شروع ہوتیں اور کسی شہزادہ شہزادی کے رومان کے بعد انکے ملاپ پر ختم ہوتیں۔

رمضان شریف کی آمد آمد پر سحری اور افطاری کے انتظامات شروع ہو جاتے ا
سے پہلے شعبان میں شب برات کا تہوار گویا رمضان کا سندیسہ لے کر ناز
ہوتا۔ شب برات کو آتش بازی کا سارے شہر میں طوفان برپا ہوتا کہ شہر کی
گلی آتش بازی کے مقابلوں میں میدان کارزار کا منظر پیش کرتی شہر سے گزر
محال ہو جاتا خصوصاً" قصہ خوانی کا مشہور بازار تو بڑے بڑے آتش بازی کا مقا
کرنے والے ٹولوں کا اکھاڑہ بن جاتا یہ ٹولے آمنے سامنے آتش بازی کا ذخ
لے کر ایک دوسرے پر چھچوندروں سے حملہ کرتے۔ ہوائیاں چھوڑی جاتیں
فست بڑے، پٹاخے، پسو، پٹاسی، گولے پھینکے جاتے جو ہینڈ گرینیڈ کی طرح دھما
سے پھٹتے کئی اجنبی راہگیر زخمی ہوتے مقابلہ کرنے والے ٹولے کے نوجوان بچ
جل جاتے۔
اس رات فائر بریگیڈ کی مشینیں آگ بجھانے کے لئے مستعد رہتیں رات بھر
کھیل جاری رہتا۔ فائر بریگیڈ والے سارے شہر میں مشینیں دوڑاتے پھرتے۔
رمضان شروع ہوتا۔ سحری اور افطاری کا چھوٹے بڑے، امیر غریب، گھرانوں م
حسب استطاعت بڑھ چڑھ کر اہتمام کیا جاتا سحری کو سچے گھی کے پراٹھے، ش
بالائی شیری چائے۔ روغنی دودھ سے کی جاتی اور آخر میں قہوہ کا دور چلتا
یہاں کھانے کے بعد ہر گھر میں لازمی طور پر پیا جاتا ہے۔
افطاری گرمیوں میں شربت سے کی جاتی مس کے ایک بڑے بادیہ میں یا م
کے روغنی بڑے طباخ میں اسپغول یا تخم حریاں کا شربت بنایا جاتا۔ ان دنوں
برف کی مشینیں تھیں نہ ریفریجریٹر، پہاڑی برف سوکھے گھاس میں لپٹے ہو۔
آتی لیکن وہ تو امیروں کو ہی میسر آسکتی، غریب طبقہ سرد چاہ (ٹھنڈا کنواں) ۔
پانی بھر کر لاتے یہ کنویں ہر کوچے ہر محلے میں موجود تھے لیکن وہاں سے رمضا
میں پانی کا گھڑا بھر کر لانا جوئے شیر سے کم نہ تھا۔ ہر کنویں پر لوگوں کا تانتا بجو

ہوتا کہ کوئی شریف آدمی وہاں سے پانی بھرنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ ان کنوؤں پر اکثر لڑائی جھگڑے ہوتے۔ مٹی کے گھڑے ٹوٹتے اور چھری چاقو تک چل جاتے اسطرح ہمیشہ ان دنوں میں کئی نوجوان قتل ہو جاتے۔ جو کنویں کا ٹھنڈا پانی لانے کے مرد میدان نہ تھے وہ کورے گھڑے کے پانی پر گزارا کرتے۔ کورے گھڑے میں پانی بھر کر کوٹھے پر سائے میں رکھ دیتے جو ہوا لگنے سے خاصا ٹھنڈا ہو جاتا۔

افطاری میں خرمہ لازمی ہوتا کہ خرمے (کھجور) سے روزہ افطار کرنا ثواب سمجھا جاتا بعض بزرگ نمک سے افطاری کرنا سنت سمجھتے اس کے بعد تلے ہوئے پکوڑے، تلے ہوئے آلو بینگن، کباب شیرمال، آلوؤں کچالوؤں چنے لوبیے کے چاٹ، انڈوں کے حلوے اور فروٹ کھایا جاتا اور عشاء کی نماز کے بعد کھانا کھایا جاتا۔

عید ہمارا سب سے پسندیدہ تہوار ہوتا۔ آج کی طرح اس وقت بھی سرحد کے اکثر شہروں میں پہلے دن عید اور باقی میں روزے کا سماں نظر آتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ پشاور شہر میں نصف آبادی کی عید اور نصف کا روزہ ہوتا۔ اس وقت حکومت مذہبی تہواروں میں دست اندازی نہیں کرتی تھی۔ اب حکومت پاکستان نے رویت ہلال کمیٹی بنا کر یہ ذمہ داری خود سنبھال لی ہے۔ لیکن اب بھی معاملے کی نوعیت وہی ہے۔ سرکاری احکام کو زیادہ تر لوگ نہیں مانتے غیر سرکاری علماء کے فیصلے کو زیادہ معتبر سمجھا جاتا ہے اس طرح دو عیدین منانے کی روایت بدستور چلی آرہی ہے۔

عیدین یعنی عیدالفطر اور عیدالبقر دونوں مسلمانوں کے بہت بڑے تہوار ہیں اور دونوں ہمیشہ سے بڑے اہتمام سے منائے جاتے رہے ہیں لیکن عیدالفطر کو اس لئے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے کہ مہینے بھر کی روزہ داری کا اسے انعام سمجھا جاتا

ہے اسلئے اسکی خریداری پندرھویں روزے سے شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے یہ تھا کہ سویوں کی مشینیں نہیں تھیں ہر گھر میں خواتین رات کو یا سحری کے بعد گھڑوں پر ہاتھ سے یہ سویاں بناتی تھیں۔ اور بنا کر سوکھنے کے لئے چارپائی پر ڈالتی جاتی تھیں۔ یہ بھی ایک تہذیبی روایت تھی اور گلی محلے کی عورتیں مل کر یہ کام کرتیں بچے بھی ان کے ساتھ رات کو جاگتے اور خوب دھوم دھام مچاتے۔ عموماً" خواتین کام کرتے ہوئے لوگ گیت الاپتی جاتیں یا ڈھولا یا ٹپہ گاتی جاتیں۔ ساتھ ساتھ شیری چائے کا دور چلتا خوش گپیاں ہوتیں۔ غریب عورتیں مزدوری پر کام کرتیں اور عید کا خرچہ اور بچوں کے کپڑے کے دام نکال لیتیں۔ یہ سویاں بڑی لذیذ ہوتیں۔ اور شوق سے کھائی جاتیں اب مشینی سویاں عام بکتی ہیں اسلئے یہ روگ کوئی نہیں پالتا۔ لیکن مشینی سویوں کا نہ ذائقہ ہے نہ حلاوت صرف رسم پوری کر لی جاتی ہے۔

عید کی سلائی بھی صاحب استطاعت تو درزیوں سے کراتے لیکن غریب لوگ گھروں میں کیا کرتے۔ عید کی حقیقی خوشی بچوں کو ہی ہوتی ہے۔ نئے کپڑوں اور نئے جوتوں کو ہم اپنے تکیئے کے نیچے رکھ کر سوتے کہ کوئی چرا نہ لے اسکے انتظار میں کئی کئی گھڑیاں کاٹتے عید کے موقع پر عشاق کو خوشی ہوتی تھی کہ اس بہانے محبوب کا دیدار ہو گا۔

ویسے میں نے کبھی روزہ نہیں رکھا۔ لیکن عید کی خوشی بچوں سے زیادہ کرتا ہوں۔ عید سے کئی دن پہلے ہی اہتمام شروع کر دیتا ہوں۔ ہفتہ پہلے سویاں خرید لاتا ہوں بچے تک حیران ہوتے ہیں کہ ابا کو اتنی جلدی کیوں ہے۔ جبکہ وہ روزے کا بکھیڑا بھی نہیں پالتے پھر چار روز پہلے فروٹ آجاتا ہے۔ تو وہ کھسر پھسر کرنے لگتے ہیں۔ کہ ابو اٹھائیس کی عید کر کے چھوڑیں گے۔ ویسے میرا ہمیشہ سے یہ اصول رہا کہ روزہ بعد میں رکھنے والوں کے ساتھ شروع کرو اور عید میں پہل کرنے والوں کا ساتھ دو۔

پاکستان کے دوسرے علاقوں کی طرح پشاور میں بھی نذر نیاز کا بڑا چرچا تھا ہمارا

سید گھرانا تھا۔ اسلئے معتقد طبقے کا نذر نیاز پر بڑا اعتقاد تھا۔ اسلئے آئے دن گھر میں میلہ لگا رہتا۔ بی بی آسیہ کی نیاز جس میں چوری بنائی جاتی اور پھر والدہ اس پر فاتحہ پڑھتی ایک چپنیک (مٹی کی لبوتری ہانڈی) میں یہ نیاز پاک صاف کپڑے میں لپیٹ کر رکھتے۔ لوگ دور دور سے یہ نیاز کھانے آتے۔ نیاز جس کمرے میں ہوتی وہاں سے ہٹائی نہیں جا سکتی تھی اس کے اسی کمرے میں شام تک ختم کرنا ہوتا تھا۔

دوسری نیاز شاہ سرخرو بادشاہ کی ہوتی اس میں کچوڑی کے سائز کی پوڑیاں میدہ آٹا گوندھ کر گھی میں سرخ کی جاتیں ساتھ حلوہ بنایا جاتا اس نیاز کے لئے چالیس دن کہانی سننا پڑتی تھی۔ ہر روز نذر نیاز کی کہانی سنانے کے لئے خصوصی خاتون بلوائی جاتی جو بڑے اہتمام سے روز آکر کہانی سناتی۔ باوضو ہو کر سب گھر بیٹھ جاتا۔ چالیس دن تک یہ عمل جاری رہتا اسکے بعد ضرورت مند کی ضرورت پوری ہونے کا انتظار کیا جاتا جب اسکی ضرورت پوری ہو جاتی تو اسے کہانی سنانے والی کو کپڑوں کا قیمتی جوڑا اور نقدی کی معقول رقم دینی ہوتی۔

اسی طرح بی بی آس کی نیاز کا بھی رواج تھا۔ جو زنانہ نیاز کہلاتی تھی۔ اسمیں آٹے کو گوندھ کر تیل میں سرخ کر لیا جاتا اور شکر اور دہی کے ساتھ کھایا جاتا یہ بہت لذیذ ہوتی لیکن یہ صرف خواتین کھا سکتیں مردوں کے لئے اس کمرے میں جاکر اسے دیکھنا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ کہا جاتا تھا۔ کہ یہ نیاز چونکہ پردہ دار بی بی کی ہے اسلئے مردوں کے لئے ممنوع ہے مجھے یہ بہت پسند تھی اسلئے نظر چرا کر میں اس کمرے میں گھس جاتا اور خوب چٹخارے لے کر کھاتا ایک دن امی نے دیکھ لیا اور پھر وہ پٹائی ہوئی کہ کچھ نہ پوچھئے۔

ایک نیاز اماں چار نقل میوہ دانہ کی دیتیں۔ اس میں میوہ، چنے، بادام، گری، اور خوبانی وغیرہ ہوتیں اسپر ختم دے کر بچوں بوڑھوں اور علاقے میں بانٹ دی جاتی۔

ایک نیاز کباب روٹی کی ہوتی جو مرد عورت سب کھا سکتے تھے۔ اماں بہت سے

کباب اور روٹیاں منگوا کر یہ نیاز دیتی اور سلاو ڈال کر مجھے دیتی کہ یہ فاتحے کی نیاز ہے تمام محلے میں دے آؤ میں یہ کچھ غریب گھروں میں بانٹ دیتا کسی امیر گھرانے میں دینے پر مجھے بڑا غصہ آتا۔

مجھے یوں لگتا ہے کہ عورتوں پر پردے کی سختی کی وجہ سے یہ نیازیں ان کی آپس میں مل بیٹھنے، مل کر کھانے پینے اور ہنسی مذاق میں اچھا وقت گزارنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ کچھ صرف عورتوں کے لئے اس لئے رکھی گئیں ہیں کہ مرد اس میں شامل ہو کر رنگ میں بھنگ نہ ڈال سکیں۔

ہماری صرف ایک ہمشیرہ تھی۔ سب سے بڑی تھی جسکا نام حضرت جان تھا میری پیدائش سے پہلے وہ وفات پا گئیں اسلئے میں تو انہیں نہ دیکھ سکا لیکن والدہ بھائیوں اور دوسرے اقرباء کا کہنا تھا کہ پورے خاندان میں وہ سب سے زیادہ خوبصورت تھیں انکی شادی اپنے ہی ایک رشتہ دار دلاور شاہ سے ہوئی جو خاصے امیر لوگ تھے۔ دلاور شاہ بہت عیاش تھا کہتے ہیں وہ آدھی رات کو نشے میں چور گھر آتا اور آئے دن چھوٹی چھوٹی باتوں پر بیوی کو اتنا پیٹتا کہ وہ لہو لہان ہو جاتی ایک سال بعد انکی ایک بچی ہوئی جسکا نام بہرہ ورجان رکھا گیا۔ اور میری بہن تپ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر چل بسی۔ اس وقت تک تپ دق کا کوئی موثر علاج دریافت نہیں ہوا تھا۔ بعد میں ہمارا بہنوئی بھی دق کا شکار ہوا۔ اس خاندان میں یہ مرض ایسا لگا کہ بہرورجان کے علاوہ سارا خاندان اس مرض کا شکار ہو گیا۔

بہرہ ورجان جو دو سال کی عمر میں والدین کے سائے سے محروم ہو گئی تھی۔ بچپن ہی میں اتنی خوبرو اور نازک اندام تھی جیسے موم کی گڑیا۔ ہماری نانی بی جی اسے دوھیال میں بیماری کے ڈر سے اپنے ہاں لے آئی اس کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی اسلئے بہرہ ور جان انکے گھر میں بڑے ناز و نعم سے پلنے لگی ذرا بڑی ہوئی تو چندے آفتاب چندے ماہتاب چہرے پر سرخی سفیدی جیسے ٹھاٹھیں مارتی تھی وہ مجھ سے پانچ سال بڑی تھی۔ چونکہ بہن فوت ہو چکی تھی اسلئے ہم اسے بہن ہی

سمجھتے تھے اور عام لوگوں کا بھی (سوائے خاندان کے) یہی خیال تھا کہ وہ ہماری ہمشیرہ ہے خوش قسمتی سے وہ ذہین و فطین بھی تھی۔ ابھی مشکل سے ہوش سنبھالا ہو گا کہ ایک کھاتے پیتے خاندان میں اس کا رشتہ ہوا اور وہ پیا کے گھر سدھار گئی۔

بہرہ ور کے شوہر سید محمود شاہ رضوی کے والد سید یحییٰ شاہ کی اپنی واجبی سی زمینداری تھی پھر انہوں نے اپنا چائے اور قالین کا کاروبار کیا اور ایران اور ہانگ کانگ تک اپنی تجارت پھیلائی پھر کلاہ لنگی کا وسیع پیمانہ پر کاروبار کرتے رہے اور آخر میں ریاست بہاولپور کے چھوٹے شہر ہارون آباد کے نواح میں 12 مربع زمین قسطوں پر حاصل کر کے اسے آباد کرنے کے لئے محمود شاہ رضوی کو ہارون آباد بھجوا دیا۔ اس ریگستانی زمین کو آباد کرنے میں محمود شاہ نے جس جفاکشی سے محنت کی اور اپنی شب و روز کی محنت سے اسے جس طرح قابل کاشت بنا کر گلزار بنا ڈالا یہ اپنی مثال آپ ہے۔

محمود شاہ رضوی کا والد پڑھا لکھا ہونے کے باوجود بڑا سخت گیر اور خودسر نیز زبردست سرمایہ دارانہ ذہنیت کا مالک تھا۔ رضوی کی والدہ کی وفات کے بعد اس نے تین چار شادیاں کیں ان سے مزید بچے بھی ہوئے اور انکی سوتیلی ماؤں کی لگائی بجھائی پر اس نے رضوی کو اپنے آباد کردہ گاؤں یحییٰ آباد سے بیک بینی و دو گوش نکال باہر کر دیا۔ رضوی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ پشاور آیا تو اس کے سر چھپانے کو بھی جگہ نہ تھی۔ بیوی کا زیور تک اس سے چھین لیا گیا تھا۔ ان حالات میں وہ ہمارے ہاں آکر ٹھہرا لیکن اس بہادر انسان کی پیشانی پر کوئی شکن تک نہ تھی۔ اس نئے نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کی وہ دوسری جنگ عظیم کے دن تھے اسے فوج میں ملازمت مل گئی وہ گریجویٹ تھا۔ اور اسے انگریزی، اردو، پشتو، فارسی زبانوں پر پورا عبور تھا۔ جنگ ختم ہونے پر اس نے ملازمت چھوڑ دی اور روزنامہ ''شہباز'' کا سب ایڈیٹر ہو گیا۔

میرے بھائیوں میں سب سے بڑے چمن بادشاہ تھے بڑے رکھ رکھاؤ اور نفیس

لباس پہنے والوں میں شمار ہوتا تھا فروٹ کا کاروبار کرتے تھے۔ اور جب بڑا ہوا تو اکثر مجھے شہر سے باہر جاتے وقت اپنے ساتھ لے جاتے کلکتہ بھی فروٹ کے کاروبار کے سلسلے میں گئے تو مجھے ساتھ لے گئے جہاں سے میری شاعرانہ زندگی کی ابتداء ہوئی بھائی صاحب سر پر نفیس کلاہ لنگی پہنتے اور جب بوسکی کی قمیض اور لٹھے کی شلوار پہن کر تانگے پر نکلتے تو ہر شخص کی نگاہیں ان پر جم کر رہ جاتیں انہوں نے دو شادیاں کیں جن میں سے قربان علیشاہ۔ منصور علی شاہ عباس علی شاہ اور رحمت علی شاہ فرزند علی شاہ بیٹے اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بچے ماشاء اللہ ہونہار نکلے جبکہ رحمت صحبت بد کی وجہ سے راستے سے بدک گیا اسے قتل میں سزا ہوئی اور سزا کاٹ کر نکلا تو بازار کلاں میں مخالف فریق نے گولیاں مار کر ہلاک کردیا۔ بھائی صاحب کو اس سے بہت پیار تھا "جیسے اکثر نالائق بچہ والدین کو زیادہ ہی اچھا لگتا ہے" اسکا مرنا تھا کہ انکی صحت بگڑتی گئی اور پھر ایک دن انکی آنکھیں بند ہو گئیں بڑے بھائی ہونے کے ناطے مجھے ان کے مرنے کا انتہائی صدمہ ہوا اور ایک عرصے تک یہ جدائی دل سے نہ بھلائی جا سکی۔

ان سے چھوٹے سید لعل بادشاہ تھے لعل بادشاہ بڑے بھائی کے برعکس اسی قدر حلیم الطبع تھے طبیعت ایسی کہ مکھی کو بھی ضرر نہ پہنچے تربیت کا یہ حال تھا کہ کیا مجال جو کوئی بچہ ایک نماز بھی قضاء کر سکے۔ ان کی تمام زندگی حلال و حرام میں تمیز کرتے گزر گئی گورنمنٹ پرنٹنگ پریس میں ملازم تھے اور قسم کھا رکھی تھی کہ نہ خود کھائینگے نہ کسی کو کھانے دیں گے میری تربیت انہوں نے بچوں کی طرح کی اتنی نمازیں پڑھائیں کہ میری ساری عمر کی عبادت بچپن ہی میں ختم کروادی مجھے یاد ہے۔ رمضان میں تراویح کے لئے مجھے ساتھ لے جاتے میں بچہ تھا اسلئے پیچھے کھڑا ہو جاتا اور تراویح شروع ہوتی تو کونے میں جاکر سو جاتا۔

آخری وقت میں جب وہ تراویح ختم کرتے تو مجھے دو عدد چانٹے رسید کر کے گھر واپس لے آتے۔

خدا نے حق حلال کی کمائی کے طفیل انکے بچوں کو دن دونی رات چوگنی ترقی دی ان بے مثل بچوں میں ہر ایک اپنی مثال آپ نکلا۔ ایک انتہائی مذہبی ہونے کے ناطے انہوں نے بچہ کشی کا شوق جی بھر کر پورا کیا انکے سعادت مند اور لائق بیٹے مصطفیٰ شاہ(AVP نیشنل بنک)۔ مرتضیٰ شاہ (پروفیسر)۔ مجتبیٰ شاہ (نیشنل بنک آفیسر)۔ شبیر علی شاہ (بزنس مین)۔ عنایت علیشاہ (گورنمنٹ آفیسر) اور انجینئر سجاد علی شاہ اور میونسپل کارپوریشن کے بادی شاہ ہیں اور ایک آدھ نے بزنس میں نام کمایا۔ بچیوں میں دو اولادیں چھوڑیں جو ماشاء اللہ اپنے گھروں میں خوش خوشحال ہیں۔ انکی موت پر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک دفعہ پھر میرا باپ مر گیا۔

تیسرے بھائی سید بادشاہ کی زندگی بڑی ٹریجک تھی وہ خوبصورتی میں جوان رعنا تھا۔ پہلوانی کا شوق رکھتا اور اس کا اپنا اکھاڑہ تھا جہاں کئی شاگرد پال رکھے تھے ان دنوں پہلوانی کے فن میں کافی رقابتیں چلتیں تھیں شہر بھر میں کئی اکھاڑے تھے ہر ایک کا ایک استاد ہوتا جو پہلوان شاگرد ایک پہلوان کے اکھاڑے سے دوسرے کے اکھاڑے میں چلا جاتا پہلا استاد اس کا دشمن ہو جاتا۔ سید بادشاہ ایسا نہ تھا وہ تو بس شوقیہ اکھاڑہ چلا رہا تھا اسکا شوق سجے سجائے تانگے میں بیٹھ کر اکھاڑے جانے اور واپس آنے کے بعد نمازیں پڑھنا تھا۔ طاقتور اتنا کہ ایک دن جب میری عمر چار سال کی تھی وہ اکھاڑے سے آیا تو میں گھر کی دوسری منزل پر کھڑکی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ چونکہ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے انہوں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے پچکارا میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چھلانگ لگا دی سید بادشاہ نے لپک کر مجھے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا لیکن کئی دنوں تک ماں

ہلدی اور تیل کی مالش ان کے بازوؤں پر کرتے وقت مجھے کوستی رہتی۔
پھر ایک دن جب وہ صبح نماز پڑھ کر باقر شاہ محلے کی مسجد سے نکل رہے تھے
ایک شقی نے چھپ کر چاقو سے وار کیا۔ چاقو سیدھا ان کے دل میں کھب
گیا اور وہ پہاڑ جیسا جوان کلمہ پڑھ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی جسد جب گھر پہنچی
ایک کہرام بپا ہوا ماں اور خاندان تو چھوڑ تمام شہر سوگوار ہو گیا۔ مجھے تھوڑا تھوڑا
یاد ہے کہ اس کے جنازے میں شریک ہر شخص دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا
بچپن کا یہ واقعہ میری زندگی کا ایک ایسا المیہ ہے جسے اب تک میں اپنی یادداشت
سے نہ بھلا سکا۔ میرا یہ شعر صرف سید بادشاہ پر فٹ آتا ہے۔

تیرے فارغ کی جوانی ایک نغمہ تھا جسے
زندگانی کے سلگتے ساز پر گایا گیا

میرے ماموں سکندر شاہ رعنا کاظمی فارسی کے نہایت بلند پایہ شاعر تھے انہیں
سیاست سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ ایسے غیور کہ ساری عمر فقر و فاقہ میں گزار دی
اور ایک عرصے تک وہ ایران رہے عرصہ دراز کے بعد ایران سے لوٹے تو اپنی
ہمشیرہ یعنی میری والدہ سے ملنے ہمارے گھر آئے میری عمر اس وقت سات سال
سے زیادہ نہ تھی مجھے پتہ چلا کہ وہ شاعر ہیں۔ (اس وقت تک مجھے پتہ نہیں
کہ شاعر کیا ہوتا ہے اور شاعری کیا چیز ہے) لیکن مجھے وہ اتنے اچھے لگے کہ میں
ٹکٹکی باندھ کر انکی طرف دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے یہ بات محسوس کی تو مجھے
کیوں بیٹا اس طرح میری طرف کیوں دیکھ رہے ہو۔ میں نے پوچھا آپ شاعر
ہیں وہ بولے ہاں۔ میں نے کہا مجھے بھی شاعر بنا دیجئے۔ یہ سن کر انہوں نے
سے مجھے دیکھا اور بولے " بیٹا ابھی تم بہت چھوٹے ہو بڑے ہوئے تو بنا دوں
انہوں نے مجھے بہت پیار کیا اور ماں سے کہا یہ بڑا ہو کر بہت بڑا شاعر بنے
اب سوچتا ہوں کہ شاید مجھ میں پیدائشی طور پر شاعری کا مادہ موجود تھا۔ کیونکہ

میں ابھی بمشکل بارہ برس کا ہونگا کہ میں نے تک بندی شروع کر دی۔ پھر یہ
کہ طبیعت حسن پرست بھی تھی یقین کریں۔ میں ماں کی گود میں تھا۔ امی کسی
شادی میں گئی وہاں ایک بجی سجائی نہایت خوبصورت دلہن کو امی نے شادی
کی مبارکباد دی اور اس کا منہ سر چوما مجھے وہ اتنی اچھی لگی کہ میں اس کی
طرف لپکا لامحالہ اس نے مجھے گود میں لے لیا اور پھر یہ ہوا کہ ماں مجھے لینے لگی
تو میں نے امی کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ اور اس کی گود میں رہنے کی
اتنی ضد کی کہ شادی والے گھر میں وہ لڑکی اور میری امی اچھا خاصا تماشا بن گئیں
ایک طرف وہ بیچاری مجھے گود لے کر پشیمان تھی تو دوسری طرف امی پریشان کہ
کیا کرے آخر امی نے مجھے زبردستی کھینچ کر لیا تو اس بیچاری کی جان چھوٹی اور
اس نے شکر ادا کیا۔

کچھ بڑا ہوا تو سید گھرانا تھا والدہ کے پاس سارے محلے کے بچے قرآن شریف
پڑھنے آتے تھے۔ جن میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ہم بھی ان کے ساتھ
قرآن شریف پڑھتے اور چھٹی کے وقت مل کر گڑیوں کا کھیل بھی کھیلتے۔ لیکن
ہم بہت چھوٹے تھے۔ اور ان دنوں جنسی شعور تو اچھے خاصے جوان ہونے تک
کسی کو نہیں ہوتا تھا۔ البتہ لڑکیوں کے ماحول میں رہنے سے یہ ہوا کہ میں بھی
لڑکیوں کی طرح باتیں کرنے لگا اور ضد کرتا کہ مجھے بھی لڑکیوں کے کپڑے
پہنائیں۔

ان لڑکیوں میں ایک لڑکی بہت خوبصورت تھی جو ہمارے محلے ہی میں رہتی تھی۔
اس سے میری بڑی دوستی ہو گئی۔ ہم دوسرے بچوں سے الگ ہو کر کھیلتے اور
گھنٹوں بے معنی باتیں کرتے ماں کو تمام بچوں سے علیحدہ ہو کر ہمارے بیٹھنے پر
خواہ مخواہ اعتراض تھا۔ منع کرنے کے باوجود جب ہم غیر ارادی طور پر **اکٹھے بیٹھے**
ماں کو ایک دن نظر آئے تو اس نے ہمیں پیٹ ڈالا۔ اب ہم حیران کہ ماں کو

کیا ہو گیا ہے کہ بلاوجہ ہمیں مار رہی ہے۔ لیکن جب پتہ چلا کہ ماں نے اس
بچی کی ماں کو کہہ کر اس کا گھر آنا بند کر دیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اب میں
ایسا بیمار ہوا کہ ماں کو اسے منگوانا پڑا اور میں اس کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا اور چ
پھرنا شروع کر دیا۔ بعد میں وہ اس محلے سے چلے گئے۔
ہمارے دو ماموں تھے۔ رعنا کاظمی جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ دوسرے دلاو
شاہ دونوں بڑے جینئس تھے۔ دلاور شاہ ان پڑھ تھے کلاہ دوزی کا کام کر
تھے۔ انہوں نے کلاہ کے پرانے ایک ہی قسم کے ڈیزائن کے نئے نئے ڈیزائ
دو پریزہ' تین پریزہ' چھ پریزہ اور آٹھ پریزہ ایجاد کئے اور کاغذ اور روئی کے
پلتوں والے پرانے ڈیزائن ترک کر کے بغیر پرتوں کے کلاہ ایجاد کیا اور اس
بھائی (جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں) رعنا فارسی کا بہت بڑا شاعر تھا مجھے تو یوں لگتا ہ
جیسے شاعری کا ورثہ بھی مجھے انہیں سے ملا۔ لیکن ہمارے ہاں علم و فضل او
ادب و شعر کی یہ صورت تھی۔ کہ ماموں رعنا کو سوکھی روٹی کے ٹکڑے کھات
میں نے دیکھا ہے۔ اور جب انکی شہرت ایران تک پہنچی اور شاہ ایران نے
انہیں بلا کر درباری شاعر بنا دیا تو پھر کہیں ان کے دن پھرے لیکن ٹریجڈی
ہوئی کہ انہوں نے ایران ہی میں وفات پائی۔ اور ان کا کلام بھی ایران میں
رہ گیا اور یہاں ان کے شاگرد بسمل کے پاس جو ان کا کلام تھا میں اس کی تلاش
میں نکلا تو پتہ چلا کہ بسمل فوت ہو گیا ہے۔ اور جب اس کی اولاد کا اتہ پتہ چلا
اس کی چار لڑکیوں میں سے کسی کے پاس اس کی شاعری کا ذخیرہ نہ ملا ہر ایک
کہتی کہ دوسری کے پاس ہو گا اس کا مجھے شدید دکھ ہوا کہ اس طرح ایک عظ
شاعر ضائع ہو گیا۔
رعنا کاظمی کی زندگی شعر و ادب اور جدو جہد کی زندگی رہی۔ وہ عربی فارس
زبانوں کے عالم بے بدل تھے۔ ایران رسائی ہوئی تو دس برس تک وہاں فارسی

درس دیتے رہے۔ ایران کی ادبی تاریخ میں ادیب پشاوری کے بعد برصغیر کے یہ دوسرے شاعر ہیں جنہیں بھرپور خراج تحسین پیش کیا گیا۔ حریت پسند انسان تھے۔ انگریز دشمنی گھٹی میں پڑی تھی۔ صوبہ سرحد کے جن نوجوان سیاسی رہنماؤں کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے حکمران تختہ دار پر لٹکانے کا فیصلہ کر چکے تھے ان میں قاضی عبدالولی۔ حکیم سنجری اور رعنا کاظمی شامل تھے۔ انہیں پتہ چلا تو کچھ عرصہ انڈر گراؤنڈ رہ کر کام کرتے رہے پھر سرحد عبور کر کے افغانستان چلے گئے انگریز انہیں وہاں بھی قتل کرانے کے درپے رہے۔ دوسرے ساتھی تو ترکی چلے گئے انہیں ادیب پشاوری نے ایران بلا لیا ایران سے واپس آئے تو انگریزی حکومت نے سرحد کے مشہور سیاسی رہنما آغا لعل شاہ بخاری کے ساتھ ان پر بھی بغاوت کا مقدمہ قائم کر کے انہیں گرفتار کر لیا اور لاہور لے گئے۔ یہ چھ ماہ تک حوالات میں پڑے رہے مقدمہ چلا اور ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے رہا ہو گئے۔ علامہ اقبال' رعنا کے بڑے قدردان تھے وہ ایران سے آئے تو انہیں لاہور بلا کر کئی دن اپنے پاس رکھا اس مقدمے سے گلو خلاصی میں بھی علامہ کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ رعنا بڑے خوددار انسان تھے۔ فقر و فاقہ کی زندگی گزارتے رہے لیکن اپنے قدر دانوں کی مدد بھی کبھی قبول نہ کی حالات و واقعات نے بڑا بدماغ بنا دیا تھا۔ بڑے بڑے علماء ان کے سامنے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ لاہور جیل میں عطاء اللہ شاہ بخاری سیاسی قیدیوں کو قرآن و حدیث کا درس دیا کرتے تھے ایک دن یہ بھی جا پہنچے کسی آیت کے متعلق انہوں نے درس شروع کیا تھا۔ کہ انہوں نے ٹوک دیا انہوں نے غصے میں آکر کہا کہ اتنا غرور ہے تو آپ یہ منصب سنبھال لیجئے ۔ انہوں نے کہا کہ کل سے ہم اسی آیت مقدسہ پر درس دیں گے۔ اگلے روز آیت پر بولنا شروع کیا اور پورے بیس روز تک بولتے ہی چلے گئے۔ بخاری مرحوم نے ان کے

ہاتھ چوم لئے اور کہا " خدا گواہ ہے میں نے اتنا عظیم عالم زندگی میں نہیں دیکھا۔ آپ کو قرآن پر اتنا عبور ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے نعوذ باللہ قرآن آپ پر نازل ہوا ہو " علماء میں صرف مولانا ابوالکلام آزاد کے قائل تھے ان سے بھی انہوں نے بعض مسائل پر اختلاف کیا اور انہوں نے مل کر تبادلۂ خیال کی دعوت بھی دی لیکن انہیں دنوں وہ گرفتار ہو کر جیل چلے گئے اور ملاقات نہ ہو سکی۔

آیئے پھر آپکو اپنے محلے لے چلوں اس مختصر سی گلی میں سب سے بڑا مکان ایوب زرگر کا تھا۔ جس نے زرگری چھوڑ کر چائے کا کاروبار سنبھالا تھا اور شنگھائی میں کام شروع کر دیا اس کاروبار میں وہ لاکھوں پتی ہو گیا۔ پھر وہ خود پشاور آگیا اور بیٹے کو شنگھائی بھیج دیا اس کے بعد اس کے بیٹے کے بیٹے نے وہی کاروباری وراثت سنبھالی اور جلد ہی اوپر نیچے خسارے پہ خسارے اٹھا کر سب کچھ بیچ کر اپنے وطن لوٹ آیا اور دکان لے کر بھی وہی زرگری شروع کر دی۔ آخری مکان ہمارا تھا ڈیڑھ منزلہ۔ باقی ایک گلے داڑھے کا تھا اس کے بعد عبدالقادر کا مکان تھا جو مکانوں کی دلالی کرتا تھا۔ اس کے بعد حکیمو چائے فروش کا مکان تھا۔ جس نے مکان کرائے پر دے رکھا تھا۔ اور نیچے دکانوں میں اس کی چائے کی دکان تھی۔ اور بچہ کریانے کا کاروبار کرتا تھا باقی گھر راج مستریوں کے تھے جو خود بھی ان پڑھ تھے اور بچوں کو بھی ہوش سنبھالتے ہی اپنے کام پر لگا لیتے تاکہ آمدن بڑھ سکے۔ ان کو بچوں کو پڑھانے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ کیونکہ ان کی مزدوری اس وقت بڑے بڑے افسروں سے زیادہ تھی۔

یہ بڑی تنگ گلی تھی۔ بمشکل آٹھ فٹ ہو گی جس میں ایک فٹ کی نالی تھی راج مستریوں کے بچے سارا دن اس گلی کی نالی سے کھیلتے اور پانی ایک دوسرے پر پھینک کر ننگی گالیاں بکتے۔ ہمیں باہر نکلنے کی ممانعت تھی اس لئے کھڑکی سے

نظارہ کرتے رہتے۔
ہمارے گھر میں بھنگی "بھولا" نامی کمانے کے لئے آتا۔ اس وقت چار آنے اس کی تنخواہ تھی محلے کے سارے گھروں میں وہی کام کرتا تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تنخواہ بڑھ گئی شادی کے بعد میں کرائے کے مکان میں چلا گیا عرصہ دراز کے بعد ایک دن میں جب اپنے آبائی مکان میں بھائی کے گھر گیا تو اپنی گلی میں بھولے کو اسی طرح نالیاں صاف کرتے دیکھا وہ بوڑھا ہو چکا تھا کمر جھری اور بال سفید ہو گئے تھے۔ وہ 80 سال کے قریب ہو گا اس پون صدی میں اس کی زندگی میں کوئی انقلاب نہ آیا بلکہ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کا ایک ہی جوان بیٹا ہے جو یہی کام کرتا ہے۔ گویا اس کی پوری نسل کی قسمت میں یہی پیشہ لکھا تھا۔
اس کے مقابلے میں میں نے گل بہار کالونی میں اپنا مکان بنایا تو وہاں اس علاقے میں غنی جمعدار کام کرتا تھا وہی ہمارے گھر میں صفائی کے لئے آنے لگا ایک دن اس نے بتایا کہ وہ صدر کے علاقے تک اپنے پرانے گاہکوں کے گھر کام کرتا ہے اور مہینے میں کمیٹی کی تنخواہ کے علاوہ ایک ہزار روپے کما لیتا ہے پانچ سو روپے ماہانہ تو وہ ایک ہائی سکول میں صفائی کے لیتا تھا۔ اسکا بیٹا سینٹ میری سکول میں پڑھتا تھا۔ جس کا خرچ چھ سو روپے ماہانہ تھا بارش کے دن وہ عموماً" پورے دن تانگہ کرائے پر لیتا اور سب گھروں میں جا کر اپنی ڈیوٹی بھگتا کر آتا۔
غنی بڑا زندہ دل اور خوش باش شخص تھا۔ دو گھڑی کے لئے گھر آتا تو لطیفوں اور مزاحیہ جملوں سے گھر میں عورتوں اور بچوں کو خوب ہنساتا اور لطف یہ کہ خود سنجیدہ رہتا۔ بچے اس سے بڑے مانوس تھے کسی دن غنی نہ آتا تو بچے اداس ہو کر کہتے آج غنی نہیں آیا۔ غنی فخر سے کہتا کہ آغا جی اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بناؤں گا۔ اگر امیروں کے بچے ڈاکٹر بن سکتے ہیں تو ہم بھی تو انسان ہیں نا جی اور پھر

وہی ہوا آج غنی کا بیٹا ایک نامور ڈاکٹر ہے میرا عقیدہ اس سے اور پختہ ہوا کہ انسان جس حال میں رہنا چاہے اگر پختہ ارادہ کر لے تو وہ ضرور اپنی منزل پا سکتا ہے۔ اب اس کی مرضی کہ وہ بھولا بن کر رہنا چاہتا ہے۔ یا غنی بن کر۔

گلی سے باہر بازار کلاں تھا۔ بازار کے سامنے والے حصے میں ایک تاج درزی کی دکان تھی جس کے ساتھ سرور درزی کی دکان ہوا کرتی یہ دکانیں نسبتاً" اس علاقے کے پڑھے لکھے نوجوانوں کی نشست گاہیں تھیں۔ تاج درزی خوبصورت جوان تھا بیوی ایسی پلے پڑی تھی جس کا رنگ اور ناک نقشہ کسی ڈھنگ کا نہ تھا۔ سرور درزی خود بھی کالا کلوٹا تھا بیوی بھی ایسی ہی پائی لیکن وہ سیدھا سادھا' صابر و شاکر انسان تھا۔ دن بھر مشین چلاتا یا پشاوری تمباکو کی چلم پھونکتا۔ تاج بھی صبح سے شام تک مشین چلاتا اور چلم پیتا رہتا۔ وہ گھریلو زندگی سے مطمئن نہ تھا لیکن اتنا جرات مند بھی نہ تھا کہ کچھ کر گزرتا جنسی تشنگی اس کے انگ انگ سے پھوٹتی تھی ایک بڑے گھرانے کی سلائی اسے ملی ہوئی تھی وہاں کبھی بیگم کا ناپ لینے جاتا تو ہفتوں سرشار رہتا دوستوں سے مزے لے لے کر بیگم کی تیکھی نظروں' مسکراتے چہرے اور ہوس انگیز جسم کے ایک ایک زاویے کی کیفیت بیان کرتا۔ برقعے میں کوئی خاتون دکان کے سامنے سے گزرتی تو آخری حد تک اس کی ہوسناک نظریں اس کا تعاقب کرتیں۔

جیسا پہلے ذکر ہو چکا ہے پردے کی شدید پابندیوں کے باعث سارے شہر میں لونڈوں کے عشق کا مرض عام تھا۔ ان دنوں درزیوں کے پاس بھی کام سیکھنے اگر کوئی شاگرد آجاتا اور اتفاقاً" وہ قبول صورت بھی ہوتا تو وہ خود بھی بری طرح اس میں دلچسپی لینے لگتے اور ان کے یار دوستوں کا ہجوم بھی ان کی دکان پر بڑھ جاتا اور پھر ان کی گفتگو کا اہم موضوع ان دنوں یہی ہوتا۔ ان کی سب سے بڑی عیاشی چائے کی چینک تھی جو اس وقت ایک آنے کی ہوا کرتی ہر آنے والے

دوست سے یہی تقاضہ ہوتا کہ وہی چائے پلائے۔ البتہ کوئی باہر کا مہمان آجاتا تو بادل نخواستہ زخم انہیں خود کھانا پڑتا۔
ایک اور شخصیت اس بازار میں چاچا حسو کی تھی۔ چاچا حسو کا اصل نام حسن تھا وہ پنساری کی دکان کرتا تھا اور علاقے میں بہت پرانا دکاندار تھا اسی وجہ سے سارے علاقے والوں کا اسے پورا حسب نسب معلوم تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی مالی حالت بھی اس سے پوشیدہ نہ تھی۔ بلکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ملازمت پیشہ لوگوں کی تنخواہ کتنے دن چلتی ہے۔ اور پھر کب سے وہ ادھار پر گزارا کرتے ہیں۔ چاچا حسو کا سارے علاقے والوں پر بڑا رعب تھا اور سب اس سے دبتے بھی تھے۔ کیونکہ تقریباً" تمام علاقے میں ملازم پیشہ لوگ رہتے تھے جس کی تنخواہ بمشکل 20 روز تک کفیل ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد معاملہ قرض پر ہی چلتا ہے۔ لہٰذا سارا علاقہ اس کا قرض دار رہتا چاچا بزرگ شخص تھا۔ اس لئے علاقے کے سارے بڑے چھوٹے اس کا احترام کرتے اور وہ بھی گھر کے بزرگوں کی طرح انکی سرپرستی کرتا۔
چاچا حسو کی دکان سے 20 قدموں پر اس محلے کے رہنے والے ایک درزی کی دکان تھی جس کا نام ارباب تھا اور اربابو کہلاتا تھا۔ چاچا سارے بازار والوں کا چاچا تھا لیکن اس کی شروع ہی سے اربابو درزی سے نہیں بنتی تھی۔
ان دنوں سنگر مشین نئی نئی مارکیٹ میں آئی تھی غالباً" دو سو روپے اس کی قیمت تھی اور پانچ روپے ماہانہ قسط پر ملتی تھی۔ اربابو نے بھی ایک مشین خرید لی تھی جسے سارا محلہ دیکھنے کے لئے آتا تھا اور کسی کو مشین کو کام کرتے دیکھ کر بھی یقین نہ آتا کہ یہ مشین واقعی کپڑے سیتی ہے اربابو چھ ماہ تک بڑی باقاعدگی سے مشین کی قسط ادا کرتا رہا لیکن بعد میں کام مندا پڑ گیا تو پورے چھ ماہ تک وہ قسط ادا نہ کر سکا جبکہ کمپنی کی شرط یہ تھی کہ اگر چھ ماہ تک قسط ادا نہ ہو تو

مشین اٹھا کر لے جائیں گے اور ادا کردہ قسطیں ضبط کر لی جائینگی۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ سنگر مشین کی کمپنی والوں نے ارباب کی دکان پر پولیس ساتھ لا کر چھاپہ مارا۔ ارباب درزی نے بڑی منت سماجت کی لیکن وہ نہ مانے اور مشین اٹھا کر لیجانے لگے ارباب کی دکان پر سارا علاقہ جمع ہو گیا۔ وہ کمپنی والوں کی منت سماجت کر رہا تھا کہ اسے کچھ دنوں کی مہلت دی جائے لیکن وہ نہ مانے چاچا حسو اپنی دکان سے اتر کر سارا تماشا کر رہا تھا لیکن جب کمپنی والے پولیس کی معیت میں مشین اٹھانے لگے تو وہ لنگڑاتا لنگڑاتا ارباب کی دکان پر پہنچا اور کمپنی والوں کو للکار کر کہا "خبردار مشین کو ہاتھ مت لگانا" سارا مجمع یہ آواز سن کر بازار کی طرف دیکھنے لگا کہ اتنے میں چاچا حسو دکان میں آگھسا۔ کمپنی والوں سے مشین دکان پر رکھوائی اور پوچھا۔ کتنے روپے ہیں تمہارے انہوں کہا کہ تیس روپے چاچا نے جیب سے نوٹ نکالے اور تیس روپے گن کر ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ جاؤ آئندہ کبھی اس علاقے کے کسی شخص کی بے عزتی نہ کرنا تمام علاقہ چاچا حسو زندہ باد کے نعرے سے گونجنے لگا۔

ہمارے بازار سے ذرا آگے محلّہ ناظر طاہر وردی کے پاس ایک مشہور حلیم کی دکان تھی۔ پشاور کی حلیم عجمی پکوان ہے۔ مشہور ہے کہ وہاں کے شاہی دستر خوان کا چہیتا ڈش تھا اس وقت اس میں زعفران اور دیگر مقویات بھی شامل کی جاتی تھیں لیکن کاکا کی حلیم اپنی مثال آپ تھی۔ اگر عجمی فرمانروا اسے چکھ لیتے تو شاید شاہی نسخے کا ذائقہ بھول جاتے۔ یہ حلیم میٹھی ہوتی۔

حلیم کھانے کے یہاں کچھ اپنے آداب ہیں جن پر چل کر ہی اس کا پورا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ حلیم سردیوں کا پکوان ہے۔ کڑکڑاتی سردی میں علی الصبح ٹھٹھرتے اور دانت بجتے عالم میں لوگ شہر کے دور دراز علاقوں سے کاکا کی دکان پر جمع ہو جاتے جہاں اس چھوٹی سی دکان پر گھاس بچھی زمین پر حلیم کا آرڈر

دے کر انتظار حلیم کرتے۔ کاکا بڑے سلیقے سے پلیٹ میں حلیم ڈال کر خالص گھی سرخ کر کے حلیم پر ڈالتا اس پر فرائی انڈے اور اسپر شکر ڈال دی جاتی اس طرح یہ ایک ایسا ماء الحم بن جاتا جو کشتے کا نعم البدل سمجھا جاتا جو لوگ گھروں میں حلیم پہنچانا چاہتے - وہ رات ہی سے اپنے برتن اور پیسے کاکا کو دے جاتے اور پھر پو پھٹتے ہیں انہیں وہاں پہنچنا پڑتا۔ کاکا اس مرحلے میں پورا فنکار تھا اسلئے کچھ نازک مزاج بھی تھا۔ گاہک کی ایک سے دوسری بات سنتے ہی پلیٹ اور پیسے اٹھا کر سڑک پر پھینک دیتا اور کہتا جاؤ بیوی سے کھچڑی پکا کر کھاؤ حلیم کھانا تمہارا کام نہیں ہے۔ لیکن معاملہ لڑائی جھگڑے تک نہیں پہنچتا کیونکہ لوگ کاکا کے مزاج دان ہو گئے تھے۔ اور اس کا احترام بھی کرتے تھے۔ اس کے نخرے بھی سہتے بعض تو اسے چھیڑنے کے لئے کوئی شوشہ چھوڑ دیتے اور پھر مسکرا کر حلیم کے ساتھ ساتھ اس کی گالیوں سے بھی لطف اندوز ہوتے۔

کاکا صرف سردیوں کے چھ ماہ حلیم کی فصل کاٹنے پشاور آتا اور اتنا کچھ کما لیتا کہ پھر کراچی جا کر اپنے بیٹوں کے پاس آرام سے گرمیاں گزارتا۔ دراصل حلیم پکانا ایک مشکل کام ہے یہ گوشت دال گندم اور بہت سی دوسری چیزوں کو ملا کر پکائی جاتی ہے۔ رات بھر اس کی دیگ میں چمچہ گھوٹنا پڑتا تب کہیں جا کر یہ کشتہ تیار ہوتا۔

اسی محلے کے قریب عطاء محمد عطو بھگاری دال پکاتا تھا۔ یہ بھی بڑی منفرد قسم کا شخص تھا نالے کے پل پر یہ دکان لگاتا اس غضب کی دال ہوتی کہ شہر کے اکثر لوگ اس چٹخارے کے لئے یہ دال کھانے بڑے شوق سے وہاں آتے۔ اور آس پاس کے تھڑوں پر بیٹھ کر اس کے مزے لیتے جو قورمہ پلاؤ سے زیادہ لطف دیتی اپنے آخری سانسوں تک یہ شخص اپنی دال کی لذت سے اہل پشاور کو لذت یاب کرتا رہا اس کے مرنے کے ساتھ یہ دال کا چلن بھی جاتا رہا۔

ایک اور شخص شیرباز نائی حجام اس گلی میں ایک درخت پر چارپائی لٹکا کر پرندوں کی طرح بسیرا کرتا رہا۔ چارپائی کے نیچے اس نے ایک کپڑا باندھ کر اس میں اپنا ضروری سامان ڈال رکھا تھا۔ صبح درخت سے اترتا' سارے دن حجامتیں بناتا اور شام کو درخت پر چڑھ کر سو جاتا۔ شیرباز کسی گاؤں سے آیا تھا اور ایسا آیا کہ ساری زندگی یہیں بتا دی لوگ اس کو دور دور سے دیکھنے آتے تھے۔ بارش سے بچنے کے لئے چارپائی کے اوپر ٹاٹ کا ٹکڑا تنا ہوتا تھا چڑیوں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ جیسے ایک ہی خاندان کے ہوں۔ انہوں نے اس کے پاس ہی اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ اور بڑی آزادی سے اس کے گھر آتی جاتی تھیں۔ وہ انہیں دانا دنکا ڈال دیتا اور یہ اس کے اردگرد چہچہاتی پھرتیں اس کی وفات کے بعد اس کا یہ گھر بھی نہ رہا اور وہ درخت بھی کٹ دیا گیا لوگ بھی اسے بھول گئے لیکن چڑیاں کئی عرصے تک وہاں آکر جمع ہو جاتیں جیسے وہ شیرباز کو تلاش کر رہی ہوتیں۔

شہر میں گرجے کے پاس ایک شخص عبدالرشید داستان گو رہتا تھا جسے طلسم ہفت پیکر کے سارے دفتر ازبر تھے۔ اس کا انداز بیان ایسا مؤثر تھا کہ اپنی اداکاری سے پورا نقشہ کھینچ دیتا تھا۔ لوگ اسے بلاتے محفل آراستہ کرتے رات بھر شیری چائے کا دور چلتا اور وہ داستان شروع کرتا' تاثیر زبان سے حاضرین کو مسحور کر دیتا کیا مجال کہ کوئی اونگ جائے سحر کی اذان ہوتی تو لوگوں کو پتہ چلتا کہ صبح ہو گئی ہے۔ مہینہ مہینہ مسلسل یہ سلسلہ چلتا رہتا اپنے فن پر اسے اتنا فخر اور اعتماد تھا کہ لکھنؤ کے داستان گوؤں کا شہرہ سن کر وہاں پہنچا اور وہاں کے مشہور داستان گو احسن علی سے باقاعدہ ایک سو روپے شرط باندھ کر مقابلہ کیا۔ طریقہ کار یہ تھا کہ رات آٹھ بجے سے بارہ بجے تک چار گھنٹے ایک داستان گو طلسم ہفت پیکر کی داستان سناتا اور جہاں وہ ختم کرتا وہاں سے دوسرا شروع کر دیتا اس

طرح 5 دن تک یہ مقابلہ جاری رہا آخر احسن علی داستان بیان کرتے کرتے بھٹک گیا ٹکڑا جوڑ کر داستان جاری رکھی لیکن رشید نے اسے پکڑ لیا اور اس طرح اس نے بازی جیت لی احسن علی نے ہار مان لی پھر دو ماہ تک رشید وہاں کے لوگوں کی دعوت پر مختلف مقامات پر داستان سناتا رہا۔ اور آخر اسے بڑے تحفے تحائف دے کر نہایت عزت کے ساتھ وہاں سے رخصت کیا گیا۔

میں نے 1936ء میں دائرہ ادبیہ کے دفتر کے ساتھ شاہ ولی قتال کی زیارت میں ایک رات اسے سنا یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اب تک اسے سارے دفتر ازبر تھے یہ بھی مشہور ہے کہ لکھنؤ میں طلسم ہفت پیکر کے مصنف سے مل کر اس نے اس کی ایک غلطی کی نشان دہی کی جسے مصنف نے تسلیم کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

صوبہ سرحد میں ویسے داستان گوئی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہاں کے مشہور بازار قصہ خوانی کی وجہ شہرت بھی یہی ہے کہ یہاں داستان گو مجمع لگا کر قصے کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ یہ داستانیں عموماً پشتو میں ہوتی تھیں۔ اور مذہبی قسم کی ہوتی تھیں۔ ان داستان سراؤں کو ہم نے خود دیکھا اور سنا۔ آخری وقت تک ان داستان گوؤں کے ختم ہونے کے بعد بھی ان کی نسل سے تعلق رکھنے والا ایک ہاتھ پاؤں سے معذور داستان گو تین پہیوں والی گاڑی میں شہر کے دور دراز حصوں میں مجمع لگا کر پشتو داستانیں سناتا نظر آتا یہ پیشہ ور داستان گوؤں کی اسی نسل سے تعلق رکھتا اور اس پر فخر کرتا کہ آج تک وہ اپنے آبائی پیشے کے ذریعے ہی گزر بسر کر رہا ہے۔

پاکستان کے شمال مغربی صوبے۔ صوبہ سرحد کا دارالخلافہ پشاور ان معنوں میں ایک منفرد شہر ہے کہ اس کی ایک اپنی تہذیب ہے اپنا کلچر ہے۔ لباس خوراک، رہن سہن، رکھ رکھاؤ، رسم و رواج، شادی مرگ، میلوں ٹھیلوں میں ایک اپنا

رنگ ہے۔ سب سے جدا سب سے الگ تھلگ۔ پشاوری کو آپ جہاں بھی دیکھیں وہ اپنی وضع قطع سے واضح طور پر پہچانا جا سکتا ہے۔ اب تو مغربی تہذیب نے کہیں بھی کسی قوم کے کلچر کی انفرادیت قائم رہنے نہیں دی پشاور کے باشندے بھی اس سیلاب سے بچ نہیں سکے نئی نسل کی تو پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ البتہ بڑے بوڑھوں میں یہ اقدار اب تک اس طرح محفوظ چلی آتی ہیں۔ ان کا اپنا لباس زری کے کلاہ پر مشہور لنگی فراک کوٹ لٹھے کا پاجامہ پاؤں میں تلے دار پشاوری جوتی یا چپل یہ تو رہا مردوں کا لباس۔ عورتوں کے سر پر "ارخ چین" (تلے دار ٹوپی) اسپر دوپٹہ' قمیض یا پاجامہ کے اندر ململ کا استر لگا ہوا پاؤں میں زری دار جتہ یا تھونچہ۔ یا پھر چاندی کی صندلی' کلائیوں میں سونے کے کڑے گلے میں پونڈوں کا ہار' ناک میں سونے کی نتھ' ماتھے پر سونے کا ٹیکہ' کانوں میں سونے کے گھر۔ غریبوں امیروں کے لباس زیور میں صرف اتنا فرق تھا کہ غریب خواتین کا زیور چاندی کا اور سر پر پہننے کی ارخ چین اور پاؤں کا جتہ نقلی تلے کا ہوتا اسی طرح مردوں کا کلاہ بغیر تلے کے سادہ اور لنگی ریشمی کی بجائے سوتی اور جوتی بغیر تلے کے سادہ ہوتی تھی اور کوٹ کی بجائے روئی والی جاکٹ پہنتے تھے۔ بچوں کو روئی والی کنٹوپ پہناتے تھے جس سے کان بھی ڈھکے رہتے تھے۔

خوراک میں دیکھیئے تو ہر گھر میں صبح ناشتے کے لئے شیری چائے اور روغنی اور رات کو کسی نہ کسی صورت میں چاول خواہ وہ پلاؤ کیصورت ہو خواہ کھچڑی کی طرح یا خشک یعنی ابلے ہوئے چاول اور دال' بینگن ، شلغم' ندرو یا ساگ کے ساتھ کھائے جاتے۔ ویسے جوار کی روٹی اور ساگ بھی ان کا من بھاتا کھانا ہے۔ اور خصوصاً" چپلی کباب تو یہاں کا ایسا سپیشل ڈش ہے جسکی اب دور دور تک شہرت جا چکی ہے۔ اور باہر سے آنے والا ہر مہمان یہاں چپلی کباب چکھے بغیر

نہیں جاتا۔ چپلی کباب یوں تو ہشتنگری میں کئی جگہ بڑے اچھے بنتے ہیں، چمکنی کے کباب بھی خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ مردان تخت بھائی کے بھی لیکن پشاور کے موضع نوتھیہ میں کریمو کے کباب (جو یادش بخیر ہمارے دوست اعجاز راہی کا محلہ ہے) اپنی مثال نہیں رکھتے اس نے اس میں انڈوں کے علاوہ کچھ اپنی سوچ ایسے اجزاء کا اضافہ کیا ہے کہ پورے براعظم میں نصف صدی تک اس کے چپلی کبابوں کی دھوم مچی رہی کہتے ہیں متحدہ ہندوستان کے تیسرے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے لئے اس کے کباب تحفے کے طور پر جاتے تھے۔ مشہور سرخ پوش لیڈر ڈاکٹر خان صاحب تو اس کے کبابوں کے رسیا تھے۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد ڈاکٹر انصاری اور آصف خان کو بھی اپنے خطے کی اس نعمت کے ذائقے سے آشنا کرایا علاوہ ازیں کچھ اور والیان ریاست بھی کریمو کے کبابوں کے مداح تھے۔ سردار عبدالرب نشتر پنجاب کے گورنر تھے تو گورنمنٹ ہاؤس سے مہینے میں ایک دو بار کریمو کے کباب ضرور کھانے جایا کرتے کریمو کے ساتھ ہی یہ بساط بھی الٹ گئی اب اس کا شاگرد کام چلا رہا ہے مگر

وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

بچپن کے کھیل

پاؤں جڑے تو اپنی منحنی سی تنگ مختصر سی گلی میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنے کو نکل جاتا جہاں گلی محلے کے بارہ برس تک ایج گروپ کے لڑکے بلا تشخص لڑکا لڑکی کھیلتے۔ ہم وہاں چھپڑ چھوپ۔ شاں شاں کے ٹپ کنڑبے، کبڈی، ڈغل، چینجو چھپا، بلورے، اخروٹ بازی، اتو دی تلے، سجاہتھ چھپا، توپ ڈنڈا، چور کوتوال، بچ ما بچ گنڈیریاں کھیل کھیلتے رہتے۔

چھوٹے بچے پانچ سال عمر تک تو سارا دن دھمال مچاتے رہتے پانچ سال سے بڑے بچے سکولوں سے چھٹی کے بعد آکر ہمارے ساتھ شامل ہو جاتے۔

ٹیلو

عام کھیل ہے جو ہر جگہ بچے کھیلتے ہیں ایک بچے کی دونوں آنکھیں پٹی سے باندھ دی جاتیں۔ اور ایک مخصوص دائرے کے اندر وہ دوسرے بچوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا تب تک یہ کھیل جاری رہتا جب تک کسی بچے کو اس کا ہاتھ نہ مس ہوتا پھر مس ہونے والا بچہ پٹی باندھ لیتا۔

شاں شاں کے ٹب کھڑبے

یہ کھیل ایسا ہے کہ ایک لڑکا چور بن جاتا جسکا کوئی سکہ اچھال کر فیصلہ کیا جاتا پھر وہ باقی لڑکوں کو پکڑتا جو زمین اونچی جگہ کسی سیڑھی یا دکان پر چڑھ جائے وہ بچ جاتا جو زمین پر پکڑا جاتا یا اسے پکڑنے والے کا ہاتھ بھی لگ جاتا وہ چور ہو جاتا پھر وہ دوسروں کا تعاقب کرتا تاکہ اسے چور بنا سکے۔

کبڈی

یہ ایک عام کھیل ہے جو اب بھی پاکستان ہندوستان میں ہر جگہ رائج ہے دو تین سے بارہ تک لڑکے ایک طرف اور اتنے ہی دوسری طرف ہوتے ہیں

درمیان میں لکیر کھینچ دی جاتی ہے پھر ایک لڑکا کبڈی کبڈی کرتا ہوا مخالف گروپ کی طرف جاتا ہے وہ اسے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں یہ کبڈی کبڈی پکارتا ہے اگر اسکی سانس ٹوٹ جائے اور مخالف اسے ہاتھ لگا لے تو یہ مر جاتا ہے۔ (یعنی آوٹ ہو جاتا ہے) اسی طرح دوسری بار دوسرے گروہ کا لڑکا مخالف کیمپ میں کبڈی کبڈی کرتا آتا ہے جس کے سب لڑکے آوٹ ہو جائیں وہ ہار جاتا ہے۔

ڈغل

زمین میں تین تین گز پر ایک بڑے کٹورے جتنے تین گڑھے کھود کر دو پارٹیاں پتھر یا ٹوٹے ہوئے گھڑے کے ٹھیکرے سے گول چینڈو بنا کر یہ کھیل کھیلتے ٹاس کر کے جسکا ٹاس نکلے وہ کھیل شروع کرتا وہ گول چینڈو پہلے گڑھے پر کھڑا ہو کر ہاتھ سے تیسرے گڑھے میں پھینکتا اگر چینڈو اسی گڑھے میں پہنچ جاتا تو اسے نکال کر وہ پاؤں کے پنچے کی ٹھوکر سے دوسرے اور پھر تیسرے گڑھے میں ڈالنے کی کوشش کرتا اگر کامیاب ہو جاتا تو جیت جاتا ورنہ پھر دوسری پارٹی کا شخص یہی عمل کرتا۔

پاؤں گئی

یہ دو لڑکوں کا کھیل ہوتا جو ٹاس جیت جاتا وہ دوسرے لڑکے کی پیٹھ پر بیٹھ کر سواری کرتا پھر کسی اجنبی گزرنے والے سے جس پر دوسرا لڑکا سوار ہوتا وہ پوچھتا اتو دی تلے اگر وہ نہیں کہہ دیتا تو اوپر والا بدستور سواری کرتا رہتا جب تک کہ کوئی تلے نہ کہے وہ سواری کرتا رہتا۔

سجا ہتھ چھپا

۔ یہ اپنے گھر کے بچے (نہایت کم عمر) آپس میں کھیلتے رہتے یہ کھیل چند بچے زمین پر ہاتھ کے اوپر ہاتھ رکھ کر لیٹتے جس کا ہاتھ نیچے ہوتا وہ یہ بول کہتا۔

" انگولے منگولے چڑیاں چنگولے، چڑی بیٹھی آلے سے چک چک میوہ کھا، کال نے ماری پدڑی تو سجا ہتھ چھپا" اور پھر وہ اپنا ہی دایاں ہاتھ اپنی بغل میں گرم کرنے کے لئے چھپا لیتا اسی طرح باری باری سب اپنا دایاں ہاتھ اپنی بغل میں گرم کرنے کے لئے چھپا لیتے پھر سب بچے اپنے ہاتھ نکال کر نیچے والے بچے کے منہ پر لگاتے کہ وہ دیکھ کر فیصلہ کرے کہ کس کا ہاتھ زیادہ گرم ہے۔ اور آخر میں وہی فیصلہ دیتا کہ فلاں لڑکے کا ہاتھ زیادہ گرم ہے اسلئے وہ بازی جیت گیا۔

توپ ڈنڈا

یہ کرکٹ سے ملتا جلتا کھیل تھا جسے عموماً" بچے کھیلتے البتہ اس میں بارہ بارہ کھلاڑیوں کی قید نہ تھی بہر حال دونوں طرف تین سے زائد کھلاڑی ہونے کی شرط بہر حال تھی کہ اس کے بعد کھیل نہ ہو سکتا۔ کرکٹ کی طرح ٹاس جیتنے والی پارٹی آغاز کرتی اور یہ ایک بال اور ایک ڈنڈے سے کھیلا جاتا اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ ٹاس جیتنے والی ٹیم کا ایک لڑکا تین فٹ کا گول ڈنڈا ہاتھ میں لئے آتا ادھر سے دوسری ٹیم کا لڑکا بال ہاتھ میں لئے اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا اب کھیل شروع ہونے کا سگنل ملتے ہی بال والا لڑکا ڈنڈے والے لڑکے کے سامنے بال اچھالتا وہ ڈنڈے سے اس پر ضرب لگاتا کیچ ہو جاتا تو انکی اصطلاح میں وہ لڑکا مر جاتا بال کو ہٹ لگ جائے اور دور چلا جائے تو کرکٹ کی طرح بھاگ کر سکور بنایا جاتا اس میں یہ ہے کہ کھیلنے والی ٹیم کے بیس سکور ہو جائیں تو ان

کا ایک مردہ لڑکا زندہ ہو جاتا اس طرح کھیل جاری رہتا۔

چور کوتوال

یہ دوڑ لگانے والا کھیل تھا دو سے لے کر آٹھ دس کھلاڑی اسے کھیل سکتے تین لڑکے دوڑ لگاتے جو نکل جاتا وہ کوتوال بن جاتا باقی سب چور۔ پھر سب دوڑتے ہیں اور جو دوسرا لڑکا سب سے آگے نکل جائے۔ وہ کوتوال جب دو کوتوال بن جاتے تو وہ پھر باقی لڑکوں کو آپس میں تقسیم کر کے اپنی الگ الگ ٹیمیں بنا لیتے اور ان ٹیموں میں دوڑ کا مقابلہ ہوتا جو ٹیم جیت جاتی اسے پہلے نمبر پر آنے والا کھلاڑی کوتوال بن جاتا۔

غچی

چینڈو (مٹی کے ٹوٹے ہوئے گھڑے کا ٹھیکرا) ہوتا جو تقریباً" تین انچ کا ہوتا جسے چار پانچ گز دور ایک ڈوغل (آدھ فٹ قطر کے گڑھے) میں پھینکتے ہیں۔ یہ دو افراد کا کھیل ہے اور اس پر پیسے کی شرط لگا کر اسے جوئے کے طور پر بھی کھیلتے ہیں بازی لگاتے ہیں اور جو تین بار ہاتھ سے چینڈو اچھال کر ڈوغل میں ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا وہ بازی جیت جاتا۔

بلورے بازی

ایک دو گز کے فاصلے پر چھوٹا سا گڑھا بنا لیا جاتا پھر دو لڑکے اپنے اپنے بلوروں (شیشے کے گول چھوٹے بال) سے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں دوسرے ہاتھ سے بلورا پکڑ کر گڑھے میں پلانے (یعنی پھینکنے) کی کوشش کرتے جس کا بلورا گڑھے میں گر جاتا وہ جیت جاتا ورنہ دوسرا فریق اسی جگہ سے اس کے بلورے کا نشانہ لیتا اگر وہ اس کا بلورا مار لیتا تو وہ بلورا اس کا ہو جاتا۔

اخروٹ بازی

دو آدمی پانچ چھ گز کے فاصلے پر لائن کھینچ لیتے پھر ایک فریق اپنا اخروٹ ایک لائن پر رکھتا دوسرا اپنے اخروٹ سے پانچ چھ گز کی دوسری لائن سے اس کے اخروٹ کا نشانہ بناتا۔ جو نشانے میں کامیاب ہو جاتا وہ دوسرے کے اخروٹ کا حقدار بن جاتا۔

چھپُڑچھوپ

اس کھیل میں ایک لڑکا کہیں چھپ کر کھڑا ہو جاتا۔ دو لڑکے محلے میں سفید چاک لے کر گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی کوئی حد مقرر کرتے اور گھروں کے دروازوں کے پیچھے گھروں کی سیڑھیوں کے دروازوں کے پیچھے گھروں کی سیڑھیوں کے نیچے غرض اس حدود کے اندر کسی بھی چھپی ہوئی دیوار و در پر دو منٹ کے اندر اندر لکیریں لگانا شروع کر دیتے یہ لکیریں ایسے لگائی جاتیں کہ باوجود ڈھونڈنے کے اسے نظر نہ آسکیں لکیروں کی تعداد معین نہ ہوتی جسقدر بھی وہ دو منٹ کے اندر پوشیدہ سے پوشیدہ جگہ اس حدود کے اندر ڈھونڈ کر لکیریں لگا سکتے وہ لکیریں لگا لیتے۔ جب وقت ختم ہو جاتا تو وہ لڑکا ان لکیروں کو ڈھونڈتا اور پانچ منٹ کے اندر اندر ان سب کو ڈھونڈ کر کاٹنے کی کوشش کرتا جو وہ نہ ڈھونڈ سکتا وہ اسپر سکور ہو جاتا اس طرح باری باری تینوں لڑکے یہ عمل دہراتے جس کا سکور زیادہ ہوتا لکیریں گن کر اس کی جیت کا اعلان کر دیا جاتا۔

تعلیمی دور

چونکہ میرے بڑے بھائیوں نے اپنا کام شروع کر دیا اور والد کے مرنے کے بعد ذمہ داریاں انکے کندھوں پر آن پڑی تھیں اس لئے وہ اپنی تعلیم کی طرف توجہ نہ دے سکے اور فکر معاش میں پڑنے کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب ان کی یہ خواہش تھی کہ سب سے چھوٹے ہونے کے ناطے مجھ پر اپنی توجہ مبذول کر دیں تاکہ مجھے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنا سکیں۔ باوجود اس کے انکی آمدنی بھی بڑی محدود قسم کی تھی انہوں نے میری تعلیم کا بیڑا اٹھایا۔ ادھر میں ٹھہرا لاابالی، جو حد درجے شرارتی اور طبیعتاً" خودسر تھا۔ اپنی بے عزتی برداشت کرنا میری سرشت میں کبھی نہیں رہا بہر حال طالب علم کے طور پر میں انتہائی ذہین تھا۔ لیکن اساتذہ کو کبھی مطمئن نہ کر سکا۔ نت نئی شرارتوں سے میں نے ان کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لیکن شعر و ادب کی طرف میرا میلان بچپن سے تھا یہ دور میرا پرائمری کا گورنمنٹ سکول نمبر ۱ پشاور کا دور تھا۔ ہمارے ایک استاد نئے نئے آئے وہ ہر ایک سے پوچھ رہے تھے بڑے ہو کر کیا بنو گے مجھ سے بھی دریافت کیا میرا جواب تھا شاعر بنوں گا۔ اس پر میری پٹائی بھی ہوئی کہ اس وقت شاعری کو اچھی خاصی آوارگی اور اوباشی کی علامت سمجھا جاتا تھا اتفاق دیکھئے وہی استاد بیس پچیس برس بعد میرے پاس آئے میری شاعری کی بڑی تعریف کی اس وقت وہ کسی گاؤں میں پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے انسپکٹر آف سکول ان کے ساتھ، ان کے سکول کا دورہ کرنے والے تھے اس کی شان میں ایک نظم لکھنے کی فرمائش کی میں نے انہیں کہا کہ یہ کام میں نہیں

کر سکونگا آپ کسی قصیدہ گو شاعر کو تلاش کریں ویسے آپ کا احترام کرتا ہوں اور دوسری ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ اس پر ایک دفعہ پھر وہ مجھ سے ناراض ہو گئے۔ اس دفعہ وہ میری پٹائی تو نہ کر سکے مگر ان کا موڈ بتا رہا تھا کہ دل ہی دل میں انہوں نے مجھے خوب کوسا ہو گا۔

مجھے چھوٹی عمر سے ہی شاعری کا ایسا چسکا پڑا کہ گھر میں شعراء کے جتنے دیوان تھے نیز دوستوں اور عزیزوں کے گھروں میں جتنے شعری مجموعے نظر آئے۔ بے سمجھے بوجھے سب پڑھ ڈالے اس وقت اپنوں بیگانوں کے شعروں کے انتخاب کے سبب میری خاصی رسوائی ہو چکی تھی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ بڑے بھائی نے مجھے داغ کا دیوانِ پڑھتے ہوئے پکڑ لیا اور میری خوب درگت بنائی اور نصیحت کی کہ شاعری پڑھنا تو سچا کلام (یعنی نعت و منقبت) پڑھا کرو کہ اس سے ثواب بھی ہوتا ہے اب میں نے اٹھتے بیٹھتے مطالبہ شروع کیا کہ مجھے سچا کلام لا دیں وہ روز وعدہ کر کے بھول جاتے آخر میرے اصرار پر ایک دن اے ڈی کھوکھر کا چھپا ہوا دو آنے کا کتابچہ لے آئے اس دن میں رات گئے تک جاگتا رہا اور سارا کتابچہ پڑھ ڈالا لیکن مزہ نہ آیا ایسی بے معنی قسم کی تکرار تھی کہ کوئی چیز دل کو نہ لگی پھر کہیں سے داستان امیر حمزہ ہاتھ لگ گئی - اس کتاب نے تو میری راتوں کی نیند حرام کر دی ایک دن بھائی کو طلسم ہوشربا پڑھتے دیکھا تو ان کی غیر حاضری میں تکیئے کے نیچے سے یہ کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔ یہ واقعی ہوشربا ثابت ہوئی اب سکول کی کتابوں کو تو میں ہاتھ تک نہ لگاتا سکول سے آتے ہی ان کتابوں میں ایسا کھو جاتا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہتا یہ کتابیں میں نے بار بار پڑھیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان سے بہت کچھ سیکھا۔ اردو فارسی

الفاظ کا اتنا ذخیرہ حاصل کر لیا کہ بڑے بزرگوں سے کوئی بات کرتا تو وہ میرا منہ دیکھتے رہ جاتے چھٹی جماعت میں اپنے حساب کے ماسٹر کے خلاف میں نے اپنے ہیڈ ماسٹر کو ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس میں ماسٹر صاحب کے سفاکانہ رویے او بدکلامی کی شکایت تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب وہ خط لے کر میرے بھائی کے پاس آئے۔ بھائی گھر آئے تو بڑی دیر تک میری مرمت کرتے رہے کہ بتاؤ خط کس سے لکھوایا میں ہزار قسمیں کھا کھا کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ خط میں نے خود لکھا لیکن وہ آخر تک باور نہ کر سکے۔

اپنے سکول کے زمانے کاایک نہایت دلچسپ واقعہ ابھی تک یاد ہے۔ یہ واقعہ "شیطانی کمرے" کا ہے۔ ہائی سکول میں ہمارے ہیڈ ماسٹر خاکسار تحریک کے بانی علامہ مشرقی تھے ان کا ذرخیز ذہن بچوں کی بہتری کے لئے نت نئی تجویزیں سوچتا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے سکول کے ایک چھوٹے سے کمرے پر شیطانی کمرے کا بورڈ لگا دیا۔ انہوں نے اس کمرے میں یورپ کی طرز پر ایک دکان کھولی جس میں پانچ سو روپے کے سرمائے سے سٹیشنری اور کچھ کھانے پینے کا سامان ڈال دیا اس کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر چیز پر دام لکھے تھے۔ لیکن دکاندار ندارد قیمت ڈالو اور چیز اٹھا کر لے جاؤ۔ علامہ مرحوم نے اس دکان کے افتتاح کے موقعے پر سکول کے تمام لڑکوں کو ہال میں بلا کر ایک تقریر کی جس میں بتایا کہ شیطانی کمرہ تمہارے ایمان کا امتحان ہے اس میں کوئی چوکیدار کوئی پہریدار نہیں ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے تمہیں کوئی دیکھنے والا نہیں ہو گا۔ چاہو تو ساری دکان اٹھا کر لے جاؤ یہ تمہارے ضمیر کا سودا ہے۔

ظاہر ہے دکان میں نقصان ہوتا رہا لیکن رفتہ رفتہ نقصان کم ہونے لگا۔ علامہ صاحب اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے۔ مجھے کئی دفعہ اس شیطانی کمرے میں

جانے کا اتفاق ہوا۔ کبھی دل میں بے ایمانی نہیں آئی ایک دن سخت بارش تھی سکول میں بہت کم لڑکے آئے تھے۔ اور وہ بھی کلاسوں میں بند تھے باہر نکلنا مشکل تھا مجھے اچانک کسی چیز کی ضرورت پڑی میں شیطانی کمرے میں گیا۔ چیزوں کے ساتھ بہت سے نوٹ اور ریزگاری میرے سامنے مال غنیمت کی طرح پڑے تھے۔ میرے اندر کا انسان ڈگمگایا۔ ضمیر میں کشمکش شروع ہوئی۔ بہت دنوں سے میرے پاس تاریخ اور انگریزی کی کتابیں نہیں تھیں۔ ان دونوں پیریڈوں میں روزانہ پٹائی ہوتی تھی۔ سوچا تین روپے میں یہ کتابیں آتی ہیں۔ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے غلط کام کرنا کوئی جرم نہیں نہ چوری ہے۔ نہ ڈاکہ یہ تو بنیادی حق ہے جسے کسی طرح بھی حاصل کرنا بالکل جائز ہے۔ ذہن روکتا رہا دل جواز ڈھونڈ کر اکساتا رہا آخر دل، ذہن پر غالب آگیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر تین روپے اٹھا لئے اور اسی وقت باہر جا کر دکاندار سے دونوں کتابیں خرید لایا۔ میں مطمئن تھا کہ کسی کو پتہ نہیں چل سکتا اگلے روز مجھے ڈرائنگ ماسٹر محمد حسین صاحب نے بلا کر کہا کہ تمہیں علامہ صاحب نے بلایا ہے میرے دل میں تو چور تھا ہی۔ رنگ پیلا پڑ گیا۔ دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ڈرتے ڈرتے علامہ صاحب کے کمرے میں گیا۔ علامہ بڑی مرعوب کن اور سخت گیر شخصیت تھے۔ خاصی دیر کھڑا رہا وہ سر جھکائے فائلوں میں مصروف تھے۔ آخر سر اٹھایا اور مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ نام اور کلاس کا پوچھا اور پھر گرج کر بولے کل تم نے شیطانی کمرے سے تین روپے اڑائے میں دم بخود رہ گیا کہ انہیں کیسے پتہ چلا۔ میں خاموش کھڑا رہا وہ پھر دھاڑے بولتے کیوں نہیں سچ سچ بتاؤ جھوٹ بولا تو کھال ادھیڑ دوں گا۔ میرے لئے اب اقرار کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ میں نے دھیمے سے کہا جی ہاں۔

یہ حرکت تم نے کیوں کی تم جانتے نہیں یہ کتنا بڑا اخلاقی جرم ہے میں نے غور کیا تو یقین ہو گیا کہ ڈرائینگ ماسٹر ان کا مخبر ہے اس نے چھپ کر دیکھا اور انہیں اطلاع دی ہے۔ علامہ کے سامنے جری سے جری شخص بھی بولنے کی جسارت نہ کر سکتا تھا اور میں تو ان دنوں بڑا شرمیلا سا لڑکا تھا۔ لیکن نہ جانے اس وقت مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے کتابوں کی ضرورت تھی جو خرید نہیں سکتا تھا اور ساتھ ہی اپنے ہاتھوں اور بازوں پر ڈنڈوں کے وہ نشان دکھائے جو پٹائی سے آئے تھے۔ علامہ' میری صاف گوئی سے بڑے متاثر ہوئے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور بولے جاؤ اب کے معاف کیا لیکن آئیندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔

میں پسینے میں شرابور وہاں سے نکلا اور کئی دن تک مجھے یہ خیال ستاتا رہا کہ میں نے مجبوری کے باعث بہت بڑا جرم کر ڈالا۔

علامہ صاحب کی خوبیاں ہمالیہ سے بلند تھیں لیکن ان کی خامیاں بھی قراقرم کے احرام سے کمتر نہ تھیں انہیں دنوں اسی حساب کے ماسٹر نے جسکے خلاف میں نے ہیڈ ماسٹر کو خط لکھا تھا۔ کلاس میں ایک لڑکے کو ننگی گالی دی میں نے کھڑے ہو کر انہیں ٹوکا وہ پہلے ہی میرے خلاف جلے بھنے بیٹھے تھے۔ چھڑی اٹھا کر مجھ پر ٹوٹ پڑے میں نے ان سے چھڑی چھین لی اور سکول میں ہڑتال کرادی اگلے ہی دن سکول سے میرا نام خارج کر دیا گیا اور شہر کے تمام سکولوں میں اطلاع کر دی گئی کہ اس بدمعاش لڑکے کو داخلہ نہ دیا جائے۔ چنانچہ اس طرح میرا ایک سال ضائع ہو گیا۔

میں ابھی بچہ ہی تھا کہ پشاور کے قصہ خوانی بازار میں انگریز حکمرانوں نے جنگ آزادی کے جانباز سپاہیوں کے ایک جلوس پر فائرنگ کر کے کشتوں کے پشتے

لگا دیئے میں بھی اس جلوس میں شامل تھا۔ فائرنگ شروع ہوئی تو محلے کے ایک دکاندار کی نظر مجھ پر پڑ گئی وہ مجھے گھسیٹتا ہوا ایک گلی میں لے گیا۔ جہاں ایک دوست کے گھر پناہ لی ہنگامہ ختم ہوا تو اس نے مجھے گھر پہنچا دیا جہاں ایک مجلس عزا برپا تھی کسی نے گھر میں اطلاع دی تھی کہ اس نے مجھے جلوس کے ساتھ دیکھا ہے ادھر یہ افواہ گرم تھی کہ جلوس کا کوئی فرد بھی زندہ نہیں بچا۔ میرے بھائی بری امام کے میلے پر گئے ہوئے تھے گھر میں والدہ اور بی جی تھی میری واپسی تک ان پر قیامت گزر گئی۔

میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے شیردل نوجوانوں کو گولیوں سے چھلنی ہوتے ہوئے دیکھا کئی دنوں تک مجھ پر دیوانگی کی کیفیت طاری رہی اس سے پہلے امرتسر کے جھلیانوالہ باغ میں حریت پسندوں پر انگریز سامراج کی وحشیانہ فائرنگ کے متعلق سن چکا تھا۔ اس کے بعد صوبہ سرحد میں متعدد مقامات پر بنوں کوہاٹ وغیرہ میں شمع آزادی کے پروانوں کے قتل عام کے واقعات رونما ہوئے۔ پشاور شہر میں کئی دنوں تک کرفیو لگا رہا۔ ہر گلی محلے کے سامنے فوجیوں کے مسلح دستے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ کوئی بھولے چوکے باہر جا نکلتا تو اس کی لاش ہی گھر آتی روزانہ دو چار دیہاتی بے خبری کے عالم میں قاتلوں کی گولیوں کا شکار ہو جاتے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سارے ملک میں جنگ آزادی کی تحریک اپنے عروج پر تھی تمام سیاسی رہنما جیلوں میں پڑے تھے۔ انگریزوں سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ گھروں میں بچے ان کے پتلے بنا کر جلاتے انہیں سولی پر چڑھاتے اور غلیلوں سے ان کا نشانہ باندھتے' مائیں اپنے کڑیل جوان بیٹوں کو اپنے ہاتھوں

سے تیار کر کے گرفتاری کے لئے بھیجتیں۔ بیشتر گھروں میں ضعیف العمر بوڑھوں اور کمسن بچوں کے سوا کوئی نوجوان نظر نہیں آتا تھا۔ جاگیردار اور سرمایہ دار لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے تھے کہ عوام انہیں دیکھتے ہی بھڑک اٹھتے اور انگریزوں کے دلال' انگریزوں کے کتے کے نعرے لگاتے تھے۔

کرفیو کے دوران نوجوانوں کی ٹولیاں گلی کوچوں میں چھپ کے تاک میں لگی رہتیں جہاں کہیں اکا دکا فوجی کو دیکھتے انہیں کی بندوق چھین کر ان کو نشانہ بنا کر غائب ہو جاتے۔

اس طوفانی ماحول میں میں نے آنکھ کھولی پشاور سے راس کماری تک ایک قیامت صغرا برپا تھی۔ انگریز نفرت کی علامت بن گئے تھے۔ اور ان کی حکمرانی میں کبھی نہ ڈوبنے والے سورج شکستوں کے اندھیروں میں دفن ہوتا جارہا تھا۔ ان حالات میں کوئی حساس ذہن کا مجھ جیسا جذباتی انسان سیاست سے کیونکر بیگانہ رہ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری شاعری اور میری ادبی تحقیقات پر سیاست کی گہری چھاپ رہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا حسرت موہانی۔ بھگت سنگھ - مولانا عبدالرحیم پوپلزئی۔ کاکا صنوبر حسین۔ ماؤزے تنگ۔ ہوچی منھ کی شخصیات سے میں بہت متاثر ہوں۔ ان کی زندگیوں اور جدوجہد نے مجھے عزم و حوصلہ' جرات مندی اور استقامت سکھائی۔ انسانیت سے محبت کی تعلیم دی اور درخشاں مستقبل پر اعتماد و یقین کی روشنی عطا کی۔

میرا آئیڈیل شہید کربلا حضرت امام حسین کی ذات گرامی ہے جنکے مثالی کردار نے مجھے باطل کی طاغوتی طاقتوں سے بلا جھجک ٹکر لینے کا درس دیا۔ اظہار حق کی جرات اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر صداقت کی راہ پر گامزن ہونے کا

حوصلہ دیا۔

ہے فخر اسوۂ شبیر پر ہمیں فارغ
بغاوتوں کی روایت ہمارے گھر سے ہوئی

عسکری انقلابیت اور علامہ مشرقی

ہم ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے کہ ہمارے دوست ثاقب اور نور الٰہی (دونوں ہم سے دو سال سینئر تھے) ہمارے پاس آئے اور بتایا کہ اگلے روز نور الٰہی کے گھر کی بیٹھک میں ایک میٹنگ ہے جس میں ہم چار بجے شام ضرور پہنچ جائیں۔ ہم نے تفصیل پوچھنا چاہی تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ بات میٹنگ ہی میں بتائی جائے گی اگلے روز ہم مقررہ جگہ پہنچے ہمارے سمیت کل آٹھ لڑکے تھے اور چھ لڑکوں نے آنا تھا۔ ایک گھنٹہ ان کا انتظار رہا صرف ایک لڑکا مزید میٹنگ شروع ہوتے ہی آ پہنچا۔ نور الٰہی مرحوم نے ہمارا آپس میں تعارف کرایا پھر سب سے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر حلف لیا کہ اس "انقلابی پارٹی" کا راز کسی کو نہیں بتائیں گے۔ اغراض و مقاصد ملک کو انگریز حکمرانوں سے آزاد کرنا تھا۔ اور اس کے لئے انگریز افسران کو ہلاک کرنا تھا۔ تاکہ وہ ڈر کر بھاگ جائیں۔ ہوا یہ کہ نورالٰہی کی والدہ کو بیٹے کی غیر معمولی پراسرار حرکتوں سے شک گزرا وہ اندرونی کواڑ سے کان لگا کر سب کچھ سنتی رہیں اور جب اسنے آخری فقرے سنے تو کواڑ کھول کر اندر آگئی نورالٰہی کو خوب پیٹا اور ہمیں بھگا دیا۔ یہ سیاست میں ہمارا پہلا تعارف تھا۔ چونکہ یہ پروگرام ہمارے جذباتی مزاج کے عین مطابق تھا۔ اس لئے ہم اسے نہ بھول سکے اور یہ شعلہ ہمارے اندر ایسا روشن ہوا کہ پھر کبھی نہ بجھ سکا کچھ عرصے بعد ہمارے سابق ہیڈ ماسٹر علامہ عنایت اللہ خان مشرقی نے ایک سال قبل محکمۂ تعلیم سے مستعفی ہو کر خاکسار تحریک کا آغاز کیا۔ جو ایک عسکری تحریک تھی اور نوجوانوں کے لئے اس میں بڑی کشش تھی۔ چونکہ اس کا مقصد بھی انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا تھی۔ اور تشدد پر بھی وہ یقین رکھتے تھے۔ اس لئے ہم نے اپنے دونوں

ساتھیوں ثاقب اور نورالٰہی کے ساتھ اس میں شمولیت اختیار کر لی اور جلد ہی ہمیں اپنے اپنے علاقے کا سالار بنا دیا گیا۔ بس ان دنوں سے جو ہمارے دروازے پر دو سی آئی ڈی کے آدمیوں کی ڈیوٹی لگی تو آج تک چلی آ رہی ہے۔

سیاست میں پڑنے سے ہماری تعلیم تو ویسے ہی دھری رہ گئی کچھ عرصہ بعد ہمیں خاکسار تحریک سے بھی خاصی مایوسی ہوئی علامہ مشرقی سخت گیر انسان تھے ان کے علم و فضل سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا تنظیمی صلاحیتیں بھی ان میں حیرت انگیز تھیں۔ تھوڑے عرصے ہی میں یہ تحریک خیبر سے برما تک پھیل گئی۔

علامہ عنایت اللہ خان مشرقی محلہ خویشکیاں کے ایک مکان جو خان بہادر سیٹھی کرم الٰہی کی ملکیت تھا میں رہتے تھے۔ سیٹھی صاحب کی وجہ شہرت یہ تھی کہ انہوں نے 1922ء میں پرنس آف ویلز کی پشاور میں آمد پر ان کے استقبال کے لئے چند ایک زرخرید لوگ مہیا کئے تھے۔ جبکہ حریت پسندوں نے اس دن پورے شہر میں دو روزہ ہڑتال کرادی تھی تاکہ استقبال نہ ہو سکے لیکن ہوا یہ کہ جب چوک یادگار میں پرنس آف ویلز کا دربار منعقد ہوا تو کاروائی سے پہلے ہی خلافت کمیٹی کے ایک نوجوان کارکن آغا بزرگ شاہ نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا دیا اور اس کے ساتھ ہی سارا کھیل درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ خان بہادر کا خطاب موصوف کو اسی غداری کے عوض ملا تھا۔ جس سال میں سکول داخل ہوا اسی سال کے آخر میں گورنمنٹ ہائی سکول نمبر۱ کی تعمیر مکمل ہوئی جو علامہ مشرقی کی کوششوں کا نتیجہ تھی اور اگلے سال ہی ہم نئے سکول منتقل ہو گئے تھے۔ علامہ صاحب بڑے معرکے کے انسان تھے ایک دفعہ انگریز ڈائریکٹر محکمہ تعلیم سکول کا معائنہ کرنے آیا۔ باہر نکل کر اس کا استقبال کرنا تو

کجا وہ ان کے کمرے میں داخل ہوا تو انہیں کرسی تک پیش نہ کی نہ ہی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ فائلوں پر جھکے اپنا کام کرتے رہے وہ تھوڑی دیر تک کھڑا رہا پھر واپس جا کر ان کے خلاف غیض و غضب سے بھرا خط سیکرٹری تعلیم کو لکھا لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا کہ حکومت اس خود سر شخص کو چھیڑنا نہیں چاہتی تھی جس کی سرکشی کے ڈر سے حکومت نے اسے معتوب بنا کر ایک غیر موثر پوسٹ پر لگا دیا تھا۔ ان کا ڈسپلن اتنا سخت تھا کہ سارا عملہ انکے عتاب سے ہمہ وقت لرزہ براندام رہتا تھا۔

علامہ صاحب کی زندگی کا ایک نہایت اہم واقعہ یہ ہے کہ وہ میٹرک کے ایک حسین و جمیل قزلباش خاندان کے طالبعلم سے پیار کرتے تھے اور اس قدر ٹوٹ کر اس سے پیار کرتے تھے کہ گھنٹوں اپنے دفتر میں اسے بٹھائے رکھتے یہاں تک کہ سارے عملے کو اس واردات کی خبر ہو گئی یہ لڑکا اس قدر خوبصورت تھا کہ اس کے چہرے پر نظر نہیں ٹھہر سکتی تھی وہ جب گھوڑے پر سوار ہو کر گھر سے نکلتا تو سڑک کے دونوں طرف دل زدگان کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ اور فارسی کے اس شعر کا سماں نظر آتا۔

ہم آہواں صحرا سر خود نہاد برکف

بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

اس محبوب کے مقتولوں میں ضلع ہزارہ کے رہنے والے ایک اردو کے ٹیچر بھی تھے جنکا نام غالباً" محمد خان تھا۔ سو اتفاق سے ایک دن علامہ صاحب نے سکول سے چھٹی ہونے پر اسے اس ماسٹر صاحب کے ساتھ جاتا اور ہنستا بولتا دیکھ لیا۔ غالباً" وہ اپنے اس رقیب کو پہلے سے جان گئے تھے۔ اس رات علامہ ایسے غضبناک ہوئے کہ اگلے روز سکول لگتے ہی ماسٹر صاحب اور اپنے محبوب طالبعلم دونوں کو سکول سے نکال دیا۔ دراصل علامہ صاحب کی خانگی زندگی خوشگوار نہ

تھی بیوی بچوں کو انہوں نے گھر سے نکال رکھا تھا۔ غالبا" صرف ایک لڑکا انکے
پاس تھا جو اسی سکول میں اسوقت چھٹی جماعت کا طالبعلم تھا۔ اگرچہ وہ غیر
معمولی عزم کے انسان تھے لیکن فطری تقاضوں کو کون روک سکتا ہے اور آخر
کب تک روک سکتا ہے۔ وہ اٹل اصولوں کے مالک تھے لیکن میں نے ان کے
اصولوں میں جھول بھی دیکھے اور انہیں بعض اوقات پارہ پارہ ہو کر بکھرتے بھی
دیکھا۔ وہ حکومت میں نہ چل سکے تو مستعفی ہو کر میدان عمل میں کود پڑے
انہوں نے خاکسار تحریک جسے لوگ بیلچے کی وجہ سے بیلچہ پارٹی کہتے تھے۔ کا آغاز
پشاور سے کیا میں اس وقت ساتویں جماعت کا طالبعلم تھا۔ اس جماعت کی
عسکری تنظیم نے نئی نسل کے جذباتی نوجوانوں کو بہت جلد متاثر کیا چونکہ
لاکھوں لوگ اس میں شامل ہوتے چلے گئے اس لئے ہم بھی اس کی عسکریت
سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ ہو لئے۔ جب گھر والوں کو پتہ چلا تو بھائیوں نے
بری طرح خبر لی لیکن جب میں باز نہ آیا تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ انگریز
حکمرانوں کو اس مسلم جماعت کی ہمہ گیر تنظیم سے خوف آنے لگا ہر خاکسار کے
پیچھے سی آئی ڈی لگ گئی۔

علامہ علم و فضل میں یکتا تھے انکی آتشیں تحریروں کی خاکسار آیات کریمہ
کی طرح تلاوت کرتے تھے۔ ان کا ہفت روزہ اخبار "الاصلاح" علامہ صاحب کا
خود نوشت اخبار تھا جس میں تین چار صفحات ملک بھر کے خاکساروں کی خبروں
کے لئے وقف تھے اور باقی سارا اخبار علامہ صاحب کی تحریروں پر مشتمل ہوتا تھا
وہ اس وقت لاکھوں کی تعداد میں چھپتا اور جماعتی سطح پر پیشگی رقم لے کر ہر
جگہ بھیجا جاتا تھا۔ وہ بڑی برق رفتاری سے لکھتے اور بہت عمدہ لکھتے ان کے لکھنے
کا سٹائل بڑا منفرد قسم کا تھا ہزاروں تحریروں میں ان کا انداز تحریر پہچانا جا سکتا تھا
لیکن تقریر کے سلسلے میں وہ بالکل کورے تھے چند باتیں بھی بغیر تحریر کے سٹیج پر

بولنا دشوار تھا یہ انکی ایک ایسی کمزوری تھی جو بری طرح کھٹکتی تھی وہ اپنی تقریر ہمیشہ جلسہ شروع ہونے سے نصف گھنٹہ پہلے خلوت میں جا کر لکھنا شروع کرتے اور پندرہ بیس منٹ میں دو تین گھنٹوں کی تقریر لکھ کر برآمد ہوتے تحریر میں ایسا جوش و ولولہ ہوتا کہ سامعین پر سحر سا طاری ہو جاتا اور وہ ایسے ہپناٹائز ہو جاتے کہ اس وقت وہ اپنے ادنی اشارے پر ان سے سب کچھ کرا سکتے تھے وہ بلا کے آرگنائزر تھے۔ اور قانون کی زد سے بچنے کے بھی اسقدر ماہر تھے کہ انہوں نے نہایت تھوڑے عرصے میں ایک ایسی ٹرینڈ فوج تیار کر لی کہ اگر کسی وقت بھی بیلچے پھینک کر وہ بندوق اٹھا لیتے تو ملک میں انقلاب لانے میں انہیں ذرا دیر بھی نہ لگتی۔ لیکن ان کا کمال یہ تھا کہ انگریزوں جیسے زیرک اور ڈپلومیٹ حکمران اس تحریک کو روکنے میں بے بس ہو گئے ایک باقاعدہ فوج کے تمام عہدے انہوں نے نام بدل کر مقرر کر رکھے تھے اسی طرح ان کے عہدوں کی ترقیاں اور تبادلے بھی کئے جاتے بلکہ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہو گا کہ انہوں نے اس فورس کی تنخواہیں بھی مقرر کر لی تھیں اور اپنی کرنسی کے نوٹ بھی چھپوا لئے تھے جن پر لکھا تھا کہ ان کی حکومت آنے پر یہ نوٹ کیش کئے جا سکیں گے لیکن اس کی نوبت نہ آئی اور ان کے جذباتی فیصلوں اور عاقبت نا اندیشانہ قیادت نے ایک موثر تحریک کا قبل از وقت ہی خود اپنے ہاتھوں ناس مار دیا اور انگریزوں کی حکمت عملی جو کہ ان کے معاملے میں بری طرح ناکام ہو چکی تھی خود ان کی عدم تدبیر سے وہ ہاری ہوئی بازی جیت گئے۔

میرا ایک دوست عبداللہ جان جو خاکسار تحریک کا جانباز تھا (جانباز اس تحریک کا ایک شعبہ تھا جس میں شامل ہونے کے لئے نوجوان اپنے خون سے یہ عہد نامہ لکھ کر پیش کرتے تھے کہ وقت آنے پر وہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کریں گے) اس نے پشاور سے پندرہ روزہ "المشرقی" کا اجراء کیا تھا۔ اس عرصے

میں لے ٹی بی ہو گئی اس نے اس پرچے ڈ، ا،ا،،۔ مجھے سونپ دی یہ اخبار میں چھ ماہ تک نکلتا رہا چھ ماہ بعد اس پرچے کا ڈیکلریشن حکومت نے ضبط کر لیا تو میں نے "ابلاغ" کے نام سے ہفت روزے کا اجراء کیا یہ بھی خاکسار تحریک کا آرگن تھا جسے دو ماہ کے بعد بند کر دیا گیا۔

علامہ صاحب نے دہلی میں کیمپ لگانے کا اعلان کیا دو مہینے کی میعاد رکھی گئی اور ایک کروڑ خاکساروں کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ اس وقت متحدہ ہندوستان کی آبادی سات کروڑ سے زیادہ نہ تھی یہ غالباً" 1937ء کی بات ہے ان میں دو کروڑ مسلمان ہونگے جن میں سے بوڑھے بچے نکال کر ایک کروڑ بچتے تھے لیکن اس قسم کی مضحکہ خیز باتیں کرنا ان کا معمول بن چکا تھا۔ مجھے اتفاق سے ان دنوں دہلی جانا پڑا کیمپ میں پہنچا تو اپنے رشتے کے ماموں آغہ بزرگ شاہ مرحوم سے ملاقات ہوئی وہ اپنے علاقہ کے سپہ سالار تھے بولے آؤ مای سے ملو میں ان کے ساتھ زنانہ کیمپ کی طرف گیا دیکھا تو مای صاحبہ جو اسوقت 40 سال کی ہونگی' فل خاکی یونیفارم پہنے' شانے پر بیلچہ اٹھائے کیمپ کے باہر پہرہ دے رہی تھیں۔ میں نے انہیں حیران ہو کر دیکھا اور سلام کیا۔ پہرہ دیتے ہوئے وہ بغیر رکے بولیں "میں ڈیوٹی پر ہوں ایک بجے کے بعد آنا"

پھر میں علامہ صاحب سے ملنے انکے خیمے میں گیا مجھے پہچان کر بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملایا' بیٹھنے کا اشارہ کیا میں ان کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا اور بھی بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جن میں اخباری نمائندے اور کچھ رضاکار بھی تھے وہ ان سے باتوں میں مشغول رہے میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اس دوران انہوں نے پانی منگوایا اور جیب سے اوکاسا (سلور کی بوتل) نکالی اور دو گولیاں نگل گئے۔ میں ان کی طرف ٹکٹکی باندھے غور سے دیکھ رہا تھا پھر سب سے مخاطب ہو کر بولے "یہ اعصابی قوت کے لئے بڑی موثر گولیاں ہیں تیس سال کی عمر کے بعد

یہ گولیاں ہر شخص کو استعمال کرنی چاہییں میں ان کا باقاعدہ استعمال کرتا ہوں اس سے بدن میں چستی توانائی اور تازگی پیدا ہوتی ہے"

میں نے ان سے رخصت ہو کر کیمپ کا جائزہ لیا اعداد و شمار دریافت کیے بمشکل 50 ہزار خاکساروں پر یہ کیمپ مشتمل تھا۔ اور یہ کوئی معمولی تعداد نہ تھی کیونکہ یہ سب اپنے خرچ پر آئے تھے اور خوراک کا خرچ ہر ایک کا اپنا اپنا تھا جبکہ دوسری بڑی بڑی ملک گیر سیاسی جماعتوں آل انڈیا کانگریس اور مسلم لیگ کے پاس لاکھوں کا فنڈ تھا اور تمام بڑے بڑے جلسوں میں شامل ہونے والے سیاسی کارکنوں کا تمام خرچہ یہ جماعتیں خود برداشت کرتی تھیں - اس کے باوجود اتنی تعداد میں مشکل سے لوگ جمع کر سکتے تھے۔ پھر اچانک نہ جانے علامہ صاحب کو کیا سوجھی کہ 313 نہتے جانبازوں کو لاہور میں حکومت کے مسلح سپاہیوں سے ٹکر لینے کا حکم صادر کیا اور وہ مخلص اور سچے سپاہی اپنے قائد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے انگریز کے مسلح دستوں کی گولیوں سے چھلنی ہو کر اپنے خون میں نہا گئے۔

علامہ صاحب گرفتار ہوئے تو پتہ چلا کہ جیل ان کی بہت بڑی کمزوری ہے انہوں نے اپنے ناشتے اور کھانے کی جو فہرست جیل حکام کو بھیجی اور جو ہفت روزہ "ریاست" میں شائع ہوئی اس میں وہ کچھ تھا جو شاید وائسرائے ہند کے بریک فاسٹ اور حیدر آباد دکن کی ریاست کے والی کے دسترخوان پر چنے جانے والے کھانوں سے قیمتی تھے۔ حالانکہ خاکساروں کو سخت جان بنانے کے لئے وہ صرف چنے چبا کر یا ستو پھانک کر زندگی گزارنے کی ہدایت کرتے رہے۔ علامہ صاحب جرمنی میں بھی رہ چکے تھے۔ ہٹلر کی نازی تحریک سے بڑے متاثر تھے اور اسی انداز سے تحریک کو چلانے کی کوشش کرتے صرف یہی نہیں بلکہ ہٹلر کی آمریت بھی انہوں نے اپنا لی تھی جس سے دل برداشتہ ہو کہ ہم کافی عرصہ پہلے ہی اس تحریک سے علیحدہ ہو چکے تھے۔

پیا گئے رنگون - جانا ہمارا کلکتہ برما اور رنگون

مڈل کی تعلیم کے وقت ہی میری خوددار طبیعت نے بھائیوں پر بوجھ بننا گوارہ نہ کیا اور میں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ چھ روپے ماہوار پر پارٹ ٹائم ایک پریس میں بھی ملازمت اختیار کر رکھی تھی لیکن پھر گھر کے حالات کی وجہ سے تعلیم میٹرک کے بعد منقطع کرنی پڑی۔ بڑے بھائی کے پاؤں میں گردش تھی میں مڈل ہی میں تھا کہ پہلی بار ان کے ساتھ کلکتہ گیا جو اس وقت لنڈن کے بعد غالباً" دوسرا بڑا شہر تھا۔ شہر میں ٹرام چلتی تھی اور ٹرام پر صبح ایک سرے سے بیٹھو تو شام سے پہلے دوسرے سرے تک پہنچنا محال تھا میں بتا چکا ہوں کہ والد کی وفات کے بعد بڑے بھائی ہی میرے سرپرست تھے سب سے بڑے بھائی جہاں بھی جاتے مجھے ساتھ لے جاتے لیکن اب میری پڑھائی منقطع ہونے کے بعد بڑے بھائی گرمیوں کی چھٹیوں میں جہاں ہوتے مجھے وہاں بلا لیتے۔ بڑے بھائی نے لعل بادشاہ کو لکھا کہ کلکتے کا ٹکٹ لے کر مجھے ریل گاڑی میں سوار کر دیں اور مجھے بتا دیں کہ تیسرے دن دوپہر کو گاڑی کلکتے سٹیشن پر پہنچے گی تو وہ مجھے لینے کے لئے آوڑے سٹیشن پر موجود ہونگے انہوں نے یہ بھی لکھا کہ پشاور سے جو کلکتہ ریل گاڑی چلتی ہے۔ اس میں مجھے سوار کرائے کیونکہ وہ براہ راست پشاور سے کلکتہ جاتی ہے اور یہ کہ میں راستے میں کسی سٹیشن پر نہ اتروں۔ لیکن والدہ اور دوسرے بھائی کو میری چالاکی اور تیزی سے خطرہ تھا۔ کہ کہیں کسی سٹیشن پر اتروں اور گاڑی نہ نکل جائے یا کسی سٹیشن پر اتروں اور گاڑی بھول کر کسی دوسری گاڑی میں نہ بیٹھ جاؤں خصوصاً" والدہ بہت پریشان تھی کہ ان کے لئے تو میں ہنوز بچہ تھا ویسے رشتہ دار بھی مجھے تنہا ہندوستان کے آخری سرے تک پورے تین دن کی مسافت پر بھیجنے کے حق میں

نہ تھے لیکن سوائے اس کے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ آخر روانگی کا دن آن پہنچا بھائی نے ٹکٹ لے کر مجھے گاڑی میں پہنچا دیا اور ایک ادھیڑ عمر کی داڑھی والے شخص سے جو پشاور ہی کا تھا اور لاہور جا رہا تھا مجھے اس کے حوالے کر دیا اور کہا کہ لاہور پہنچ کر کلکتہ جانے والے کسی شریف آدمی کے اسے حوالے کر دیں۔

ماں نے مجھے روتی آنکھوں سے رخصت کیا وہ مجھے بہت چاہتی تھی اور ویسے بھی ماں۔ ماں ہوتی ہے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو میں دور تک امی اور بھائی کو دیکھتا رہا جو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداعی نظروں سے دیکھ رہے تھے جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں اپنی سیٹ پر اس شخص کے پاس جا بیٹھا جسکے سپرد مجھے بھائی کر گئے تھے وہ پشاور ہی کا ایک ڈھلتی عمر کا معقول شخص نظر آتا تھا مجھ سے پوچھنے لگا کتنی جماعت میں پڑھتے ہو پشاور میں کہاں رہتے ہو اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا تو نماز پڑھنے لگا پھر مجھے نصیحت کرنے لگا اور خدا اور رسول کی باتیں شروع کر دیں میں بڑا مرعوب ہوا کہ ایک نیک آدمی ہے۔ پوچھا کس کے پاس جا رہے ہو میں نے کہا بڑے بھائی کے پاس۔ پھر پوچھا پیسے کہاں رکھے ہیں میں نے بتایا کہ قمیض کے نیچے کرتی میں محفوظ ہیں بولا پیسے مجھے دے دو تم سے گر نہ جائیں یا کوئی نکال نہ لے آدمی بھلا لگتا تھا۔ میرے پاس 44 روپے تھے میں نے 40 روپے نکال کر اسے دے دیئے اس نے مجھے کھانا کھلایا۔ کیلے خرید کر دیئے' چائے' پلائی' دوسرے دن رات کو گاڑی ایک سٹیشن پر رکی میں سوتے میں اٹھ کھڑا ہوا دیکھا تو وہ آدمی غائب تھا۔ ایک مسافر جو سامنے کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس سے پوچھا تو وہ بولا وہ تو پچھلے سے پچھلے سٹیشن پر گاڑی سے اتر گیا تھا اس نے میری پریشانی دیکھی تو حالات سے باخبر ہو کر بڑا افسوس کیا۔ مجھ سے پتہ پوچھا تو بھائی چن بادشاہ کا ذکر آتے ہی بولا تم اس کے بیٹے ہو میں نے

پیا گئے رنگون - جانا ہمارا کلکتہ برما اور رنگون

مڈل کی تعلیم کے وقت ہی میری خوددار طبیعت نے بھائیوں پر بوجھ بننا گوارہ نہ کیا اور میں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ چھ روپے ماہوار پر پارٹ ٹائم ایک پریس میں بھی ملازمت اختیار کر رکھی تھی لیکن پھر گھر کے حالات کی وجہ سے تعلیم میٹرک کے بعد منقطع کرنی پڑی۔ بڑے بھائی کے پاؤں میں گردش تھی میں مڈل ہی میں تھا کہ پہلی بار ان کے ساتھ کلکتہ گیا جو اس وقت لنڈن کے بعد غالباً" دوسرا بڑا شہر تھا۔ شہر میں ٹرام چلتی تھی اور ٹرام پر صبح ایک سرے سے بیٹھو تو شام سے پہلے دوسرے سرے تک پہنچنا محال تھا میں بتا چکا ہوں کہ والد کی وفات کے بعد بڑے بھائی ہی میرے سرپرست تھے سب سے بڑے بھائی جہاں بھی جاتے مجھے ساتھ لے جاتے لیکن اب میری پڑھائی منقطع ہونے کے بعد بڑے بھائی گرمیوں کی چھٹیوں میں جہاں ہوتے مجھے وہاں بلا لیتے۔ بڑے بھائی نے لعل بادشاہ کو لکھا کہ کلکتے کا ٹکٹ لے کر مجھے ریل گاڑی میں سوار کر دیں اور مجھے بتا دیں کہ تیسرے دن دوپہر کو گاڑی کلکتے سٹیشن پر پہنچے گی تو وہ مجھے لینے کے لئے آوڑے سٹیشن پر موجود ہونگے انہوں نے یہ بھی لکھا کہ پشاور سے جو کلکتہ ریل گاڑی چلتی ہے۔ اس میں مجھے سوار کرائے کیونکہ وہ براہ راست پشاور سے کلکتہ جاتی ہے اور یہ کہ میں راستے میں کسی سٹیشن پر نہ اتروں۔ لیکن والدہ اور دوسرے بھائی کو میری چالاکی اور تیزی سے خطرہ تھا۔ کہ کہیں کسی سٹیشن پر اتروں اور گاڑی نہ نکل جائے یا کسی سٹیشن پر اتروں اور گاڑی بھول کر کسی دوسری گاڑی میں نہ بیٹھ جاؤں خصوصاً" والدہ بہت پریشان تھی کہ ان کے لئے تو میں ہنوز بچہ تھا ویسے رشتہ دار بھی مجھے تنہا ہندوستان کے آخری سرے تک پورے تین دن کی مسافت پر بھیجنے کے حق میں

نہ تھے لیکن سوائے اس کے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ آخر روانگی کا دن آن پہنچا بھائی نے ٹکٹ لے کر مجھے گاڑی میں پہنچا دیا اور ایک ادھیڑ عمر کی داڑھی والے شخص سے جو پشاور ہی کا تھا اور لاہور جا رہا تھا مجھے اس کے حوالے کر دیا اور کہا کہ لاہور پہنچ کر کلکتہ جانے والے کسی شریف آدمی کے اسے حوالے کر دیں۔

ماں نے مجھے روتی آنکھوں سے رخصت کیا وہ مجھے بہت چاہتی تھی اور ویسے بھی ماں۔ ماں ہوتی ہے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو میں دور تک امی اور بھائی کو دیکھتا رہا جو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداعی نظروں سے دیکھ رہے تھے جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں اپنی سیٹ پر اس شخص کے پاس جا بیٹھا جسکے سپرد مجھے بھائی کر گئے تھے وہ پشاور ہی کا ایک ڈھلتی عمر کا معقول شخص نظر آتا تھا مجھ سے پوچھنے لگا کتنی جماعت میں پڑھتے ہو پشاور میں کہاں رہتے ہو اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا تو نماز پڑھنے لگا پھر مجھے نصیحت کرنے لگا اور خدا اور رسول کی باتیں شروع کر دیں میں بڑا مرعوب ہوا کہ ایک نیک آدمی ہے۔ پوچھا کس کے پاس جا رہے ہو میں نے کہا بڑے بھائی کے پاس۔ پھر پوچھا پیسے کہاں رکھے ہیں میں نے بتایا کہ قمیض کے نیچے کرتی میں محفوظ ہیں بولا پیسے مجھے دے دو تم سے گر نہ جائیں یا کوئی نکال نہ لے آدمی بھلا لگتا تھا۔ میرے پاس 44 روپے تھے میں نے 40 روپے نکال کر اسے دے دیئے اس نے مجھے کھانا کھلایا۔ کیلے خرید کر دیئے' چائے' پلائی' دوسرے دن رات کو گاڑی ایک سٹیشن پر رکی میں سوتے میں اٹھ کھڑا ہوا دیکھا تو وہ آدمی غائب تھا۔ ایک مسافر جو سامنے کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس سے پوچھا تو وہ بولا وہ تو پچھلے سے پچھلے سٹیشن پر گاڑی سے اتر گیا تھا اس نے میری پریشانی دیکھی تو حالات سے باخبر ہو کر بڑا افسوس کیا۔ مجھ سے اتہ پتہ پوچھا تو بھائی چمن بادشاہ کا ذکر آتے ہی بولا تم اس کے بیٹے ہو میں نے

پیا گئے رنگون - جانا ہمارا کلکتہ برما اور رنگون

مڈل کی تعلیم کے وقت ہی میری خوددار طبیعت نے بھائیوں پر بوجھ بنا گوارہ نہ کیا اور میں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ چھ روپے ماہوار پر پارٹ ٹائم ایک پریس میں بھی ملازمت اختیار کر رکھی تھی لیکن پھر گھر کے حالات کی وجہ سے تعلیم میٹرک کے بعد منقطع کرنی پڑی۔ بڑے بھائی کے پاؤں میں گردش تھی میں مڈل ہی میں تھا کہ پہلی بار ان کے ساتھ کلکتہ گیا جو اس وقت لنڈن کے بعد غالباً" دوسرا بڑا شہر تھا۔ شہر میں ٹرام چلتی تھی اور ٹرام پر صبح ایک سرے سے بیٹھو تو شام سے پہلے دوسرے سرے تک پہنچنا محال تھا میں بتا چکا ہوں کہ والد کی وفات کے بعد بڑے بھائی ہی میرے سرپرست تھے سب سے بڑے بھائی جہاں بھی جاتے مجھے ساتھ لے جاتے لیکن اب میری پڑھائی منقطع ہونے کے بعد بڑے بھائی گرمیوں کی چھٹیوں میں جہاں ہوتے مجھے وہاں بلا لیتے۔ بڑے بھائی نے لعل بادشاہ کو لکھا کہ کلکتے کا ٹکٹ لے کر مجھے ریل گاڑی میں سوار کر دیں اور مجھے بتا دیں کہ تیسرے دن دوپہر کو گاڑی کلکتے سٹیشن پر پہنچے گی تو وہ مجھے لینے کے لئے آوڑے سٹیشن پر موجود ہونگے انہوں نے یہ بھی لکھا کہ پشاور سے جو کلکتہ ریل گاڑی چلتی ہے۔ اس میں مجھے سوار کرائے کیونکہ وہ براہ راست پشاور سے کلکتہ جاتی ہے اور یہ کہ میں راستے میں کسی سٹیشن پر نہ اتروں۔ لیکن والدہ اور دوسرے بھائی کو میری چالاکی اور تیزی سے خطرہ تھا۔ کہ کہیں کسی سٹیشن پر اتروں اور گاڑی نہ نکل جائے یا کسی سٹیشن پر اتروں اور گاڑی بھول کر کسی دوسری گاڑی میں نہ بیٹھ جاؤں خصوصا" والدہ بہت پریشان تھی کہ ان کے لئے تو میں ہنوز بچہ تھا ویسے رشتہ دار بھی مجھے تنہا ہندوستان کے آخری سرے تک پورے تین دن کی مسافت پر بھیجنے کے حق میں

نہ تھے لیکن سوائے اس کے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ آخر روانگی کا دن آن پہنچا بھائی نے ٹکٹ لے کر مجھے گاڑی میں پہنچا دیا اور ایک ادھیڑ عمر کی داڑھی والے شخص سے جو پشاور ہی کا تھا اور لاہور جا رہا تھا مجھے اس کے حوالے کر دیا اور کہا کہ لاہور پہنچ کر کلکتہ جانے والے کسی شریف آدمی کے اسے حوالے کر دیں۔

ماں نے مجھے روتی آنکھوں سے رخصت کیا وہ مجھے بہت چاہتی تھی اور ویسے بھی ماں۔ ماں ہوتی ہے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو میں دور تک امی اور بھائی کو دیکھتا رہا جو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداعی نظروں سے دیکھ رہے تھے جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں اپنی سیٹ پر اس شخص کے پاس جا بیٹھا جسکے سپرد مجھے بھائی کر گئے تھے وہ پشاور ہی کا ایک ڈھلتی عمر کا معقول شخص نظر آتا تھا مجھ سے پوچھنے لگا کتنی جماعت میں پڑھتے ہو پشاور میں کہاں رہتے ہو اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا تو نماز پڑھنے لگا پھر مجھے نصیحت کرنے لگا اور خدا اور رسول کی باتیں شروع کر دیں میں بڑا مرعوب ہوا کہ ایک نیک آدمی ہے۔ پوچھا کس کے پاس جا رہے ہو میں نے کہا بڑے بھائی کے پاس۔ پھر پوچھا پیسے کہاں رکھے ہیں میں نے بتایا کہ قمیض کے نیچے کرتی میں محفوظ ہیں بولا پیسے مجھے دے دو تم سے گر نہ جائیں یا کوئی نکال نہ لے آدمی بھلا لگتا تھا۔ میرے پاس 44 روپے تھے میں نے 40 روپے نکال کر اسے دے دیئے اس نے مجھے کھانا کھلایا۔ کیلے خرید کر دیئے، چائے، پلائی، دوسرے دن رات کو گاڑی ایک سٹیشن پر رکی میں سوتے میں اٹھ کھڑا ہوا دیکھا تو وہ آدمی غائب تھا۔ ایک مسافر جو سامنے کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس سے پوچھا تو وہ بولا وہ تو پچھلے سے پچھلے سٹیشن پر گاڑی سے اتر گیا تھا اس نے میری پریشانی دیکھی تو حالات سے باخبر ہو کر بڑا افسوس کیا۔ مجھ سے اتہ پتہ پوچھا تو بھائی چمن بادشاہ کا ذکر آتے ہی بولا تم اس کے بیٹے ہو میں نے

کہا بھائی ہوں۔ اس نے مجھے تسلی دی اور کھانے پینے کا سارا خرچ اس نے برداشت کیا اور کلکتہ پہنچ کر بھائی تک پہنچا دیا یہ واقعہ میں ابھی تک نہیں بھول سکا کہ وہ کتنا نیک اور شریف آدمی لگتا تھا۔ اور کس چالاکی سے میری رقم اس نے ہتھیائی۔

کلکتہ میں یہ میرا پہلا پھیرا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ پھر گیا ہوں بڑا گھما گھمی کا شہر تھا اس وقت اس کی آبادی 20 لاکھ سے زیادہ تھی ہر شام کو بھائی مجھے ٹرام میں دھرم تلا لے جاتا جہاں نیو مارکیٹ دیکھنے کی جگہ تھی۔ کم از کم دو جریب ایریا میں یہ مارکیٹ بنی ہوئی تھی جس میں دنیا کی ہر چیز مل جاتی تھی اور رات کو تو وہاں رونق ہی رونق ہوتی تھی کہ جیسے کلکتے کی ساری مخلوق وہاں ٹوٹ پڑی ہو ان دنوں سارے ہندوستان میں اس مارکیٹ کے چرچے تھے اور سارے ملک میں اپنی قسم کی پہلی مارکیٹ تھی تقسیم ملک کے بعد مشرقی پاکستان میں بھی اس مارکیٹ کی ڈیٹو کاپی دیکھکر مجھے بڑی حیرت ہوئی یہاں تک کہ اس کا نام بھی انہوں نے نیو مارکیٹ ہی رکھا تھا۔ یہ تھا پہلی دفعہ کلکتے کا سفر انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ بھائی کو اچانک رنگون جانا پڑا وہ مجھے اس خیال سے کہ اکیلا ہوں مجھے اپنے دوست لالہ مجید کے ہاں چھوڑ گئے میں ٹھہرا بڑا شرارتی پہلے ہی دن صحن میں بال کھیل رہا تھا کہ ان کے کمرے کے ساتھ لگا ہوا بڑا قیمتی گھڑیال چکنا چور ہو گیا۔ اسی دن شام کو میری عمر کا ان کا بیٹا سیڑھیوں سے گر گیا اس کی ماں نے کہا کہ میں نے اصغر کو دھکا دے کر گرایا ہے۔ دوسرا دن خیریت سے گزرا گھر والے شکر کر رہے تھے کہ دن خیر سے گزر گیا کہ اچانک سیب کاٹتے ہوئے میں نے اپنی انگلی کاٹ ڈالی جو کچھ اس بری طرح کٹی کہ برائے نام ہی ہاتھ کے ساتھ لٹک رہی تھی بیگم نے فوراً ملازم کو بلا کر مجھے ہسپتال بھجوایا اور اپنے شوہر کو بلا کر ساری داستان سنائی۔ بھائی کے آنے پر انہوں نے شکر ادا کیا

اس بات پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک شخص جو اٹلی میں رہتا تھا اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے بھائی کے پاس مانچسٹر بھیجتے ہوئے فون پر اسے بتایا کہ ان دنوں یہاں مسلسل بڑے خطرناک زلزلے آ رہے ہیں۔ تم جانتے ہو میرا ایک ہی لڑکا ہے اسلئے اسکی وجہ سے بہت پریشان رہتا ہوں اسلئے کچھ عرصے کے لئے اسے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ تین ماہ کے بعد بھائی نے اسے خط لکھا کہ بھتیجے کو واپس بھیج رہا ہوں تم بے شک زلزلوں کو یہاں بھیج دو۔

1934ء میں تلاش روزگار میں بھٹکتا ہوا میں پھر دہلی کلکتہ اور وہاں سے برما جا پہنچا اب میں جوان ہو چکا تھا۔ اور کلکتہ جاتا رہتا تھا دہلی بھی کئی دفعہ آیا تھا۔ اب میرے لالہ مجید سے بڑے گہرے تعلقات بن گئے تھے۔ جب بھی جاتا ان کے پاس ٹھہرتا۔ میں برما جا کر اس سارے علاقے کو دیکھنا چاہتا تھا میں نے لالے مجید سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ اس نے کہا کہ میں تمہیں برما جانے کا مشورہ نہیں دونگا کیونکہ تم وہاں کی زبان بھی نہیں جانتے اور پھر وہاں عیاشی بہت ہے۔ جو ایکدفعہ جائے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ ان دنوں اچانک فضلو ٹمیا برج والا۔ لالہ مجید کے پاس آیا کہ اسے برما کیلئے "اوددں" کا سپلائی کنٹریکٹ کیا ہے۔ اور اس کے لئے کوئی دیانتدار شخص چاہیئے جو مانڈلے میں بیٹھ کر اس گاڑی کو چلا سکے لالہ مجید نے میرا نام دیا اور مجھے کہا کہ بہت اچھی جاب ہے تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا صرف نگرانی کرنی ہے میں نے کہا منظور ہے۔ اور اگلے روز ہی فضلو نے آکر مجھے ساری بات سمجھائی اور ایک ہزار روپے دیئے جہاز کے کرائے' وہاں کرائے کا مکان اور دفتر اور فرنیچر کے لئے مزید رقم مہیا کی میں نے زندگی میں پہلی دفعہ ایک ہزار روپے اپنی جیب میں ڈالے تو میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے میں اپنے آپ کو اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ ایک روز میں رنگون کے لئے پانی کے جہاز میں سوار ہوا۔ میں نے خلیج بنگال کو عبور کرنا تھا جو بڑی سخت

لور نا ہنجار خلیج ہے چوتھے دن عموماً" جہاز رنگون پہنچتا تھا۔ راستے میں تیسرے
دن اس زور کا طوفان آیا کہ جہاز پانی سے بھر گیا جہاز ڈول رہا تھا جہاز میں سوار
مرد خواتین، بوڑھے، جوان، بچے بدحواس ہو رہے تھے چیخ رہے تھے رو رہے
تھے۔ چند ایک ایسے افراد تھے۔ جو خاموشی سے دعا کر رہے تھے یہاں تک کہ
بچنے کی کوئی امید نہ رہی سواریوں کو کہہ دیا گیا کہ گھبراؤ نہیں ہم ساحل سے
زیادہ دور نہیں باقی چوبیس گھنٹے کا راستہ ہو گا۔ خطرہ بڑھ گیا تو پہلے ایک گھنٹی ہو
گی پھر دوسری اور پھر آخری تیسری۔ لیکن اس کے بعد آپ نے نظم و ضبط
سے کام لینا ہو گا اور اگر گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا تو یاد رکھو سب ڈوب مرو گے۔
کوئی نہیں بچے گا اور ڈسپلن سے کام لیا تو کوئی جانی نقصان نہیں ہو گا۔

عورتیں بچے بوڑھے رورو کر دعائیں مانگ رہے تھے لب تو سچی بات ہے
مجھے بھی یقین آگیا کہ آخری وقت آ پہنچا ہے لیکن میں نے موت کے ڈر کو
کبھی روگ نہیں بنایا کیونکہ یہ یقین ہے کہ ایک دن تو ضرور مرنا ہے پھر کیا دو
دن آگے کیا دو دن پیچھے کیا ایسی صورتحال میں تو ضروری ہے کہ انسان ہر وقت
ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہے جہاز کا تختہ پانی سے بھر گیا
تھا تختے کے تیسرے درجے کے مسافروں کا سامان نہ صرف بھیگ گیا بلکہ پانی میں
تیرنے لگا۔ لحظہ بہ لحظہ چیخوں کا طوفان بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ طوفان کے شور کچھ
مسافروں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے کچھ
حوصلہ مند جوانوں کو ساتھ لیا لور اوپر سے نیچے تک مسافروں کے پاس جا کر
انہیں تسلیاں دینے کی مہم شروع کر دی اس کا کسی حد تک خوشگوار اثر پڑا لیکن
جتنا طوفان بڑھتا جاتا تھا مسافروں کو آنے والی قے میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لب
کچھ عجیب ہولناک منظر تھا ایک مسافر قے کر رہا ہے دو اسے تھام رہے ہیں:

کہ اچانک وہ بھی اسکے اوپر قے کرنے لگتے۔ یکایک محسوس ہوا کہ طوفان کچھ تھمتا جا رہا ہے اسی اثنا میں جہاز سے اعلان ہوا۔ مسافروں کو خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ طوفان کا زور ختم ہو گیا ہے اور وہ تھم رہا ہے۔ نصف گھنٹے میں حالات بالکل نارمل ہو جائیں گے۔ اور آخر شام کے قریب طوفان تھم گیا اور لوگوں نے سجدہ شکر ادا کیا اور پھر اگلے روز ہم عصر کے وقت ساحل کو دور سے دیکھ کر اسقدر خوش ہوئے جیسے ہمیں نئی زندگی مل گئی ہو۔ ایک گھنٹے بعد جہاز ساحل پر پہنچ گیا اور ہم لوگ اپنا بھیگا ہوا سامان اتارنے لگے۔ میں نے ایک عرصہ برما میں یہ نوکری کی لیکن طبیعت کو ایک جگہ قرار کہاں جب کچھ رقم جمع ہوئی تو وہاں بھی نوکری چھوڑ دی۔ ہاں ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آیا میں ان دنوں مانڈلے میں تھا یہ برما کا ایک شہر ہے رنگون جو برما کا دارلخلافہ ہے اس سے تین سو میل دور ہو گا جس شخص کے پاس میں ٹھہرا ہوا تھا وہ میرے شہر پشاور ہی کا رہنے والا تھا اس کا نام غلام علی تھا ایک دن اس نے مجھے کہا کہ آغہ جی (پشاور کے لوگ سید کو آغہ جی کہتے ہیں) میمیو دیکھنا چاہتے ہو میں تو پیدائشی سیر بین ہوں میں نے کہا بالکل دیکھنا چاہتا ہوں وہ بولا پھر تیار ہو جائیں میرا دوست جا رہا ہے اس کے ساتھ چلے جائیں دو تین دن خوب سیر کر لینا پھر آنے لگیں تو وہ آپ کو اپنے ساتھ لے آئے گا۔

میں نے کیا تیار ہونا تھا۔ بیگ میں ایک جوڑا رات کو پہننے کے لئے رکھا اور غلام علی سے کہا لو بھئی میں تیار ہوں وہ بولا گرم کپڑے اپنے ساتھ رکھ لیں وہ پہاڑی مقام ہے شملے کی طرح وہاں بڑی سردی ہوتی ہے۔ اتنے میں غلام علی کا دوست نعیم بھی آگیا اس نے نعیم کو بتایا کہ آغہ جی کو ساتھ لے جاؤ اور سیر کرا کے ساتھ ہی لے آنا نعیم نے مجھے فرنٹ سیٹ پر بٹھایا اور ہم میمیو روانہ ہو گئے۔

یہاں یہ بتاتا چلوں کہ میمیو مانڈلے سے چالیس میل دور ہے اور وہاں کا صحت افزا مقام ہے بالکل ایسے جیسے راولپنڈی اور مری۔ نعیم بھی پشاور کا رہنے والا تھا راستے میں خوب گپ چلتی رہی تعارف کرایا تو لعل بادشاہ (میرے بھائی) کا دوست نکلا اس نے بتایا کہ اس کا بیٹا گھر سے بھاگ کر برما آیا ہے اس کی تلاش میں آیا ہوں کسی نے بتایا کہ اب تک مانڈلے میں تھا میرے آنے کی شاید اس نے سن گن پائی اور نکل گیا اب نے کہا میمیو میں بھی دیکھ لو وہاں نہ چلا گیا ہو۔ مانڈلے سے میمیو پہنچے تو وہ بیٹے کی تلاش میں چلا گیا۔ میں بھی گھومتا پھرتا رہا نعیم واپس آیا تو بڑا خوش تھا کیونکہ اسے بیٹا مل گیا تھا وہ بولا چلو واپس چلیں میں نے کہا تم جاؤ میں ایک روز رہونگا۔ میمیو میں نعیم افضل نامی شخص کے نام (جسکی وہاں رہائش تھی) رقعہ لے کر آیا تھا۔ اب نعیم کو جانے کی جلدی تھی افضل موجود نہ تھا اس نے مجھے بتایا کہ افضل صاحب سے کہہ دینا کہ مجھے بیٹا مل گیا ہے اس لئے وہ واپس چلا گیا ہے۔ اور تم ایک دن اسی کے پاس رہ جانا۔

افضل آیا تو میں نے اسے بتا دیا شام کو اس نے مجھے کھانا کھلایا اور بستر ایک کمرے میں بنا کر کہا آپ وہاں سو جائیے مجھے کسی کام سے جانا ہے دیر سے آؤنگا۔ میرا الگ کمرہ ہے آکر سو جاؤنگا۔

میں ایک کتاب ساتھ لے گیا تھا رات پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ آدھی رات کو جب سردی کی وجہ سے میری آنکھ کھلی تو اٹھ کر سوئیٹر پہنا پھر کوٹ پہنا پتلون شلوار پر چڑھائی لیکن سردی اس قدر بے پناہ تھی کہ دانت بج رہے تھے میزبان کے کمرے کی طرف گیا کہ اسے اٹھا کر کہوں کہ کوئی کمبل یا لحاف دے دو (جو وہ رکھنا بھول گیا تھا)۔ وہ دو باہر کے دروازے لاک کر کے تیسرے دروازے کے اندر کمرے میں سویا ہوا تھا۔ بڑا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کون سنتا۔

مجبوراً" واپس آکر لیٹ گیا لیکن حالت یہ کہ دانت بج رہے تھے اور ٹانگیں لرز رہی تھیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں اب تو یہ عالم تھا کہ لگتا تھا سردی سے جم کر مرنا قسمت میں لکھا ہے۔ آخر ایک بات سوجھی جیسے الہام ہوا ہو وہ یہ کہ میں بچپن سے ورزش کا عادی ہوں میں نے ڈنڈ نکالنے شروع کر دیئے خوب زور شور سے آخر ہولے ہولے جسم گرم ہونے لگا تب بہت تھک جاتا تو تھوڑی دیر آرام کرکے پھر شروع ہو جاتا۔ سامنے کلاک لگا تھا۔ اس رات کیا بتاؤں وقت جیسے جنوں کی طرح رینگنے لگا تھا۔ آخر میں نے کلاک کی طرف پیٹھ کردی اور ورزش جاری رکھی یہاں تک کہ صبح کے ساڑھے پانچ بجے وہ دیندار انسان نماز کے لئے اٹھا اور مسجد جانے لگا اب جو وہ میرے کمرے سے گزرنے لگا تو اچھل کود کی آواز سنی اور اس نے میرے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر اندر جھانکا اندھیرے میں کسی کو اچھل کود کرتے دیکھ کر اس کی چیخیں نکل گئیں اور اس سے پہلے کہ میں بتی جلاتا اور اسے سمجھاتا وہ گھبرا کر دھڑام سے فرش پر گر پڑا اب میں کبھی اس کا دل مساج کر رہا ہوں کبھی اس کے منہ میں پانی ڈال رہا ہوں آخر کافی دیر کے بعد اس شریف آدمی نے آنکھیں کھولیں تو میری جان میں جان آئی جب ذرا اس کے حواس درست ہوئے تو مجھے ہنسی کا ایسا دورا پڑا جو رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ جب خوب قہقہے لگا چکا تو وہ اپنی روئیداد سنانے لگا میں نے اسے چپ کرایا اور کہا کہ پہلے میری سن لو تو اپنی بھول جاؤ گے۔ میں نے تو قیامت کی رات گزاری ہے جب اسے احساس ہوا کہ وہ رات میرے کمرے میں لحاف رکھنا بھول گیا تھا تو پہلے اسے شرمندگی ہوئی اور پھر دونوں نے مل کر قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔

برما میں ان دنوں میں نے فروٹ کی دکان کر لی تھی جو اچھا خاصا منفعت بخش کام تھا۔ دکان کے ساتھ ہی مسجد تھی ان دنوں میں بڑی پابندی سے نماز

پڑھتا تھا پیش امام مولانا عبدالروف پٹھان تھے ایک عرصے سے وہاں مقیم تھے بری عورت سے شادی کی تھی۔ جس سے تین لڑکیاں تھیں اور تینوں نوجوان بھی تھیں اور خوبصورت بھی تینوں میرے پاس سودا لینے آتی تھیں اور خاصی آزادی سے مذاق کرتی رہتی تھیں ادھر ان کا والد مولانا صاحب بھی اپنے خطے کا جان کر اکثر دکان پر آتے اور گھنٹوں اپنے شہر کی باتیں کرتے رہتے۔

ایک دن مجھے مولانا نے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا کہ اپنی بچیوں میں سے کم از کم ایک بچی کا اپنے خطے کے کسی شخص سے شادی کرنے کا اسے بڑا ارمان ہے۔ میں نے کہا بات تو ٹھیک ہے لیکن آپ اپنے وطن کیوں نہیں چلے جاتے وہاں بچیوں کی شادی بھی ہو جائیگی اور اپنے وطن میں آپ خوش بھی رہیں گے۔ انہوں نے نہایت گہری سوچ کے بعد بتایا کہ ان کی وہاں اپنے قبیلے میں بہت دشمنیاں ہیں اور کئی قتل مقاتلے ہوچکے ہیں میں وہاں گیا تو نہ صرف مجھے بلکہ میری بچیوں کو بھی میرے تربور (چچازاد بھائی) زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور آخر میں انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کی ایک لڑکی سے میں شادی کرلوں اور شادی کا میرا خرچہ بھی وہ خود برداشت کریں گے۔ میں کچھ دیر خاموش سوچوں میں ڈوب گیا تو انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا میں نے شرمندگی سے سر جھکا کر ان سے کہا "ہمارے ہاں تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی شادیاں والدین کرتے ہیں اس لئے میں تو وہیں جا کر شادی کرونگا" مولوی صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے اور پھر بولے تمہیں جو لڑکی پسند ہو اس کا فوٹو گھر بھیج دو اور وہ پسند کرلیں تو شادی کر لو اب میں کیا جواب دیتا نہایت سوچ کر کہا "میری منگنی اپنی کزن سے ہو چکی ہے" وہ یہ سن کر ملول ہو گئے لیکن لڑکیوں کا آنا جانا بھی رہا اور ہنسی مذاق بھی۔ سب سے زیادہ خوبصورت درمیانی لڑکی زہرا تھی۔ اور مجھ سے فری بھی بہت تھی لیکن ایسی

بوری تھی کہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ تاہم مجھے اس بات سے اتنی شرمندگی
ی کہ مولوی صاحب کے ساتھ آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا لیکن اس بھلے مانس
نے اس کا "قصداً" برا نہ منایا اور میں جب تک وہاں رہا ان سے بڑے اچھے
علقات رہے۔

اسی طرح کلکتے میں تھا تو میرے فلیٹ کے ساتھ والے فلیٹ میں ایک
ی رہتی تھی پتہ چلا کہ اس کا نام چاندنی تھا۔ صبح سویرے ساز پر کوئی بھجن
اتی تھی ایک تو اس کی آواز میں جادو تھا دوسرا وہ بھجن صبح کے سناٹے میں
یک عجیب سا سماں پیدا کر دیتا ایسی فضا جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا چونکہ بالکل
اتھ ہی فلیٹ تھا اور میں کھڑکی میں بھجن ختم ہونے تک سنتا رہتا تھا۔ لڑکی بھی
ان گئی تھی کہ اسے موسیقی سے دلچسپی ہے اس لئے مجھے دیکھتے ہی اس کے
وں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ چنانچہ ایک دن اس نے مجھے کھڑکی سے آواز دے
ر گھر آنے کی دعوت دی اگلے روز میں اس کی دعوت پر اس کے گھر گیا اس
نے میری بڑی پذیرائی کی اور گانے بھی خوب سنائے اور پھر تو وہ نوجوان سانولی
شیزہ میری ایسی دوست بن گئی جیسے صدیوں کی دوستی ہو اور جب میں واپس
ھر آنے لگا تو اسنے روتے ہوئے مجھے رخصت کیا ایک عرصے تک اس سے خط
کتابت بھی رہی پھر نجانے کیوں اچانک اس کے خطوط آنا بند ہو گئے غالباً"
س کی شادی ہو چکی تھی۔

اس عرصے میں مجھے شاعری کا چسکا پڑ چکا تھا۔ کلکتہ میں مجھے ایک شاعر
ے طور پر منظر عام پر لانے والا پشاور ہی کا ایک لڑکا ایک پختہ کار شاعر اختر تھا۔
س نے ابتدا میں مجھے وہاں روشناس کرایا اب جو مشاعروں میں میں جانے لگا تو
ر مشاعرے میں مجھے بلایا جانے لگا۔ اسی اثناء میں ایک واقعہ یہ ہوا کہ کلکتہ کے
دو شعراء کا مہا گرو لالہ غلام محمد غوثی میرے بڑے بھائی کا بڑا گہرا دوست نکلا

اس طرح مجھے ایک تو یہ فائدہ ہوا کہ غوثی صاحب جیسے پختہ کار شاعر سے فیضان حاصل کرنے کا موقع ملا دوسرا یہ کہ کلکتہ سے رنگون تک کے شہروں میں میری مانگ بڑھ گئی۔ تیسرا یہ کہ مجھ میں خوداعتمادی پیدا ہوئی جو ہر فنکار کے لئے نہایت لازمی چیز ہے۔

آیئے لالہ غلام محمد غوثی سے آپ کا مختصر تعارف کراتے چلیں۔ لالہ غوثی چھ فٹ قدوقامت کے نہایت خوبصورت، خوش پوش اور مہذب انسان، نہایت خوش گو استاد شاعر، اچھے خاصے پڑھے لکھے، ملک کی سب سے بڑی جماعت کانگریس کے معزز عہدیدار اور نہایت سرگرم رہنما، اور مشہور فلمی آرٹسٹ دلیپ کمار کے ماموں تھے۔ مدتوں اپنا ایک ہفت روزہ "قومی محاذ" شائع کرتے رہے۔ جسے قومی حلقوں میں بڑی اہمیت حاصل تھی نہایت وضع دار انسان تھے کانگریس کی تحریک میں قید و بند کے مصائب برداشت کرتے رہے آخر وقت میں علیل ہوئے تو دلیپ کمار انہیں اپنے ہاں بمبئی لے گئے اور انہوں نے وہیں وفات پائی۔

30ء میں والدہ کے بے حد اصرار اور بیماری کا سن کر میں اپنے شہر پشاور لوٹا اس وقت میں بحیثیت شاعر بالکل اجنبی تھا میری شاعری کا آغاز چونکہ کلکتہ میں ہوا تھا اس لئے پشاور میں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا یہاں آتے ہی اتفاقاً" میری ملاقات لالہ صمدانی یعنی لالہ مضمر تاتاری سے ہوئی۔ جو مقامی ہندکو زبان کا شاعر تھا اور اس نے ابھی اردو میں شعر کہنے شروع نہیں کئے تھے اسی دوران ایک دن لالہ مضمر تاتاری بزم سخن پشاور کے ایک مشاعرے میں لے گیا وہاں بزم سخن کا سیکرٹری رضا ہمدانی مشاعرے میں ترتیب سے شعراء کو مشاعرے میں پڑھنے کے لئے بلا رہا تھا۔ مضمر نے اسے جا کر میرے بارے میں بتایا انہوں نے فہرست میں مجھے آخر میں چند تعارفی کلمات کے ساتھ بلایا۔ یہ رضا بھائی سے

میری پہلی ملاقات تھی وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا اور جب میں نے غزل پڑھی تو خلاف توقع خاصی پذیرائی ہوئی کیونکہ اس وقت تک پسماندہ علاقہ ہونے کے باعث یہاں روایتی گل و بلبل اور قفس و آشیاں کے مضامین تک غزل محدود تھی اور میری غزل نسبتاً" ترقی یافتہ ماحول کی توانا غزل تھی۔ مشاعرے کے بعد ہم گھروں کو چلے گئے۔

میں ان دنوں جیسا کہ بیان کر چکا ہوں کلکتہ اور رنگون میں آوارہ گردی کر کے پشاور لوٹا تھا اور بھائیوں نے اس خدشے سے کہ میں پھر واپس نہ چلا جاؤں مجھے کلاہ لنگی کی دکان پر بٹھا دیا۔ (جو ہمارا اپنا کاروبار تھا) تاکہ میرا دل لگا رہے یہ دکان کٹنٹرہ ابریشم گراں کی چھوٹی سی مسجد کے نیچے مین بازار میں تھی۔ اگلے روز کیا دیکھتا ہوں کہ رضا ہمدانی میری دکان تلاش کرتا ہوا آن پہنچا اور ایسا آیا کہ پھر یہیں کا ہو رہا۔ ان دنوں یہاں کی ادبی صورتحال یہ تھی کہ بزم سخن جسکی بنیاد ہندکو اردو اور فارسی، تین زبانوں کے شاعر سائیں احمد علی نے 1902 میں رکھی تھی اور جسے اس خطے میں اردو کی پہلی انجمن ہونے کا اعزاز حاصل ہے اس کا سیکرٹری رضا ہمدانی تھا اس کا حریف ادبی ادارہ جس کا نام دائرہ ادبیہ تھا جو نئی ادبی نسل کا نمائندہ تھا میں اس کا سیکرٹری تھا اور ان دونوں اداروں کے آپس میں سخت چپقلش چل رہی تھی اور ادھر ان دونوں ادبی اداروں کی روح رواں یعنی ہمارے تعلقات بھائیوں سے بھی زیادہ تھے اور روزانہ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، لکھنا پڑھنا، سب مشترک تھا۔ اب ہم دونوں نے یک جان و دو قالب ہو کر جو لکھنا شروع کیا تو آٹھ مشترکہ کتابیں شائع کر ڈالیں۔ میری زندگی دوسرے انسانوں سے کچھ مختلف تو نہیں لیکن اس میں کچھ ایسے رنگ ہیں جو اپنی پہچان رکھتے ہیں مثلاً" یہ کہ میں پیدائشی طور پر محبت کا پیاسا تھا میں نے والدین، بہن، بھائیوں، دوستوں اور بزرگوں کو ٹوٹ کر چاہا ہے۔ شاید یہی

وجہ ہے کہ جہاں فی زمانہ لوگ ایک سچے اور مخلص دوست کے لئے ترستے ہیں وہاں خوش قسمتی سے مجھے کئی محبوب دوست میسر آئے جن پر مجھے فخر ہے۔ اور جو دنیا کے ہر ملک کے ہر شہر میں موجود ہیں۔

لیکن یہ بات عجیب ہے کہ میں جو اچھے دوستوں کی تلاش میں رہتا تھا اچانک ایک ایسے نوجوان سے ملا جو ملتے ہی گلے کا ہار ہو گیا یہ 1935ء کا واقعہ ہے یہاں یہ بتاتا چلوں کہ یہ سال ادبی دنیا کے لئے عالمی طور پر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی سال جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر نے نازی ازم کو ساری دنیا پر مسلط کرنے کے لئے اپنی اندھی قوت کے جوش میں مشرق و مغرب کو فتح کرنے کے ارادے سے پہلے یورپ کے چھوٹے ممالک پر قبضہ کیا پھر روس اور برطانیہ اور فرانس کے درپے ہوا لیکن روس نے اتحادیوں کی مدد سے دنیا کو اس ناگہانی قہر سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دی اسی سلسلہ میں میکسم گورکی نے فرانس میں اس سال تمام دنیا کے بڑے اہل قلم مصنفین کی کانفرنس طلب کی جو عالمی ادبی تحریک کا ایک مثالی واقعہ ہے۔

اس کانفرنس میں برصغیر کی نمائندگی کا فخر میرے کامریڈ دوست سجاد ظہیر کو حاصل ہے جو ایک فخریہ بات تھی۔ اسی سال سجاد ظہیر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی لندن میں تشکیل بھی کی جو ادب کی ایسی انقلابی تحریک تھی جس نے اردو اور برصغیر کی تمام دوسری زبانوں کے ادب کو ایک انقلابی موڑ سے آشنا کر دیا۔

رضا ہمدانی

اسی سال صوبہ سرحد میں پشاور کی قدیم ادبی انجمن بزم سخن کے کچھ نوجوان اراکین پشاور میں ایک روشن خیال ادبی ادارے دائرہ ادبیہ کا قیام عمل میں لائے - اس ادبی ادارے نے اس پسماندہ صوبے میں شعر و ادب کی پرانی روایات سے بغاوت کر کے کچھ نئے چراغ جلائے۔ نئی راہیں اجاگر کیں اس طرح یہاں بھی کچھ نئی روشنی کے دائرے سے ادب و فن کی آبیاری ہونے لگی۔

اور اسی سال میری زندگی میں رضا کی صورت میں نیانوجوان دوست داخل ہوا جس کے ساتھ ملنے کی بات پہلے کر چکا ہوں۔ یہ دوست جس نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی جس نے میری آوارگی اور انتہا پسندی کو حتی الامکان لگام دینے کی کوشش کی اور کسی حد تک منظم' باضابطہ اور بامعنی بنانے میں مدد دی جو میری زندگی میں ایک آفتاب بن کر طلوع ہوا۔ ہمارا ملاپ پشتو ادب کے لئے بھی اور اردو ادب کے لئے بھی نیک فال ثابت ہوا۔ ہم نے باہم مل کر تصنیف و تالیف کا کام کرنے کی ایک نئی طرح ڈالی ہم نے پشتو کے الوالعزم شعراء بابائے پشتو خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے منظوم تراجم اردو زبان میں کئے جو کتابی صورت میں چھپ کر بہت مقبول ہوئے اور پشتو کے کلاسیکل شعراء کے منتخب کلام کے منظوم تراجم بمعہ سوانح شائع کئے۔ پشتو نثر پر اور اردو پشتو صحافت پر بھی بہت کچھ لکھا۔ ہماری اس مشترکہ قلمکاری کا ادبی حلقوں میں بڑا چرچا ہوا اور اہل قلم دوستوں کو حیرت بھی ہوئی ہم سے پہلے محمد عمر اور نورالٰہی دو دوست گزرے ہیں جنہوں نے ڈرامہ پر مل کر کچھ کام کیا اور وہ کام کتابی صورت میں ان دونوں دوستوں کے نام سے چھپا۔ لیکن کتاب کے دو

حصوں میں ان دونوں دوستوں کے کام کی الگ الگ نشان دہی کی گئی ہے۔

ہماری بات الگ بھی ہے منفرد بھی۔ ہم نے بہت سی کتابیں مل کر لکھیں جو پہلے۔

فارغ بخاری - رضا ہمدانی

پھر فارغ - رضا

اور آخر میں فارغرضا

کے نام سے شائع ہوئیں اور اسکی اتنی شہرت ہوئی کہ دوستوں میں ہم دونوں فارغرضا کے نام سے پکارے جانے لگے۔

بیرونی دنیا کی زبانوں کے ادب کا ہمیں پتہ نہیں کہ وہاں ایسی کوئی مثال موجود ہے یا نہیں لیکن کم از کم ہماری اردو زبان کے ادب میں تو یقیناً" یہ اپنی قسم کی واحد مثال ہے جسکا پورے ملک' بلکہ پورے برصغیر میں ایک عرصے تک خوب چرچا رہا۔

ہمیں بے شمار خطوط اسی سلسلے میں ادیبوں دانشوروں اور قارئین کے موصول ہوتے رہے جن میں یہی ایک سوال دہرایا جاتا کہ آپ کا طریقہ واردات کیا ہے۔ ہم انہیں مناسب جواب دیتے لیکن انکی تسلی نہ ہوتی اور عموماً" اس شے کا اظہار کیا جاتا کہ ہم میں سے کوئی ایک ہی کتابیں لکھتا ہے اور دوستی کے جذبے کے تحت دونوں کے نام مصنف کے طور پر دیئے جاتے ہیں۔

لیکن ان کے لئے مشکل یہ تھی کہ ہم ادھر انفرادی طور پر بھی دونوں کئی کتابوں کے مصنف تھے اس لئے یہ الزام ہم میں سے کسی ایک پر بھی عائد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ہم مروتاً" ایک دوسرے کے نام شائع کرتے ہیں۔ لاہور میں ہماری اسی قسم کی ایک کتاب کی تقریب تھی جس کی صدارت احمد ندیم قاسمی صاحب کر رہے تھے۔ جب کتاب کے متعلق دوست مقالے پڑھ چکے تو

قاسمی صاحب نے لوگوں کے اصرار پر ہم دونوں سے اس کی وضاحت چاہی کہ
آپ کی یہ مشترکہ کاوش وجود میں کیسے آئی۔ رضا ہمدانی نے بتایا کہ خوشحال خان
خٹک اور رحمان بابا کے منظوم ترجمے ہم نے یوں کیے کہ ان کا آدھا آدھا
دیوان بانٹ لیا اور ترجمے کر لینے کے بعد ایک دوسرے کے کام پر نظر ثانی کر
لی۔ رہا دیباچہ سو وہ "عموماً" میں لکھتا۔

پھر مجھ سے اس کے متعلق کہنے کو کہا گیا میں نے کہا آپ کو رضا بھائی
کے بیان حلفی پر یقین کر لینا چاہیئے اور اگر اس کے کہنے کا یقین نہیں آتا تو اس
کا کیا بھروسہ ہے کہ آپ میرے بیان کو تسلیم کر لیں گے۔ میں نے انہیں بتایا
کہ اس طرح مل کر لکھنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ جس تحریر پر اعتراض ہو اسے
ہم دوسرے کے کھاتے میں ڈال کر خود بری الزمہ ہو جاتے ہیں۔ بہرحال ایسے
تماشے اکثر ہوتے رہتے کچھ لوگ تو ہمیں ایک ہی شخص سمجھتے رہے۔ کچھ
حضرات تو دور دراز مقامات سے ہمیں دیکھنے اور اس بات کی تصدیق کرنے آئے
کہ ہم واقعی دو افراد ہیں یا صرف ایک شخص نے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے۔

ویسے پشتو شاعری کے اردو منظوم ترجمے کا تو یہ طریقہ کار تھا کہ پشتو
نظموں، غزلوں کا اردو ترجمہ رضا نے کر دیا اور اسے اردو نظم کا جامہ میں نے
پہنا دیا اور بسا اوقات یوں بھی ہوا کہ نصف کر کے الگ الگ منظوم تراجم کیے
اور پھر ایک دوسرے کے تراجم پر نظر ثانی کر لی گئی اور کبھی کبھی یہ بھی ہوا کہ
باہم مل کر بیٹھے، ترجمہ کر رہے ہیں، ایک ایک شعر کا اور جہاں کہیں کسی کو
مشکل پڑی دوسرے نے ہاتھ بٹا دیا۔

اور ہاں یقین کیجئے کہ کبھی کسی ایک شعر کے منظوم ترجمے پر ایسا بریک لگا کہ
ایک ایک ہفتہ معاملہ الجھا رہا مطلب یہ کہ ایک دو روز میں کامیابی نہ ہوئی تو
ہفتہ دو ہفتے کی چھٹی کر لی تاکہ تازہ دم ہو کر کوشش کی جائے۔ دراصل کسی

زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بجائے خود ایک فن ہے۔ اور نہایت مشکل کام ہے۔ اگر اسے خودستائی نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ کچھ لوگ واقعی یہ ہنر ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔

ہمارے تراجم بہت پسند کئے گئے شاید اس لئے کہ ان میں تکلف یا آورد بالکل نہیں تھا ہم تو جب تک طبیعت حاضر رہتی کام کرتے اور ذرا آورد کا احساس ہوا تو چھٹی کر لی۔ پھر یہ کہ عموماً" لوگ لفظی ترجمہ کرتے ہیں اس طرح ترجمہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مفہوم کا ترجمہ کیاجائے تاکہ معنویت برقرار رہے ہم نے ہمیشہ ترجمے میں مفہوم کا خیال رکھا ہے۔ کہ وہ قارئین تک صحیح طور پر پہنچایا جائے۔ اس طرح ترجمہ میں معانی اور خوبصورتی ہر دونوں پر آنچ نہ آتی ہماری مشترکہ کتابیں پشتو تراجم پر مشتمل ہیں۔ جنکی تفصیل یہ ہے۔

1- خوشحال خان کے افکار

2- رحمان بابا کے افکار

3- اٹک کے اس پار

4- پشتو شاعری

5- خوشحال خان خٹک

6- پٹھانوں کے رومان

7- منتخب ادب 1949ء

8- رحمان بابا

اس کے علاوہ ادبی ماہانہ رسالوں نغمہ حیات سنگ میل اور ہفت روزہ شباب پشاور و ہفت روزہ مصور شباب لاہور کی ادارت بھی ہم دونوں نے مل کر کی۔ یہ ہندوستان گیر شہرت کے ادبی میگزین تھے۔ خصوصاً" سنگ میل اسقدر

مقبول ہوا کہ پورے ہندوستان کے ادبی حلقوں کو اس کی اشاعت کا انتظار رہتا۔ سنگ میل ہمارا نشان بن گیا صوبہ سرحد کے قلمکاروں کو ہم نے اس کے ذریعے پوری دنیا میں روشناس کرایا۔ وہ فن پارے جو پشتونوں کے علاوہ کسی کی نظر میں نہ تھے سارے ہندوستان کی نظروں میں آگئے۔ اب صوبہ سرحد اور اس کا ادب ہمہ گیر حیثیت اختیار کرنے لگا اور سرحد کے کلچر کو پوری دنیا میں پہچانا جانے لگا۔ ہم نے پختونوں کے متعلق یہ تاثر کہ وہ اجڈ گنوار ہیں اور بندوق کی زبان کے علاوہ کوئی زبان نہیں جانتے تار تار کر کے رکھدیا اور سارے ہندوستان نے مان لیا کہ پشتونوں نے ادب اور کلچر میں اپنی ایسی چھاپ چھوڑ رکھی ہے جو آج تک ان سے پوشیدہ تھی۔ خصوصاً سنگ میل کا سرحد نمبر تو اتنا مقبول ہوا کہ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی چھاپنا پڑا۔ اس نے صوبے کے متعلق ایک تاریخی اور یادگار دستاویز کا درجہ حاصل کیا۔

اس کے علاوہ ملک کے اندر اور باہر بھی ہم نے باہم ہمسفری کا لطف اٹھایا۔ میں تین برس لندن میں رہا اور وہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پچاس سالہ جوبلی منانے کے سلسلے میں دو روزہ انٹرنیشنل کانفرنس کا انتظام کیا تو میں نے رضا بھائی کو ان تقریبات میں لندن بلایا جہاں اس نے نہایت وقیع مقالہ پڑھا اور جسے ساری دنیا سے آئے ہوئے۔ کانفرنس کے شرکاء نے بے حد سراہا اور وہیں سے امریکہ اور کینیڈا کے مشاعروں میں شرکت کے لئے گئے وہ اس سے پہلے بھی ایک ادبی کانفرنس کے سلسلے میں روس کے دورے پر جا چکے تھے فیض صاحب اس دوران جب کبھی ملتے تو رضا بھائی کی بڑی تعریف کرتے حالانکہ میں نے انہیں بہت کم کسی کے کام کو سراہتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک دفعہ تو انہوں نے کہا رضا نے لوک ورثے میں ملازمت کے دوران جتنی کتابیں بھی لکھی ہیں بڑی ذمہ داری اور محنت سے لکھی ہیں اور وہ بہت پسند بھی کی گئی ہیں وہ رضا

کی بڑی قدر کرتے تھے اور جب بھی ملتے اس کا ضرور پوچھتے لندن کے ایک مشاعرے میں رضا جب غزل پڑھ چکا تو فیض صاحب نے ان کی ایک غزل کی فرمائش کی جو انہیں بہت پسند تھی یہ غزل وہ ایک نجی محفل میں بھی مجھ سے دو بار سن چکے تھے۔ کشور ناہید، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور مجید امجد مرحوم کے علاوہ مجھے ان کے منہ سے رضا کے متعلق تعریفی کلمات سن کر بڑی خوشی ہوتی۔

دراصل رضا بڑا خوش طبع اور کم گو، ذہین اور سوجھ بوجھ کا حامل تھا۔ اور اس کی یہی خوبیاں تھیں جو ہر محفل اور ہر تقریب میں ملنے والے کو متاثر کرتیں۔ دوستوں پر وہ ایسا تاثر چھوڑتا کہ وہ اسے آسانی سے بھلا نہیں سکتے۔ محفل میں دیکھیں تو اس کی طنز و مزاح سے آراستہ گفتگو زعفران زار کا سماں پیدا کرتی۔ تنقید کرتا تو بچی تلی، ذومعنی اور برمحل اور جب اپنے بے تکلف یاروں میں بیٹھتا تو اس کی گفتگو کی نشتریت شنیدنی ہوتی۔

پوچھئے تو اس کی ذات بڑی خوبیوں کی حامل تھی وہ ایک اچھا شاعر، نثر نگار، ذہین محقق، مشاق نقاد، ہندکو، اردو، فارسی، پشتو، کشمیری، زبانوں کا ماہر بہترین کالم نویس اور صحافی تھا۔

رضا کے متعلق ایک سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ ایک سیلف میڈ انسان تھا۔ اس نے ایک ایسے غریب اور مفلس گھرانے میں جنم لیا جہاں پیدا ہونا بجائے خود ایک سزا سے کم نہیں ہوتا جہاں۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اس بھیانک حقیقت سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ پیٹ کی آگ بجھانے کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے ظاہر ہے ایسے حالات میں سکول کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا پھر حادثہ یہ ہوا کہ بچپن ہی میں والد کے سائے سے محروم ہو کر گھر کے اخراجات کا سارا بوجھ سر پر آن پڑا۔ ابھی ہوش نہیں سنبھالا تھا کہ اسے رفوگری سیکھنے کے لئے ایک کشمیری رفوگر کے سپرد کر دیا گیا جہاں صبح سے شام تک

استاد کی خدمت گزاری کے باوجود اسے اتنا معاوضہ نہ ملتا کہ بیوہ ماں، بہنوں اور اپنا پیٹ پالتا، اس کا ایک انتہائی شریف و وضع دار چھوٹا بھائی محمد حسین ہمدانی بھی تھا جس نے بھائی کا چھوٹی عمر سے ہی ساتھ دیا اور مزدوری کرتے ہوئے پڑھائی حاصل کی بہنوں کے یہ دونوں سہارا تھے۔ محمد حسین ٹیچر بھرتی ہوئے اور بڑی خودداری سے زندگی گزاری آخری وقت تک بچوں کو پڑھانے اور ان کے مستقبل کو سنوارنے کی ڈیوٹی ایسی سنبھالی کہ ایک دن دل کا مریض ہونے کے باوجود اپنی تکلیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بچوں کو پڑھانے سکول جا پہنچا اور بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے کلاس ہی میں میز پر سر رکھا اور جان دے دی اس کے مرنے پر میں نے چھوٹے چھوٹے سکول کے بچوں کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا گویا اس نے اپنی منزل پالی تھی۔

رضا نے باپ کے مرنے کے بعد ہمت نہ ہاری اور نہ صرف گھر کی گاڑی چلانے کے لئے وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے لگا بلکہ اپنی علمی اور ادبی تشنگی بجھانے کی طرف بھی پوری طرح مائل رہا اور اس طرح وہ برے بھلے طور پر وقت گزارتا رہا۔ دن بھر کی کڑی مشقت کے بعد وہ رات کو کچھ وقت نکال کر درسی کتابیں بھی پڑھتا رہا اور فارسی ادب کا درس بھی لیتا رہا اس دوران ہماری دوستی ہو چکی تھی۔ کہتے ہیں ایک سے بھلے دو۔ ہم کچھ ایسے بھلے بھی نہیں تھے لیکن ہمارا مرض ایک ہی تھا۔ غربت، بدحالی، تعلیم سے محرومی ہم نے تہیہ کر لیا کہ حالات نے جو زیادتی ہم سے کی ہے اس کی تلافی کرنی ہو گی اور انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کے لئے اپنی غربت کے ساتھ ساتھ اپنی جہالت اور بے علمی کے روگ سے بھی نجات حاصل کرنی ہو گی ہم نے حصول تعلیم کے لئے شب و روز ٹوٹ کر کام کرنے کا فیصلہ کیا اور آخر ہم دونوں نے ہمت کر کے ادیب فاضل۔ منشی فاضل، پشتو فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد

کمپونڈری کا کورس پاس کیا اور ہسپتال میں ملازم ہو گئے۔ اب اتنا ہوا کہ اچھی
بری گھر کے خرچ کی گاڑی چلنے لگی لیکن زیادہ عرصہ ہم یہ ملازمت بھی نہ کر
سکے کہ درحقیقت ملازمت کی پابندی ہمارے مزاج کے خلاف تھی۔ ایک
دوسرے سے جدا ہونا ہماری فطرت کے خلاف تھا اور مجھے پاڑہ چنار تبدیل کرنا
اس ملازمت کا نقطہ آخر ثابت ہوا۔ پاڑہ چنار میں ایک سال میں نے گزارا تو
رضا میرے بغیر اور میں رضا کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل محسوس کرنے لگے اس
لئے میں نے استعفیٰ دے دیا اور رضا نے جوابی استعفیٰ داغ دیا۔ اب ہم نے
صحافت کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا اور اخبار کے دفتر کے لئے ایک بالاخانہ کرائے پر
لے کر ہفت روزہ "شباب" کا اجراء کیا اس کے ساتھ ہی ایک مشہور پرچے
پندرہ روزہ "کیسر کیاری" اور ماہنامہ "نغمہ حیات" کی ادارت بھی سنبھال لی اس
طرح ہم نے صحافت میں تو اپنے آپ کو منوا لیا لیکن مالی حالات بد سے بدتر
ہوتے گئے اور آخر اتنا قرضہ چڑھ گیا کہ پشاور سے ہجرت کرنے کے سوا کوئی
چارہ نہ رہا۔ اور ہم کراچی جانے کے لئے پنڈی ہوتے ہوئے لاہور پہنچے تو وہاں
ایک پارٹی جو ہماری ہمدرد بھی تھی اور مداح بھی اس نے ہمیں ہفت روزہ "
شباب" کو معیاری سطح پر لاہور سے جاری کرنے کے لئے سرمایہ کاری کی پیشکش
کی اور ہمیں معقول تنخواہ دینے کے لئے آمادگی کا اظہار کیا اس پارٹی نے ایک
معقول دفتر بھی ہمارے لئے کرائے پر لے لیا جو اخبار کا دفتر ہونے کے ساتھ
ہماری رہائشی ضرورت کے لئے بھی کافی تھا۔ پرچہ ہم نے بڑی دھوم دھام سے
نکالا۔ پہلے پرچے نے ہی لاہور کے صحافی حلقوں کو چونکا دیا مولانا عبدالمجید سالک
مولانا غلام رسول مہر۔ مرتضیٰ میکش، شبلی بی کام' باری علیگ' مرزا ادیب' سب
نے داد دی اور ایسا معیاری پرچہ نکالنے پر حوصلہ افزائی کی دوسرا پرچہ پہلے سے
بھی بڑھ کر تھا تین ماہ میں پرچہ خاصہ مقبول بھی ہو گیا اور اشاعت بھی بڑھ گئی

اشتہارات بھی ملنے لگے لیکن پرچے کے مالک کی بدنیتی نے اچھے بھلے اتنی تیزی سے ابھرتے ہوئے پرچے کا گلہ گھونٹ دیا۔ وہ نہ صرف ہماری تنخواہ دبا بیٹھا بلکہ کاغذ، پریس، کاتب کی ادائیگی بھی نہ کی جس کے باعث لازمی طور پر پرچے نے بند ہونا تھا، سو بند ہو گیا اور ہم بے کار ہو گئے۔

ہم بوریا بستر باندھ کر دلبرداشتہ ہو کر کراچی پہنچ گئے وہاں ایک فلیٹ کرائے پر لیا۔ انتخابات کا زمانہ تھا ہم ایک پریس میں کمپوزیٹری کرنے لگے۔ چھ ماہ شب و روز کام کر کے ہم نے خاصی رقم جمع کر لی اور پشاور واپسی کا ارادہ باندھ رہے تھے کہ انجمن ترقی اردو کے جنرل سیکرٹری مولانا افسر امروہوی نے، جو ہمارے بڑے مداح تھے انجمن ترقی اردو کی سلور جوبلی منانے کے لئے ہمیں تین ماہ کے لئے دو ہزار روپے کی پیشکش کر کے روک لیا اور جوبلی کی تقریبات کا سارا انتظام ہمارے سپرد کر دیا۔ جس میں پورے متحدہ ہندوستان سے ادباء اور شعراء کو مدعو کرنا اور تین روزہ کانفرنس کا انعقاد شامل تھا۔

ہم نے بڑی تندہی سے کام شروع کیا پورے ہندوستان سے تمام مشاہیر شعراء، ادباء کو مدعو کیا کانفرنس کے لئے بلدیہ کا ہال کرائے پر لیا، مہمانوں کے ٹھہرنے کا بندوبست، ان کے خوردونوش کا انتظام، غرض شب و روز کی محنت سے ہم نے یہ کانفرنس اس شان و شوکت سے منائی کہ مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالمجید سالک سب مان گئے اور سب نے تسلیم کیا کہ اس سے پہلے اتنی شاندار کانفرنس ہندوستان میں اس وقت تک نہیں ہوئی تھی۔ اردو انجمنوں کی تاریخ میں وہ کانفرنس ہمیشہ یادگار رہے گی۔ دو روزہ کانفرنس ہوئی تیسرے دن رات کو عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس کانفرنس کی روئیداد رضا بھائی نے پوری تفصیل سے لکھی جو شائع ہوئی۔ اس کانفرنس کے بعد ہم پشاور واپس لوٹے یہ 1940ء کی بات ہے کیونکہ دوسری جنگ عظیم کا

وقت تھا۔

رضا کی خوبیاں تو آپ سن چکے اب اس کی کچھ کمزوریاں بھی لگے ہاتھوں سنتے جایئے۔ سب سے بڑی کمزوری اس کی یہ ہے کہ وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی بیماری میں مبتلا تھا چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ یہ شریف آدمی سوچتا رہ جاتا اور معاملہ کہیں کا کہیں پہنچ جاتا کیونکہ وقت تو کسی کے لئے رک نہیں سکتا۔ اپنی اس ازلی محتاط رہنے کی قبیح عادت نے اسے بہت نقصان پہنچایا۔ اچھا پھر لطیفہ یہ ہے کہ اس معاملے میں میں اس کی ضد واقع ہوا ہوں۔ یعنی ادھر منہ سے بات نکلے اور چاہتا کہ ادھر فوراً اسے عملی جامہ پہنا دیا جائے۔ اس طرح میں گویا دوسری انتہا تھا۔ جو اس سے کہیں زیادہ خطرناک رویہ تھا۔ یعنی یوں سمجھ لیجئے کہ ہم بجلی کی دو مثبت و منفی تاریں تھیں۔ جنکا ملاپ روشنی کی علامت ہے لیکن دونوں کا اپنے اپنے طور پر انتہا پسندانہ رویہ بجائے خود ہمارے لئے ہمیشہ بہت بڑا خطرہ بنا رہا۔

ہمارے مراسم کے بعد بڑے بڑے شدید خطرات سے اس نے مجھے لکھ دے کر بچایا تاہم اس کے باوجود میں رسی تڑا کر کئی دفعہ جیل یاترا کر آیا۔ ویسے بھی میں ہمیشہ اس کے لئے خطرے کا نشان بنا رہا۔ رضا بذات خود عملی طور پر سیاسی آدمی نہ تھا۔ لیکن مجھے اس نے سیاست سے کبھی ٹوکا بھی نہیں۔ رضا کی اس کی ادبی خدمات پر رائٹرز گلڈ آدم جی انجمن ترقی اردو کی طرف سے لاتعداد انعامات ملے اور پھر آخر میں پرائڈ آف پرفارمنس سے نوازا گیا۔

کہنے میں خون کے رشتے زیادہ قریبی ہوتے ہیں۔ لیکن رضا اور میرا رشتہ خون کے رشتے سے کہیں زیادہ تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اتنا والہانہ چاہا کہ شاید ہی اس کی مثال مل سکے نہ بھائیوں' نہ بیٹوں میں یقین کریں ہم ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جی رہے تھے۔ سالہا سال تو ہم اکٹھے محلّہ خداداد کے اس

گھر میں رہتے رہے ہمارے کپڑے ہماری آمدنیوں کے پیسوں کا کوئی حساب نہ تھا۔ کپڑے ایک الماری میں پڑے ہوتے جو میں نے چاہے میں نے پہن لئے جو اس سے چاہے اس نے پہن لئے۔ (ہمارے جسم بھی ایک جیسے تھے۔ یعنی موٹاپا نہ تھا) اور ہماری آمدنی بھی الماری کے ایک سیف میں پڑی ہوتی تھی۔ جتنی جسے ضرورت ہوئی لے لی۔ کبھی کسی نے کوئی حساب نہیں پوچھا بلکہ شروع میں تو کپڑے بھی اکٹھے آتے تھے سوٹ بھی قمیض بھی کرتے پاجامے بھی بوٹ بھی ایک عرصہ تک شادیوں کے بعد بھی لیکن پھر بیویوں ہی نے کچھ چکر چلا کر پہلے خرچ الگ الگ کرایا پھر گھر الگ الگ ہوئے لیکن وہ ہمارے دلوں کو الگ الگ خانوں میں نہ بانٹ سکیں۔

ہم پنڈی لاہور کراچی میں اخبارات میں کام کرتے رہے کسی پریس میں ملازمت کی یا کہیں کسی سٹور میں سیلزمین رہے۔ پشاور میں ہماری دوستی کے بعد پہلی ہجرت میں کراچی تک یہی دھندا چلاتے رہے۔ دراصل ہم نے محنت مزدوری کو کبھی عار نہیں سمجھا اگرچہ اس کی نوبت نہیں آئی لیکن اگر ایسا وقت آن پڑتا تو ہم ٹوکری اٹھانے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ہم نے اپنی انا کو کچلنے کے لئے عملاً بھی معمولی ملازمتیں کیں پریس میں کمپوزیٹری ہم نے سیکھ لی تھی جب اور کوئی ڈھنگ کا کام نہ ملتا تو کسی پریس میں کمپوزیٹری تو مل ہی جاتی جہاں ٹھیکے کے کام میں ہم اس وقت یعنی 1940ء میں بھی پانچ روپے سے دس روپے روزانہ فی کس کما لیتے تھے لیکن پیسہ جمع کرنے کے لئے کمانا مقصد کبھی نہیں رہا۔ جب نہ اب۔ ہم تو زندہ رہنے کے لئے بالکل جیب خالی ہوجاتی تو کسی پریس میں ہفتہ عشرہ کام کرکے سو پچاس روپے جیب میں ڈال کر وہاں سے اگلے شہر پہنچ جاتے اور سیر و تفریح میں اس وقت تک مگن رہتے جب تک جیب خالی نہ ہو جاتی اور اب بھی ایسا ہی ہے۔ جب بچے میرے بھی رضا کے بھی ماشاء اللہ اچھے خاصے

کماؤ ہو گئے اس وقت بھی ہم نے ان کے اصرار کے باوجود ان پر بوجھ بننا گوارا نہیں کیا رضا مشرق میں کالم لکھ کر کچھ کما لیتا۔ جبکہ میں بیرون ملک جا کر اتنی رقم کما کر لے آتا کہ یہاں سال بھر گزر بسر ہوتی رہے اور جب یہ رقم ختم ہونے لگے تو پھر یورپ انگلینڈ یا امریکہ دو تین سال گزار کر کچھ اثاثہ بنا کر لے آتا اس سے زیادہ نہ ہمیں لالچ تھی نہ ضرورت اس لئے ذہنی طور پر نہایت پر سکون وقت گزرا۔

1956ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو بین کیا گیا جس کا ذکر میں کر چکا ہوں اور جسکے بین کرنے کے بعد تمام ترقی پسند مصنفین کو گرفتار کیا گیا تو میرے گھر میں زندگی گزارنے کے اپنے فارمولے کے مطابق کچھ نہ تھا۔ رضا میرے بچوں کا کفیل رہا ورنہ نجانے کیا حشر ہوتا گھر میں بیگم کا جو تھوڑا بہت زیور تھا وہ کب کا بک چکا تھا اور ہماری قلم کی کمائی سے بمشکل بچوں کی تعلیم اور روٹی پانی کا خرچ چلتا تھا۔ ان دنوں ہم دونوں مطب بھی کرتے تھے۔ ڈاکٹری کے اس پیشے سے اچھی خاصی آمدنی ہوجایا کرتی تھی۔ لیکن میرے شاعری کے یارانے اور محفلوں کے آگے یہ آمدنی کچھ نہ تھی مجھے سزا ہوئی تو میرے گھر کے خرچ اور بچوں کی تعلیم کا سارا خرچ رضا بھائی کے سر پر آن پڑا۔ جیل میں میرے لئے سب سے زیادہ کوفت کا سبب یہی تھا پھر رضا مجھے مس بھی بہت کرتا جس سے اس کی صحت بھی بہت بری طرح متاثر ہوئی یہ سب خبریں مجھ تک پہنچتی رہتیں تھیں۔ جن سے میں بہت پریشان رہتا لیکن دوسری طرف مصنوعی طور پر اپنے جیل کے ساتھیوں سے ہنسی مذاق بھی کرتا رہتا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ سزا اور جیل سے خوفزدہ ہو گیا ہوں۔ مختصر یہ کہ وہ میری جدائی کو بری طرح محسوس کرتا تھا۔ اور اس کی صحت اتنی متاثر ہوئی کہ جب 9 ماہ بعد ارباب سکندر مرحوم نے میری اپیل کی اور میں پہلی پیشی پر عدالت آیا تو رضا کو دیکھ کر میں

پریشان ہو گیا وہ یوں لگتا تھا جیسے مہینوں سے بیمار ہو۔ پھر ایک ماہ بعد میں ضمانت پر رہا ہوا۔ ضیاء جعفری مرحوم نے ضمانت دی اور چند دنوں میں رضا کے چہرے کی تازگی اور بدن کی شادابی لوٹ آئی۔ اب پھر محلہ خدادا کی میری بیٹھک کی رونق بحال ہو گئی ضیاء جعفری۔ عبدالودود قمر' نذیر مرزا برلاس' مجید شاہد' فرید عرش' مرزا محمود سرحدی' امیر حمزہ شنواری' عبدالحلیم اثر' مظہر گیلانی' محسن احسان' احمد فراز' خاطر غزنوی' کے چہرے پھر کھل اٹھے یہ ہماری روزانہ کی چوکڑی تھی میرے شہر سے باہر نکلنے پر پابندی تھی رات کو قہوہ پینے ہم قصہ خوانی جاتے تو ان دنوں کابلی دروازہ شہر کی آخری حدود ہوتی ضیاء جعفری مرحوم نے میری ضمانت دی ہوئی تھی۔ میں کہتا ضیاء صاحب آج سب کو ملائی والی چائے پلاؤ اگر وہ ذرا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے تو میں کہتا ابھی کابلی دروازے سے باہر جا کر نظر بندی کی خلاف ورزی کرتا ہوں میرا کیا ہے زیادہ سے زیادہ جیل ہی جانا ہے۔ آپ نے ضمانت دی ہے آپ کو بھی پکڑیں گے وہ گھبرا جاتے اور کہتے چائے منگوالو لیکن لعنت ہے جو آئندہ تم جیسے اچکے کی ضمانت دی اور سب قہقہے لگا کر ہنس پڑتے۔

شادی

میری شادی کا قصہ بھی عجیب سا تھا - رضا کی چار بہنیں تھیں ایک کی شادی مشہور فنکار - شیعہ ذاکر - اداکار - منجم - شاعر - ڈرامہ نگار غرض ہر فن مولا اور اپنی قسم کی نابغہ روزگار شخصیت قمر علی قمر سرحدی سے ہوئی - جس کا نام صفیہ تھا - دوسری کی شادی اس کے پھوپھی زاد اردو زبان کے ماہر لسانیات' ٹی وی ریڈیو کے مشہور ترین کمپیئر اور ٹی وی ریڈیو پاکستان لاہور کے روح رواں مصطفیٰ علی ہمدانی سے ہوئی - مصطفیٰ علی ہمدانی اردو خبرنامہ پڑھتے اور آج تک اردو خبریں پڑھنے والے اسے اپنا استاد مانتے ہیں - تلفظ اور بیان میں اپنی مثال آپ اور پہلی مرتبہ پاکستان بننے کے بعد " یہ ریڈیو پاکستان ہے " کا اعلان کرنے والا مصطفیٰ علی ہمدانی - جس کے پہلی دفعہ اس فقرے کے کہنے کے ساتھ ہی سارے پاکستان میں لوگ سڑکوں پر نکل کر ناچنے لگے تھے۔ رضا کی اس بہن کا نام ذکیہ ہمدانی تھا۔ قمر علی قمر سرحدی کی اولاد میں میرا داماد ممتاز علی آخونزادہ سب سے بڑا تھا جس سے میری سب سے بڑی بیٹی قرۃ العین سدرہ بخاری کی شادی ہوئی۔ دوسرے نمبر پر مختار علی نیر ہے جو تمغہ امتیاز یافتہ۔ مشہور شیعہ ذاکر ہندکو زبان کا ماہر کئی تصانیف کا مصنف جسمانی اداکار اور ریڈیو ٹی وی کا مشہور ڈرامہ نگار ہے۔ تیسرے نمبر پر امتیاز علی آخونزادہ اقبال علی آخونزادہ خورشید علی آخونزادہ مظفر علی آخونزادہ اور تحریک جعفریہ کا مشہور لیڈر انور علی آخونزادہ ہیں۔

مصطفیٰ علی ہمدانی سے اسد علی ہمدانی' رضا کا جواں سال مرحوم داماد انجینئر مرتضیٰ علی ہمدانی' مجتبیٰ علی ہمدانی ایڈوکیٹ اور باپ کی سیٹ سنبھالنے والا ریڈیو پاکستان سے منسلک صفدر علی ہمدانی ہے جبکہ اس کی ماشاء اللہ 5 عدد بیٹیاں بھی

اچھے گھروں میں بیاہ کر خوشحالی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔
تیسری بہن بادشاہ بیگم ہمدانی، مصطفیٰ علی ہمدانی کے بھائی مرزا افتخار علی ہمدانی سے بیاہی گئی جس میں سے ایک بیٹا رسول علی ہمدانی اور دو بیٹیاں تھیں۔
اس کی چوتھی بہن جب پیدا ہوئی تو رضا کے ماموں نے (جو بے اولاد تھے) اسے گود لے لیا یہ شریف النفس جوڑا اپنی مثال آپ تھا۔ انہوں نے اسے دودھ پلاتے وقت گود لیا اور پھر میرے بچوں کے بچوں کو بھی ایسے پال پوس کر بڑا کیا کہ اگر کسی نے بچے کو مارنے کے لئے ہاتھ بھی اٹھایا تو دو دو دن انہوں نے روٹی نہیں کھائی۔ نانی چنو اور بابا جان (فقیر حسین مرحوم) یعنی میری ساس اور سسر میرے گھر کے رکھوالے تھے تمام عمر میں بداعمالیاں کرتا رہا اور وہ اس کی سزا بھگتتے رہے۔ نانا فقیر حسین نے رضا کے ساتھ مل کر کبھی مجھے جیل جانے کے بعد گھر کی فکر نہ ہونے دی۔
تو میں بات کر رہا تھا شادی کی جب میں رضا کی اس بہن کو دیکھتا جو ماں باپ کی لاڈلی تھی تیرہ سال کی عمر میں زیارتوں پر گئی اور لہک لہک کر وہاں کے قصے بیان کرتی تو مجھے بڑا اچھا لگتا۔ وہ تعلیم حاصل کر رہی تھی اور ایک دن جب اس کی کسی استانی نے اسے مارا تو ماں باپ نے اس وجہ سے سکول سے اٹھوا لیا کہ ہماری بچی مار کھانے کے لئے تو پیدا نہیں ہوئی۔ صبح اٹھتی تو ماں پراٹھا لے کر کھڑی ہوتی باپ حلوہ کچوڑی لے کر آرہا ہوتا۔ نانی کہتی میری بیٹی ملائی کے بغیر ناشتہ نہیں کیا کرتی گویا ایک نواب زادی پل رہی تھی۔ مجھے وہ بڑی بھلی محسوس ہوتی لیکن ہمت نہ پڑتی کہ رضا سے اس کا ذکر کر سکوں۔ آخر ایک دن میں نے رضا سے بڑی جرات کر کے کہہ دیا کہ میں نے شادی کرنی ہے اس نے کہا کر لو کوئی لڑکی ڈھونڈی ہے۔ تم تو ہو ہی عاشق مزاج کہاں ڈورے ڈالے ہیں میں نے ڈرتے ڈرتے کہا یار میں کسی شریف گھرانے میں شادی کرنا چاہتا

ہوں جو مجھ جیسے شخص سے نباہ کر سکے اس نے کہا پھر کیا کیا جائے میں نے کہا تم ماموں فقیر حسین سے ان کی بیٹی رفیعہ ہمدانی کی بات کرو۔ وہ چپ ہو گیا۔

میں نے کچھ دن بعد پھر اس سے ذکر کیا اس نے کہا یار تمہیں علم ہے میں ان باتوں پر یقین نہیں کرتا لیکن بہت بڑی مصیبت بن جائیگی ماموں فقیر حسین شیعہ اثناء عشری ہیں وہ سنی خاندان میں کب اس کی شادی کے لئے تیار ہوں گے۔ اور پھر تم بھی ایسے سید گھرانے سے ہو کہ تمہارے گھر بھی قیامت برپا ہو جائے گی۔ لیکن میں نہ مانا۔ اب میں نے اپنے گھر ذکر کیا تو وہاں بھی مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ بھلا سید لڑکا اور گھرانہ بھی ایسا کہ پچھلی کئی پشتوں سے کوئی لڑکی غیر سید سے اور کوئی لڑکا سید لڑکی کے بغیر نہ بیاہا گیا ہو یہ تو ایک انقلاب تھا جس کے لانے پر میں مصر تھا۔

لیکن میں نہ مانا اور جب ماں کو دھمکی دی کہ اگر ایسا نہ ہوا تو کبھی شادی نہ کرونگا تو میری شادی کا ارمان رکھنے والی اور صبح شام ضد کرنے والی ماں نے ہاں کر دی۔ اب ہم نے رشتہ بھیجا تو ماموں فقیر حسین سادات کو اپنے گھر آتے دیکھ کر قطعاً" انکار نہ کر سکے اور یوں بڑے دھوم دھڑکے سے ہماری شادی ہوئی۔ مجھے کہنے دیجئے کہ رفیعہ ایک ایسی بیوی ثابت ہوئی جس نے میرے اچھے برے وقت میں اتنی بہادری سے میرا ساتھ دیا جس پر مجھے ابھی تک فخر ہے۔ میں آئے دن جیل، پولیس اور سی آئی ڈی کے نرغے میں ہوتا گھر پر چھاپے پڑتے تو سارا شہر ڈر کے مارے خوفزدہ رہتا۔ بڑے بڑے قریبی دوست ڈر کے مارے گھر کا رخ نہ کرتے اور کئی دفعہ تو آلوؤں کی بوری اور آٹے کی بوری کے ساتھ اس نے مہینہ مہینہ گھر چلایا لیکن کسی کا احسان نہ لیا حتیٰ کہ قتیل اور ملک صاحب نے پیسے بھیجے تو واپس کر دیئے لیکن منہ سے کبھی اف تک نہ کی۔ میری لا ابالی زندگی اور رندانہ مجالس کو وہ اپنی قسمت سمجھتی رہی اور میرے بعد

میرے بیٹے قمر عباس (جس نے مجھے بھی سیاست میں پیچھے چھوڑ دیا) کی تمام تکالیف بھی وہ ہنس ہنس کر سہتی رہی۔

میری شادی کے بعد پہلی بچی پیدا ہوئی تو گھر میں رونق آ گئی خوشیاں منائیں گئیں اور نانی خورشید میری بیوی کی نانی (جو اس وقت زندہ تھی) پھولے نہ سما رہی تھی۔ اماں چنو (میری ساس) تو گویا بچی کے ساتھ ہی پیدا ہوئی پورا گھر زچہ خانہ بن گیا وہ تھی بھی بڑی گول مٹول' سفید اور بلی آنکھوں والی اس کے بعد دوسری بچی پیدا ہوئی پہلی کا نام رفیعہ نے قرۃ العین سدرہ رکھا اور دوسری کا اس کے بھائی محمد حسین ہمدانی نے (جو اسے آخری وقت تک بے تحاشا پیار کرتا تھا) قرۃ العین عذرا رکھا۔ اب بیٹے کی خواہش تھی۔ مجھے بیوی جب ذکر کرتی میں کہتا لڑکی ہو یا لڑکا کوئی بات نہیں میں دراصل ایسی لغویات کا قائل کبھی نہیں رہا البتہ میری والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ فارغ کے ہاں بیٹا دیکھے۔ اس دوران ظفر عباس تشریف لے آئے اور پھر تو لائن لگ گئی قمر عباس پھر طاہر عباس پھر قرۃ العین طاہرہ بخاری کی آمد ہوئی۔

سدرہ کی شادی اس کے کزن ممتاز علی آخوندزادہ سے ہوئی۔ سیلف میڈ' انتہائی محنتی' نفیس لباس کا دلدادہ' پڑھا لکھا۔ جس نے کلرکی سے عملی زندگی کا آغاز کیا اور ساتھ ساتھ تعلیم کر کے وکالت بھی مکمل کی پھر اس نے محکمانہ امتحان پاس کیا اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر جا پہنچا۔ ایک دن جب اس کی پروموشن ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر ہو چکی تھی۔ نتھیا گلی میں سابق گورنر فضل حق کی ایک میٹنگ سے فارغ ہو کر پورے خاندان کے ہمراہ آ رہا تھا کہ حسن ابدال کے قریب گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا اور نوشہرہ کے C.M.H ہسپتال میں آپریشن ٹیبل پر اس نے جان دی۔ اس کا جوان لاشہ اور اپنی بیوہ بیٹی اور اس کے بچوں کو میں اور میرا دوسرا داماد ماصل خان نوشہرہ سے واپس لائے تو میرا

سینہ پھٹ رہا تھا یہ ایسا داغ تھا جو اب تک میرے اندر زندہ ہے۔

میری بیٹی نے بیوگی کے اس عالم میں اپنے بچوں مظہر علی ممتاز (جو اب زرعی ترقیاتی بنک میں آڈیٹر ہے) اظہر علی ممتاز (جو محکمہ ٹیلی فون میں افسر ہے) اسد علی ممتاز (جو اپنا بزنس کر رہا ہے) اور قمر علی ممتاز (جو چارٹرڈ اکاؤنٹس کا کورس کر رہا ہے) کو بڑی ہمت سے پالا اس کی جوانی بچوں کے لئے ایسی وقف ہوئی کہ وہ عزم کا ایک پہاڑ بن کر رہ گئی۔

دوسرا بیٹا سید ظفر عباس انجینئر بنا اور پھر امریکہ میں شادی کے بعد آباد ہوا۔ اس نے خوب دل کھول کر تعلیم حاصل کی۔ ادب سے اس کا لگاؤ سب بہن بھائیوں سے زیادہ ہے۔ امریکہ میں کیلیفورنیا ریڈیو سے دو گھنٹے کا اردو سروس کا پروگرام اس نے شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے امریکہ میں اس پروگرام کا ایسا چرچا ہوا کہ امریکہ میں آباد پاکستانی ہندوستانی گھریلو عورتیں اور مرد اس پروگرام کے نشر ہوتے وقت اسے سنے بغیر نہ رہ سکتے۔ امریکہ میں کوئی ادبی یا ثقافتی پروگرام اس کے بغیر نامکمل ہوتا ہے۔ اس کی شادی لاہور میں ایک فیملی میں ہوئی جس سے اس کی نہ بن سکی اور علیحدگی کے بعد ایک اچھی جگہ دیکھ کر میں نے اسکی دوسری شادی کر دی۔ اسکی ایک ہی بچی (پہلی بیوی سے) سیدہ کنول فاطمہ ہے جس کا امریکہ کے ایک بہت بڑے پاکستانی خاندان کے لڑکے سے حال ہی میں بیاہ ہوا اور ماشاء اللہ خوش خوشحال ہے۔

میری بیٹی قرۃ العین عذرا بخاری کی شادی سید ماصل خان سے ہوئی جو یونائیٹڈ بنک میں اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ کے عہدے پر تھا۔ عذرا بڑی ہنس مکھ اور شرارتی تھی۔ میں جب بھی تھکا ہوا گھر آتا اور موڈ خراب ہوتا وہ گھر میں اعلان کر دیتی کہ آج قمر در عقرب ہے (یعنی ستارہ غلط چال میں ہے اور ابو کا موڈ خراب ہے) اس طرح سارا گھر سیریس ہو جاتا۔

ایک دن عذرا اپنے خاوند، بہو اور بہو کی والدہ کے ساتھ اسلام آباد (امریکہ کے ویزے کے سلسلے میں جا رہی تھی کہ اسی جگہ پر حسن ابدال کے قریب ہی جہاں ممتاز مرحوم کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا) انکی گاڑی کا ایک فلائینگ کوچ سے ایکسیڈنٹ ہوا اور عذرا موقع پر ہی دم توڑ گئی میرے خاندان کے لئے یہ صدمہ ایک قیامت تھی یقین نہ آتا کہ وہ ہنستی کھیلتی عذرا کیونکر موت کے منہ میں جا سکتی ہے اس کا جنازہ اٹھا تو پورا پشاور سوگوار تھا۔ عذرا مرحوم کی ایک بیٹی میمونہ ہے جس کی شادی ڈاکٹر سلیم سے ہوئی اور ایک بیٹا صنوبر حسین ہے جو ایک بنک میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور امریکہ سے کمپیوٹر میں اعلیٰ ترین ڈگری لے کر حال ہی میں آیا اور ماں کے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی پشاور میں دھوم دھام سے شادی کی۔

پھر سید قمر عباس ہے جس نے سیاسی سفر یہیں سے شروع کیا جہاں میں نے چھوڑا اس کی شادی پشاور میں فرحت حسین سے کی اور شکر ادا کیا کہ اس کی بھی شادی ہوئی کیونکہ وہ کسی صورت رضامند ہی نہ ہو رہا تھا
اس کے تین بچے ہیں۔ بڑا حیدر عباس پھر معصومہ
قمر اور پھر ثمر عباس یہ تینوں ابھی چھوٹے ہیں کیونکہ قمر نے سب بہن بھائیوں سے آخر میں شادی رچائی۔

سید طاہر عباس میرا وہ بیٹا ہے جس نے معاشی مشکلات میں ہر جگہ میرا ساتھ دیا میں اسے اپنا چڑی چھاپ بیٹا کہتا ہوں اس نے ایف اے کے بعد گھر کے معاشی حالات دیکھتے ہوئے پریس میں پرنٹنگ بھی کی اور پڑھائی بھی جاری رکھی اور ان سخت حالات میں گریجویشن کی۔ وہ انتہائی محنتی بچہ ہے۔ اور میری طرح محنت سے کما کر کھانے کا عادی ہے۔ آج کل دوائیوں کا بزنس کر رہا ہے

اور ماشاء اللہ اب بھی گھر چلانے کا ٹھیکہ اس کے سپرد ہے۔ اس کی شادی میں نے رضا کے چھوٹے بھائی محمد حسین مرحوم کی بچی غزالہ سے کی جس میں سے اس کی ایک بیٹی شمائلہ عباس دوسرا بیٹا سید مہدی عباس اور تیسرا بیٹا سید سعدی عباس ہیں۔

قرۃ العین طاہرہ کی شادی امریکہ میں مقیم ساہیوال کے ایک سید کاظمی خاندان کے چشم و چراغ سید شہزاد کاظمی سے ہوئی جو امریکہ میں عرصہ بیس سال سے مقیم ہے۔ طاہرہ کی شادی پر میں خاصا غمگین تھا کیونکہ ظفر کے بعد بیٹی کی جدائی میرے دل پر اچھی نہ لگ رہی تھی لیکن پھر اس کے مستقبل کی خاطر اسے بیاہ دیا اب اس کی اولادوں میں رباب کاظمی اور علی ہیں اور وہ ماشاء اللہ وہاں خوش خوشحال ہے۔

رضا بھائی کی اولادوں میں دو برخوردار اور ایک بچی ہے۔ بڑا بیٹا انیس رضا ہمدانی نیشنل بنک میں آفیسر ہے جبکہ دوسرا بیٹا نفیس رضا ہمدانی میڈیسن کمپنی میں اچھے عہدے پر ملازم ہے۔ دونوں اپنے والد کی طرح خوش گفتار اور محبت کرنے والے سعادتمند بچے ہیں۔ جبکہ بیٹی کی شادی مرتضیٰ ہمدانی مرحوم سے جو جوانی ہی میں داغ مفارقت دے گیا کے ساتھ ہو گئی جو اس کا کزن یعنی مصطفیٰ علی ہمدانی مرحوم کا برخوردار تھا۔

آغا سید چمن بادشاہ (مرحوم)

آغا سید لعل بادشاہ (مرحوم)
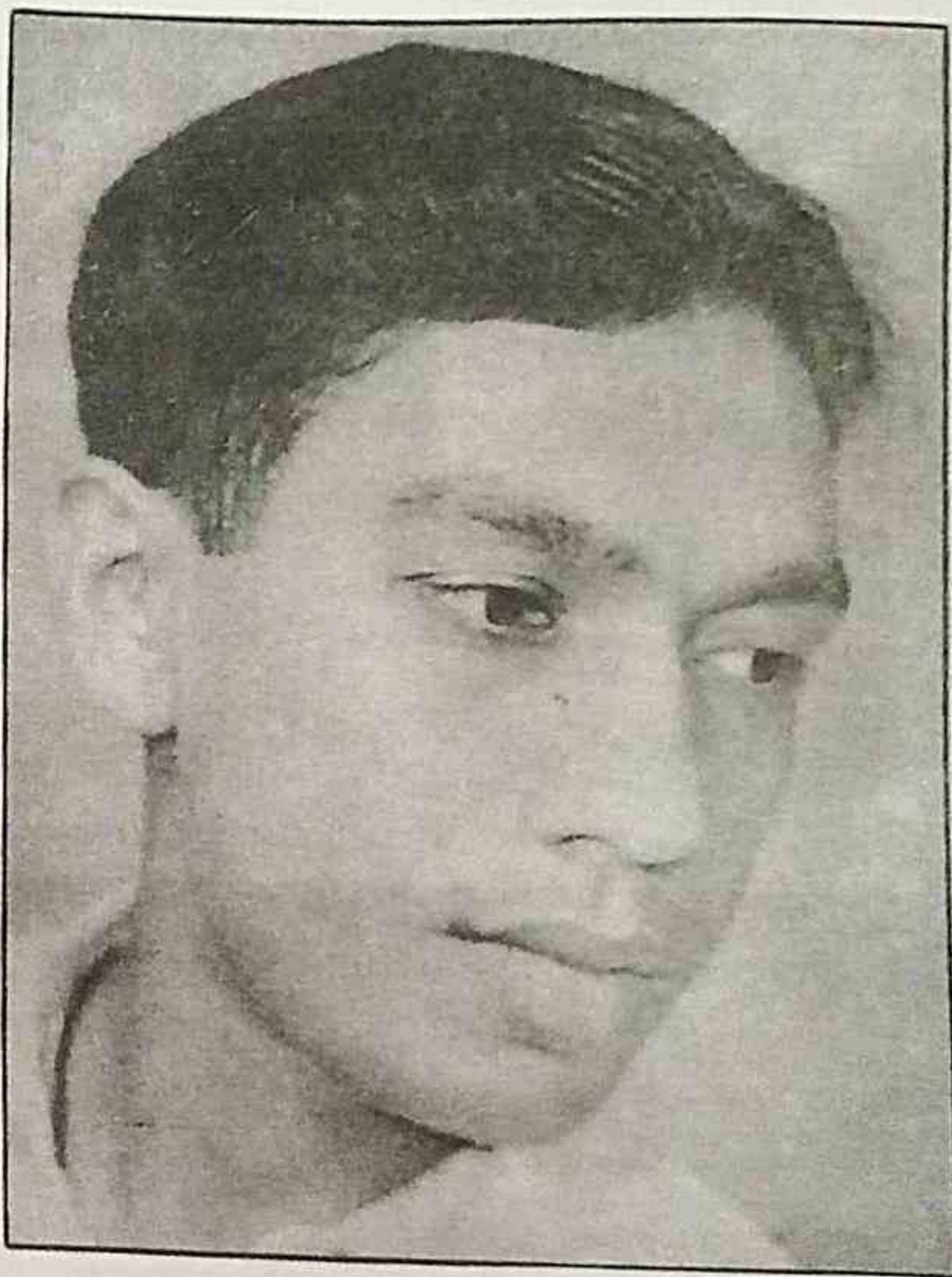
جب آتش جوان تھا

عمر عزیز کے مختلف ادوار

فارغ رضا

اپنی بیگم رفیعہ بخاری کے ساتھ، شادی کے موقع پر۔ (۱۹۴۳ء)

اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ۱۹۹۵ء

اپنی رفیقہ حیات کے ہمراہ (۱۹۷۷ء)

اپنے مطب میں 'ایک مسیحا کے روپ میں۔

محلّہ خداداد

شادی کے بعد میں اور رضا پشاور کے مشہور اور قدیمی محلے محلّہ خداداد
میں مکان کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ دونوں خاندان اکھٹے کافی عرصہ رہے۔
محلّہ خدادا میں ہی ہم نے پریس لگایا سنگ میل ان دنوں عروج پر تھا
چونکہ ترقی پسند جریدہ تھا اور ہم لکھتے بھی کھل کر تھے اس لئے وقت کے
حکمرانوں کی نظر میں شروع ہی سے وہ کھٹکنے لگا یہ وہ دور تھا جب انجمن ترقی
پسند مصنّفین پر پابندی لگی۔ مجھے یاد ہے اس کے اولین دور میں ایک مرکزی
وزیر کراچی سے چل کر میرے پاس آئے۔ اور حکومت کی طرف سے ان پرچوں
کی خریداری سرکاری اشتہارات اور دوسری سہولتوں کی پیشکش کی تاکہ پرچے
کی پالیسی تبدیل کر کے حکومت کی ہمنوائی کی جا سکے۔ پھر مجھے ایک سرکاری
پرچے کی ادارت کے لئے پر کشش پیشکش کی گئی لیکن میں نے صاف انکار کیا
1954ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت کاروائی ہوئی تمام ملک میں انجمن ترقی پسند
مصنّفین پر پابندی لگا دی گئی۔ سنگ میل ڈیکلیریشن کینسل کر دیا گیا اور پورے
ملک میں گرفتاریاں شروع کر دی گئیں سجاد ظہیر، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض،
غرض تمام ترقی پسند ادیب گرفتار کر لئے گئے اور اسی رات گھر پر پولیس نے
دھاوا بولا اور مجھے گرفتار کر کے ایک سال قید کر دیا گیا۔ ادارت میں رضا ہمدانی
اور خاطر غزنوی بھی تھے لیکن گرفتاریوں کی لسٹ میں صرف مجھے گرفتار کیا گیا۔
یہ میری دوسری گرفتاری تھی پہلی جب بہت چھوٹا تھا اور خاکسار تحریک کے
کارکن کی حیثیت سے گرفتار ہوا لیکن پھر بھائیوں نے ضمانت پر رہا کروایا اور
دوسری دفعہ جب انجمن ترقی پسند مصنّفین صوبہ سرحد کا سیکرٹری جنرل تھا۔ یہ
دور پشاور میں ادبی سرگرمیوں کے عروج کا دور تھا۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں دائرہ ادبیہ کی تشکیل 1935ء میں ہوئی یہ نئے اور ترقی پسندانہ رجحانات لے کر آنے والے نوجوانوں کا ادارہ تھا اس کے بانیوں میں آغہ ضیاء جعفری' ڈاکٹر نذیر مرزا برلاس ' عبدالوودو قمر' سیدنور خیالی' حبیب ایشیائی' فارغ بخاری رضا ہمدانی' سید مظہر گیلانی اور لالہ مضمر تاتاری شامل تھے۔ ہم سب مظہر گیلانی کے مکان پر جو ریتی دروازے میں واقع تھا جمع ہوئے پھر اس کے دفتر کے لئے ڈاکٹر عبدالودود قمر نے شاہ ولی قتال کی خانقاہ کے دروازے سے ملحقہ ایک چھوٹے سے کمرے کے حصول میں کامیابی حاصل کی۔ یہ کوچہ قصہ خوانی کے عین وسط میں تھا۔ دفتر بانسوں کی دکانوں میں گھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبدالودود قمر کی انتظامی صلاحیتیں اسی ادارے کو چلانے میں کامیاب ہوئیں۔ اور یہ دفتر 1935ء سے 1948ء تک قائم رہا۔ اس دفتر کو قمر صاحب روزانہ شام کو کھولتے اندر اور باہر ایک اینٹ رکھتے اونچے چبوترے پر جھاڑو لگاتے گرمیوں میں اندر باہر چھڑکاؤ کرتے کچھ بانسوں کی بھینی بھینی خوشبو کچھ مٹی کی سوندھی سوندھی مہک اس ماحول کو شاعرانہ بنا دیتی۔ وہ چارپائیاں اور دو چار کرسیاں لگاتے لوگ کھانے سے فارغ ہو کر ایک ایک کر کے آنا شروع کر دیتے اور نصف شب تک یہ محفل شعر و سخن جمی رہتی۔ جو شاعر یا ادیب اپنا تازہ شہ پارہ لکھتا وہ یہاں آکر احباب دائرہ کو سناتا۔ دائرے کا حلقہ' حلقہ ارباب ذوق کی طرح سہ ماہی یا ماہانہ شیڈول نہ ہوتا بلکہ حلقہ ارباب ذوق ہی کی طرح (بعض اوقات) حاضر مال تنقید کے لئے پیش ہو جاتا۔ یہ تنقید ترقی پسند مصنفین کی طرح بے دردانہ نہ ہوتی بلکہ جو کوئی اپنا تازہ شہ پارہ' نظم و نثر میں پڑھتا اور اگر وہ نو آموز ہوتا تو اس کی ہمت افزائی کی جاتی اگر پختہ کار ہوتا تو باقی اساتذہ فنی اصولوں کو سامنے رکھ کر شہ پارے کی خوبیاں اور خامیاں پرکھتے اور داد کے علاوہ مشورے پیش کرتے یہاں جو شاعر ادیب اچھا شہ پارہ جب لکھتا اور جب سناتا

چاہتا سناسکتا تھا۔ حاضرین کی رائے کبھی نیچا دکھانے کے جذبے کی نمائندگی نہ کرتی بلکہ مخلصانہ ہوتی۔ پڑھنے والوں کو ان کے مشورے سے بہت کچھ حاصل ہوتا۔

دائرہ ادبیہ کی حیثیت ایک دانشگاہ کی سی تھی۔ اس دانش گاہ میں مجید شاہد، خاطر غزنوی، احمد فراز، یعقوب نظر، عشرت ملک اور محسن احسان نے بہت کچھ سیکھا اور اپنی ادبی حیثیت باہر کی دنیا سے منوائی۔ دائرہ ادبیہ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ پشاور میں ہر شخص جانتا تھا کہ دائرہ ادبیہ اہل قلم کا ایک ٹھیہ ہے جو شاہ ولی قتال میں واقع ہے اور سارا سال بغیر ناغہ کے شعراء ادباء اور اہل ذوق کے لئے اپنی وا آغوش کے ساتھ ہر اک کو خوش آمدید کہتا ہے۔ برصغیر کے کونے کونے سے یہاں بڑے بڑے صاحب علم و دانش آئے مقامی اہل قلم باہر سے اہل دانش مہمانوں کی باتیں اور ان کے شہ پارے سنتے اور بہت کچھ حاصل کرتے محلہ خداداد میں میرا مکان سیاسی اور خصوصاً ادبی سرگرمیوں کا مرکز اس چھوٹے سے مکان میں میرا ڈرائینگ روم جسکی دیواریں کچی تھیں جن پر چونے کی تہیں ایک دیوار کی صورت کھڑی تھیں۔ گلی کی جانب تین در دو بستے اور ایک چھوٹا سا دروازہ تھا، جس میں سے سر جھکا کر گزرنا پڑتا تھا۔ وسط میں بجلی کا ایک بلب اور دروازے کے دائیں طرف پانچ فٹ اونچی ایک چوکور الماری رکھی تھی جس میں کوئی کام کی چیز نہ تھی۔ کرسی پر ایک منیرٹی ریڈیو پڑا ہے جو بقول خاطر ہر شخص کے ہاتھ پہچانتا ہے سوائے گھر والوں میں فارغ بخاری اور مہمانوں میں ضیاء جعفری کے۔ کمرے کی شکل سال میں دو مرتبہ روپ بدلتی۔ سردیوں میں گھاس ڈال دی جاتی اس پر قالین بچھا دیا جاتا جبکہ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگا کر کمرے کے مرکز میں کوئلوں سے دہکتی ہوئی ایک منقل رکھ دی جاتی۔ گرمیوں میں گھاس ہٹا کر قالین کے نیچے دری بچھا دی جاتی اور دروازے کے ساتھ پانچ چھ کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ سامنے دیوار کے ساتھ بقول خاطر دنیا کا پہلا صوفہ رکھ دیا جاتا۔ اس ڈرائینگ روم میں شام ہوتے ہی محفل سج جاتی۔ یہاں بڑی بڑی شخصیتیں جمع ہو جاتیں۔ شاعر، ادیب، مصور، موسیقار، صداکار، پروفیسر

ماہرین تعلیم، سرکاری افسر، صحافی، وکیل، تاجر اور سائنسدان شام پڑتے ہی ضیاء جعفری مرحوم، ڈاکٹر عبدالودود قمر، ڈاکٹر نذیر مرزا برلاس، لالہ مضطر تاتاری، یوسف رجا چشتی، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، احمد فراز، محسن احسان اور فرید عرش وقت پر پہنچ جاتے اور محفل یاران کا آغاز ہو جاتا۔ اس ڈرائینگ روم میں استاد جگر کاظمی، خان محمد عاصی، جعفر علی جعفر، قمر علی قمر سرحدی نے شعرو سخن کے ہنگامے جگائے۔ آغہ میر عباس میر کے قہوہ خانوں سے لے کر قمر علی قمر سرحدی کے ریستوران تک شعرو ادب کی پشاور میں ایک تاریخ ہے جو شاہ ولی قتال کے ڈاکٹر عبدالودود قمر کی بیٹھک سے ہوتی ہوئی محلّہ خداداد کے اس کچے کمرے تک ایک صدی پر محیط نظر آتی ہے۔ مظہر گیلانی کی النشاط ہوٹل کے بڑے ہال سے لے کر شاہی مہمان خانے اور ڈاکٹر مظہر علی خان کی یونیورسٹی کے بنگلے سے لے کر محمد شاہ برق کوہاٹی کی محفلوں تک پشاور کی ادبی زندگی نے اپنی محفلیں جمائیں۔ اس محلّہ خداداد کے چھوٹے سے ڈرائینگ روم میں احمد ندیم قاسمی، حفیظ جالندھری، قتیل شفائی اور ن۔م راشد کے قہقہے ایک عرصے تک گونجتے رہے۔ اس میں ادیب سہارنپوری کا ترنم، ظہیر کاشمیری کی تنقید، مجید لاہوری کا مزاح، انصار ناصری یاس یگانہ، چنگیزی کا کلام، حسرت موہانی کی غزلیں اور علامہ تاجور نجیب آبادی کی بزلہ سنجیاں اس کا ماحول گرماتی رہتیں۔ طاہر فاروقی، زیڈ اے بخاری، امیر حمزہ شنواری، مولانا حسرت موہانی، سردار عبدالرب نشتر، ملک خدا بخش، ساحر لدھیانوی اور سید عابد علی عابد نے اس کمرے میں کئی مرتبہ اپنی شامیں گزاریں۔ شورش کاشمیری، انور ریز، حبیب ایشیائی، چوہدری برکت علی، شوکت واسطی، شاہد احمد دہلوی، حافظ انور لدھیانوی، مسعود احمد قریشی، احمد ظفر، جمیل ملک، منظور عارف، عبدالعزیز فطرت، حفیظ اثر، فیضی موجد، ملک راحت، مقصود زاہدی اور احمد راہی نے اس کمرے میں اپنی حسین یادوں سے اسکے ماحول کو گرمایا۔ شمیم بھیروی، نیاز فتح پوری، خیام سرحدی، اختر جعفری، یعقوب نظر، مسعود انور شفقی، تاج سعید اور عشرت ملک نے اس دلستان میں وقت گزارا۔

اس ڈرائینگ روم نما کمرے میں ضیاء جعفری کی سنائی ہوئی حافظ شیرازی،

نظیری، غالب واقبال کی غزلوں کی گونج ابھی تک کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ اسکے قہوے کے دور اور رضا ہمدانی کی آلتی پالتی مار کر بیٹھنا اور اسکی تقسیم ابھی تک آنکھوں میں زندہ ہے۔ عبدالودود قمر کا جیب سے لیموں نکال کر پیالیوں میں ٹپکانا ابھی تک یاروں کو یاد ہے۔ شیخ ثناء اللہ ایڈیٹر خیبر میل کی تازہ خبریں اور ان پر تبصرہ اور پھر روکھی سوکھی کھا کر اس محفل کا اختتام اور پھر اختتام پر قصہ خوانی کا چکر ابھی تک نگاہوں میں گھومتا نظر آتا ہے۔ ضیاء جعفری تحصیل گور گھٹڑی میں رہائش پذیر ہے اسلئے دوست اسے چھوڑنے جاتے ہیں۔ گھر کے قریب پہنچ کر جعفری صاحب فرماتے ہیں یار تم لوگ اب اکیلے واپس جاؤ گے؟ ناں بھئی میں تمہیں چھوڑ کر آؤں گا اور اسطرح آدھی رات تک محلہ خداداد سے تحصیل گور گھٹڑی تک کبھی ہم ضیاء صاحب کو گھر پہنچاتے اور کبھی

وہ ہمیں واپس پہنچاتے ہیں۔

اس مختصر سے کمرے میں جوش ملیح آبادی، ایس ایس نیازی، صادق نسیم، شہزاد احمد، کشور ناہید، ڈاکٹر وزیر آغا، نیرہ آزاد، انور سدید، جمیل یوسف، نصیر ترابی، استاد قمر جلالوی، سید محمد جعفری، پروفیسر عبیداللہ درانی، پروفیسر اسماعیل سیمی، حکیم محمد سعید حمید احمد خان، حامد علی خان، سید وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، منیر نیازی، ظہیر بابر، محمد طفیل، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ابن انشاء، محمود شام، جمیل الدین عالی امجد اسلام امجد، عطاالحق قاسمی اور غلام ربانی آگرو کی پر مغز باتیں، اور غزلیں گھنگھنا رہیں ہیں۔ لالہ اخگر سرحدی اسے کوہاٹ کے شعراء اختر وارثی، آذر سرحدی، ایوب صابر، دلبر شاہ، عطوف شفیق اور محمود شوکت کو لاکر گرماتے رہے۔ شریف فاروق عبداللہ منہاس، نظیر لدھیانوی، رفیق جاوید، فائق کامران اور قدوس صہبائی نے اپنے طنز و مزاح کے پھول بکھیرے۔ پروفیسر امداد حسین بیگ نے اس کمرے میں لندن نظارے دکھائے۔ ملک مبارک علی اور ایم اے سلام نے اس گوشہ ادب میں راتیں گزاریں۔ محمود رضوی، پروفیسر طاہر فاروقی، مولانا عبدالقادر، یونس سیمی، حسین بخش کوثر، دوست محمد خان کامل، افضل بنگش، حفیظ اثر اور پروفیسر نصیر احمد زار

اسکی رونقوں کو دوبالا کیا۔
اس کمرے میں مصطفیٰ ' اشرف ' ممتاز اور مختار مستقل میزبان ہوتے ۔
اس ادبی کمرے کی ٹیم کے ممتاز ڈرامہ نگار قمر سرحدی کی سربراہی میں پرسٹن ولف روورز اسکاؤٹس کے تعاون سے مشن ہسپتال کے سامنے ہال میں "ناکام آرزو" " قتل " اور " انصاف " جیسے ڈرامے بھی پیش کیئے گئے ۔ اس کمرے والوں نے علامہ اقبال کو بھی دعوت دی اور گورنمنٹ ہائی سکول نمبرا پشاور صدر میں کہ جسے اسوقت فرنٹیئر ہائی سکول کہتے تھے وسیع و عریض سبزہ زار پر ایک شاندار مشاعرہ بھی منعقد کیا۔
پھر یہ کمرہ جب میں نے گل بہار کالونی میں نیا مکان بنایا تو محلہ خداداد سے اُٹھ کر وہاں آباد ہو گیا۔ اس گھر میں ایک چمن بھی تھا جہاں اسی کمرے کی آرٹ سوسائٹی نے آغا حشر کاشمیری کا ڈرامہ " خواب ہستی " مختار علی نیر کی زیر ہدایت پیش کیا جسکے میوزک ڈائریکٹر اقبال اعوان تھے۔ پھر ہماری یہ چھوٹی سی اکیڈمی قدیم دور کے ملک الشعراء ملک ناصر علی خان ' سید گوہر علی شاہ گوہر' میاں محمد خیال ' قاضی محمد عمر قضا روحی' فضل الٰہی ندیم' بیدل ' میر ولی اللہ' محمود الحسن کوکب اور شہزادہ ایاز کے دور سے نکل کر جدید دور میں داخل ہوئی۔ کئی نئے شعراء اور نوجوانوں نے اس کام کو سنبھالا اور آج پرتو روہیلہ ' جوہر میر' ڈاکٹر ظہور احمد اعوان' غلام محمد قاصر' فقیر حسین ساحر' قاسم حسرت' یونس قیاسی' مشتاق شباب ' عزیز اعجاز ' نذیر تبسم ' اعجاز راہی ' ساحر مصطفائی' ناصر علی سید ' ناز سیٹھی اور مختار علی نیرّ کے علاوہ کئی دوسرے بھرپور عزم رکھنے والوں اور اچھا لکھنے والوں کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا آج بھی کمرہ آباد ہے۔ بس اپنی عادت کے مطابق یہ کمرہ اپنی جگہ سے منتقل ہوتا رہتا ہے۔
بھانہ ماڑی میں میرا اور رضا کا الگ الگ مطب تھا۔ مرحوم اشرف علی میرا اسسٹنٹ تھا اور مختار علی نیرّ رضا ہمدانی کا۔ اشرف جب نہ ہوتا تو مصطفیٰ شاہ میرا بھتیجا میرا ہاتھ بٹاتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب مصطفیٰ شاہ ملازم ہو گئے اور اشرف علی کو ٹی بی کے موذی مرض نے آن گھیرا۔ مجھے ایک دن اچانک چھاپہ مار کر اپنے ادبی کمرے سے گرفتار کر لیا گیا۔ اب مختار علی نیرّ نے میری دکان سنبھالی۔ ساڑھے آٹھ ماہ کے بعد رہائی ہوئی تو مختار علی نیرّ نے بتایا کہ ماموں آپ جب قید تھے تو

یہاں یہ مشہور ہو گیا کہ آپ سے کوئی مریض مر گیا ہے۔ لہٰذا آپ کو حکومت نے قید کر دیا ہے۔ اگرچہ دوست احباب اسکی تردید کرتے رہے لیکن دیہاتی لوگوں کو سمجھانا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر میں نے مطب مختار کے حوالے کیا اور پشاور سے پندرہ میل دور ببی کے گاؤں میں مطب کھول لیا۔ ایک سال وہاں پریکٹس کی لیکن مزا نہ آیا اور میں نے واپس اپنا مطب سنبھال لیا۔

مطب کی آمدن سے میں نے رقم بچا کر ایک تانگہ خرید لیا جس میں میں اور رضا مطب جاتے اور پھر یہ تانگہ کابلی سے بھانہ ماڑی کے روٹ پر کام شروع کر دیتا۔ تانگے بازی کے شوق میں جب مزہ آیا تو میں دو ہی سال میں اسی منافع سے آٹھ تانگے لے لئے جو کابلی سے صدر اور کابلی سے بھانہ ماڑی کے درمیان چلنے لگے اور یوں اچھی خاصی آمدن کا ذریعہ بن گیا۔ پشاور میں تانگے والے چار کی جگہ آٹھ آٹھ آدمی لاد کر تانگہ چلاتے لیکن میرا کوچوان کو حکم تھا کہ بلا سے آمدن کم ہو لیکن چار سے زیادہ سواریاں نہیں بٹھانی۔ میرے تانگوں کا یہ اصول اتنا مشہور ہوا کہ جب کابلی کے اڈے سے چار سواریوں کے پورے ہونے پر تانگہ چل پڑتا تو سواریاں خوش ہو کر کہتیں "شاہ جی دا تانگہ ہوسی" اشرف علی سائیکل پر سوار ہو کر دن میں دو مرتبہ ان روٹوں کو چیک کرتا جس پر یہ تانگے چلتے تھے کہ اگر کوچوان خلاف ورزی کرے تو اسے پکڑا جا سکے۔ اگر کوئی کوچوان پکڑا جاتا تو اسکی فوراً" چھٹی کر دی جاتی۔

ایک دن کسی کوچوان کو معافی دلانے محلہ نوبجوڑی کے مستری تاج محمد میرے پاس آئے۔ مستری تاج محمد لکڑی کے مستری تھے اور اپنے فن میں یکتا۔ لوگ کہتے تھے۔اس کے ہاتھوں میں جا کر لکڑی باتیں کرنے لگتی ہے۔ لکڑی کی تراش خراش کچھ اس قسم کی کرتے تھے کہ محسوس ہوتا لکڑی پیدا ہی اسطرح ہوئی ہے۔ ایسے ہنرمند صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس دور میں سب سے مہنگے مستری تھے۔ اور لوگ ان سے اپنے کام کیلئے مہینوں پہلے تاریخ کا تعین کرتے تھے۔ مگر یہاں کچھ اور ہی معاملہ تھا۔ مستری تاج محمد میرے بزرگوں کے مقلدین میں سے تھے لہٰذا آئندہ احتیاط کے وعدے پر مسئلہ طے ہو گیا۔ باتوں باتوں میں تجارت کے حوالے سے مستری تاج محمد نے

مجھے کو شمعیں بنانے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی کہا کہ مشین کا آئیڈیا میرے ذہن میں ہے ۔ بس پھر کیا تھا موم کا آرڈر دے دیا گیا اور مشینوں پر کام کرتے اور گھر والے شموں کو بنڈلوں میں ڈال کر پیٹیاں تیار کرتے۔ مستری تاج محمد نے یہ مشینیں صرف چند تختوں اور ٹین کی چند نلیوں سے بنائی تھیں۔ کثرت استعمال سے روزانہ کبھی نلیوں کے ٹانکے کھل جاتے کبھی مشین جام ہو جاتی۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ لہٰذا مستری تاج محمد کی ڈیوٹی لگ گئی کہ کچھ بھی ہو آپ نے ایک گھنٹہ روزانہ آنا ہے کہ اگر کوئی خرابی ہو تو دور کر دی جائے ۔ ادھر مستری تاج محمد اپنے اس آئیڈیئے کے کامیاب ہونے پر پھولے نہیں سماتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میرے اس فن کا تماشہ عام ہو لہٰذا وہ شوق سے روزانہ آتا اور مشینوں کی دیکھ بھال کرتا۔ اسکے اسے ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملتے۔

شمعوں کا کاروبار تانگوں سے بھی زیادہ منافع بخش ثابت ہوا۔ موم کی تجارت چھوٹی موٹی ہی سہی پشاور میں ایس فضل اینڈ کمپنی کے بعد ہم ہی نے شروع کی۔ شمعوں کا پیکٹ زرد رنگ کا ہوتا جس میں ۳۲ شمعیں ہوتیں۔ کارخانے کا نام تھا" وی موم بتی " کبھی کبھی پیٹیاں بھرتے ہوئے ترنگ میں آکر نعرہ لگاتے۔ " رضو گل..... وی موم بتی۔ یعنی وکٹری' روشنی کی فتح' جو ہمارے چراغ سے چراغ جلائینگے' ان کے ذہن روشن ہونگے" اور رضو گل موم بتی سائز میں کاٹتے کاٹتے کہتے۔

" چل یار کم مکا۔ سویلے دکان تے بی جانڑیے"

زرد رنگ کے اس پیکٹ کے دونوں طرف جلی حروف میں لکھا ہوتا۔

" شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک "

صوبہ سرحد کے دیہات کے علاوہ ہماری شمع افغانستان بھی سپلائی ہونے لگی۔ اور اتنی مقبول ہوئی کہ دیہاں سے تاجر آکر دکانداروں سے کہتے ۔ وہ موم بتی دو جو ہر حالت میں صبح تک جلتی رہتی ہے ۔ کسی وقت یوں بھی ہوتا کہ میرے محلہ خداداد میں بالا خانے والی دکان کے بالا خانے میں ادبی محفل جمی ہوتی ۔ اس دکان کے تہہ خانے میں شمعیں بن رہی ہوتیں۔ دکان کے سامنے شاہی کھٹے کے کنارے کوچوان کھڑے ہوتے اور دن بھر مطب کا کاروبار ہوتا۔ اور سخت جانوں کی جوڑی فارغ رضا ہر جگہ حاضر ہوتے ۔ پھر ایک بھونچال آتا میں کسی وجہ سے انڈر گراونڈ ہوتا یا نظر بند یا پھر کسی ملک کا دورہ پڑتا اور یہ سارا ماحول درہم برہم ہو جاتا۔ سب لوگ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ

جاتے۔ شاعر ادیبوں کے دسترخوان ٹھنڈے پڑ جاتے اور فارغ اپنے اصولوں کی جنگ لڑتے ہوئے نظر آتے۔

کوئی یہ غالب مرحوم سے کہدے فارغ
میرے گھر آیا ہے سیلاب بلا تیرے بعد

بلا سے شہر بدر ہو گیا اگر فارغ
جہاں گیا نئے سورج وہاں اگالے گا

پھر کچھ مدت کے بعد میں منظر عام پر آتا۔ باقی ماندہ بکھری ہوئی متاع کو اکٹھا کر کے نئے حوصلے اور عزم سے کام میں جٹ جاتا۔ مشینیں جام ہو چکی ہوتیں' تانگے والے غائب ہوتے' موم بتیاں گرمی سے ٹیڑی میڑی ہو گئی ہوتیں' موم ختم' کاریگر غائب' صرف مستری تاج محمد' اشرف' ممتاز اور مختار بھلا کیا کر سکتے تھے۔ آخر میں نے کوچوان کو شہر میں ڈھونڈ نکالا۔ تانگے گھوڑیاں ان کے ذمے ڈال دیں۔ اونی پونی وصولی کر کے حسب معمول قرض اٹھا کر قصہ خوانی بازار میں ایک شاندار کتب خانہ کھولا۔ جسکا نام تھا "نیا مکتبہ"۔ اس میں ادبی کتب کا سیلز مین تاج تھا اور سٹیشنری کا شعبہ مختار کے حوالے تھا۔ یہ مکتبہ چلا اور خوب چلا۔ پشاور کے حلقہ احباب کو ایک اور موقع مل گیا ادبی پیاس بجھانے کا۔ اتنے گاہک نہ ہوتے جتنے شاعر ادیب جو ہر نئی آئی ہوئی کتاب کو چاٹ رہے ہوتے۔ اس مکتبہ نے نئی نسل کو کتابیں خریدنے کی طرف راغب کرانے کے حوالے سے خوب کردار ادا کیا۔ یہی دور تھا پشاور سے میری اور رضا ہمدانی کی ادارت میں شائع ہونے والے علمی ادبی ترقی پسند رسالہ "سنگ میل" کے عروج کا۔ جس نے صوبہ سرحد کی سنگلاخ سرزمین پر ترقی پسند ادب کے جھنڈے گاڑھے اور یہاں کے پشتو ادب کو برصغیر میں روشناس کرایا۔ خاطر غزنوی بھی اس رسالے سے منسلک تھے۔ جب بھی رسالہ شائع ہوتا ادبی کمرے میں اسکا بہت بڑا ڈھیر لگ جاتا۔ ممتاز علی اختر جسکا نام سنگ میل کے منیجر کی حیثیت سے کئی اعلانات میں شائع ہوا۔ وہ اور مختار پتے لکھتے اور رسالہ ہند و پاک میں پھیل جاتا اور ۱۹۵۴ء میں جب اس رسالے پر

شہروں کے علاوہ راولپنڈی اور لاہور تک یہ رسالہ اپنی کمروں سے پیٹیوں کے ساتھ باندھ کر پہنچایا۔ سنگ میل کی پابندی اپنے ساتھ پھر ایک بھونچال لیکر آئی ۔ میں پھر معتوب ہو گیا۔ " فرشتے " پیچھا کرنے لگے۔ گرفتاری کے بہانے سوچے جانے لگے۔ نیا مکتبہ اپنی رونقیں کھو بیٹھا۔ انہی دنوں ایک سرکاری ادارے نے حکومت کے اشارے پر پانچ چھ قسم کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپوائیں۔ میں نے نہ صرف اپنا سارا سرمایہ بلکہ قرض بھی اٹھا کر ان کتابوں میں لگا دیا کہ ماضی تو ترستے گزرا شاید مستقبل میں کسر نکل جائے ۔ مگر معتوب کی کتابیں ؟ توبہ توبہ ۔ یہ کنٹریکٹ یکطرفہ طور پر کینسل کر دیا گیا۔ مجھے یاد ہے جب ہم نے کتابوں کے ریڑے بھر بھر کر ردی والوں کے حوالے کئے۔ تو ساری ٹیم رو رہی تھی ۔ اور " فرشتے " ہمارا تماشہ کر رہے تھے ۔ کیا کرتے ہم اپنے آپ کو سنبھالتے یا اس ادارے کے ساتھ قانونی چارہ جوئی کرتے ۔ اور پھر ایسا کرتے بھی تو کیا ہوتا۔ خوئے بد را بہانہ بسیار۔ ایک الزام ہی بہت تھا کہ میں کمیونسٹ ہوں ۔ یہ نقصان نیا مکتبہ بک جانے کے بعد بھی پورا نہ ہو سکا۔ قرض کا ایک پہاڑ سر پر اٹھائے میں انڈر گراونڈ تھا۔ اتنی محنت مشقت اور دن رات ایک کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر میں اسی مقام پر کھڑا دکھائی دیا کہ جہاں سے چلا تھا۔

اگرچہ صوبہ سرحد میں میں نے اردو زبان و ادب کے بعد سب سے زیادہ کام پشتو کیلئے کیا۔ اور پشتو زبان کو پورے برصغیر میں بلکہ تراجم کے ذریعے پوری دنیا میں متعارف کرایا جسکے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔ لیکن ہندکو زبان میں بھی ہمارا کام کچھ کم نہ تھا " ادبیات سرحد " میں تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہندکو زبان کا لسانی جائزہ پیش کر کے اپنی مادری زبان کا بھی حق ادا کیا۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہونے والی کتاب " پاکستان کا لسانی جائزہ " میں ہندکو زبان کا علیحدہ حصہ قائم کروا کر ہندکو زبان وادب کے حوالے سے بڑا معلومات افزاء باب تحریر کیا۔ پھر رضا سے مل کر ہندکو نظم کے حوالے سے ایسا تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا جس نے اس زبان پر صدیوں سے طاری جمود کو توڑ کر رکھ دیا۔ ہماری جدیدیت اور ترقی پسندی نے ہندکو نظم کو

چار بیتہ اور حرفی سے نکل کر غزل ' نظم ' رباعی ' قطعہ کی ڈگر پر ڈال دیا۔ اگرچہ قدیم حرفی گو شعراء نے ہندکو زبان میں اس روش کی خاصی مخالفت بھی کی اور کسی حد تک ماحول نے تخی کی صورت بھی اختیار کی مگر نئی نسل نے ہندکو زبان میں غزل نظم وغیرہ کہنا شروع کر ہی دیا۔ اس نئی نسل کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کیلئے ۱۹۶۱ء میں " ہندکو رائٹرز سوسائٹی " کے نام سے ایک ادارہ قائم ہو جس کا پہلا صدر مجھے چنا گیا۔ اسکی تنقیدی نشستوں نے ہندکو نظم میں انقلاب برپا کر دیا۔ ادب برائے زندگی کے جدید رجحانات کو اصول بنا کر اس ادارے نے بڑا کام کیا۔ ۱۹۶۳ء میں اس ادارے نے جدید شاعری کے نمائندہ شعراء کے کلام کا مجموعہ شائع کیا جسے میں نے ترتیب دیا۔ " نویاں راواں " نے ہندکو زبان کے جدید شعراء کی حوصلہ افزائی کچھ اس طریقے سے انجام دی کہ دیکھتے ہی دیکھتے نئی روش پر لکھنے اور سوچنے والوں کا بہت بڑا قافلہ بن گیا۔ اور ہندکو رائٹرز سوسائٹی کے اجلاس ماہنامہ سے لے کر ہفتہ واری پر آگئے ۔ اس سوسائٹی کے اکثر اجلاس محلہ حداداد میں مختار علی نیرؔ کے مکان ' یکہ توت میں ناز درانی کے مکان اور چاچا یونس کی گلی میں انور خواجہ کے مکان پر ہوتے۔ ایک ایسی ہوا چلی کہ بہت سے اردو شعراء نے بھی ہندکو میں غزل ' نظم ' قطعہ ' رباعی ' گیت اور آزاد نظمیں کہنا شروع کر دیں۔ ہندکو زبان کی یہ پہلی انجمن تھی جس میں شعراء کے کلام پر تنقیدی نشستیں ہوتیں اور نئے اقدار کے حوالے سے شعراء کا کلام پرکھا جاتا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوسائٹی نے ہندکو زبان کو معیاری لکھنے والوں کی بہت بڑی کھیپ دی جس میں میرا اور رضا کے علاوہ مختار علی نیرؔ ' نازدرانی ' آتش فہمید مرحوم ' خادم ملک مرحوم ' خالد خواجہ ' سعید گیلانی ' تاج سعید ' خاطر غزنوی ' مضمر تاتاری اور جوہر میر کے نام قابل ذکر ہیں ۔ ہندکو رائٹرز سوسائٹی کا نام ہندکو نظم میں جدیدیت کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ہندکو زبان میں انہیں خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت پاکستان کیطرف سے مجھے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازہ گیا۔

مجید شاہد ' عبدالودود قمر ' ضیاء جعفری ' نذیر مرزا برلاس ' رضا ہمدانی ' فرید وتی ۔
احمد فراز ' خاطر غزنوی ' فارغ بخاری ' مضطر تاتاری ' محسن احسان ۔ (کمپنی باغ ۱۹۴۹ء)

خاطر غزنوی اور رضا ہمدانی کے ساتھ
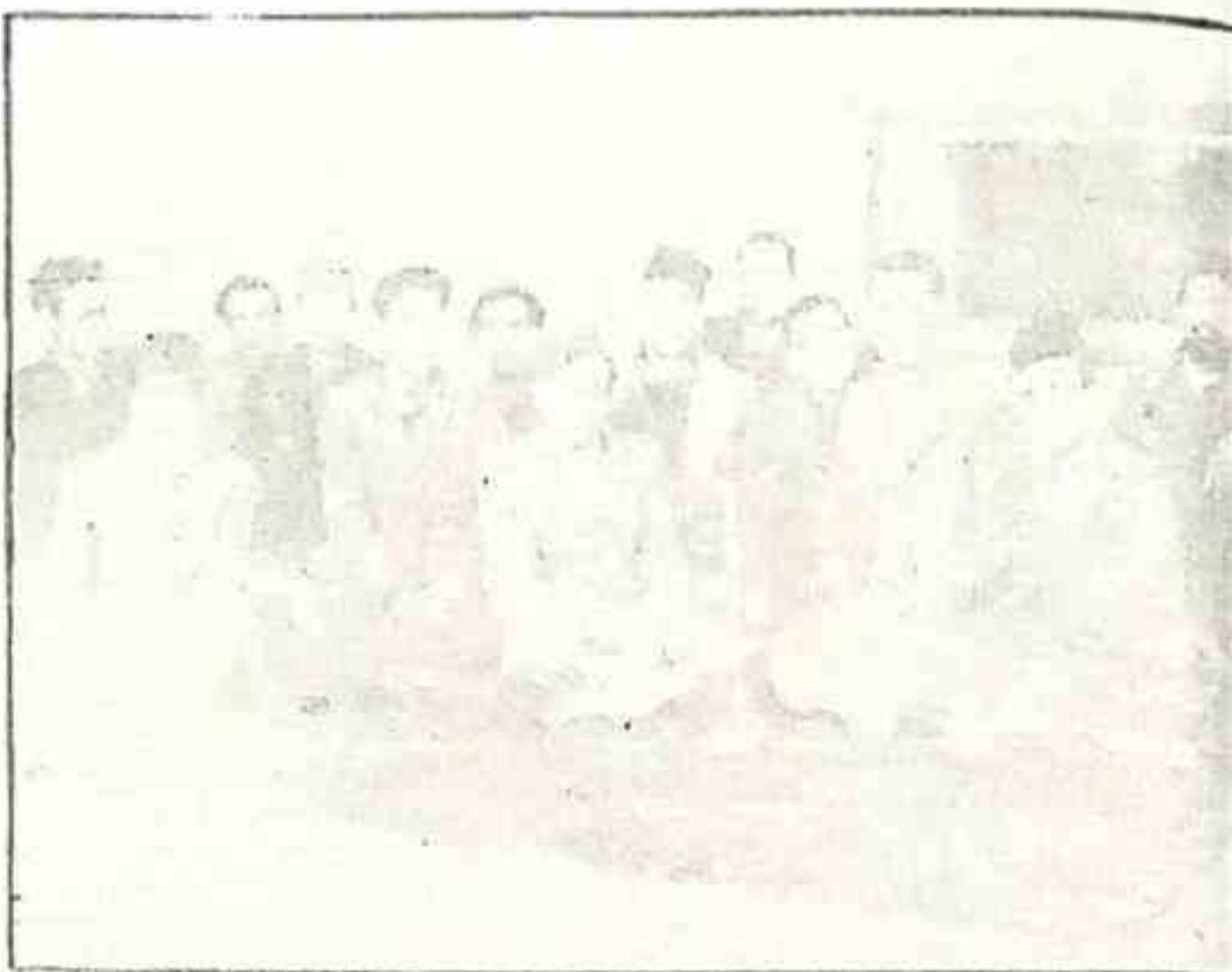
ی محمد عمر قضاء روحی ' رضا ہمدانی ' ضیاء جعفری ' فارغ بخاری ' نذیر مرزا برلاس ' مجید شاہد
جمیل راز ' افسر لدھیانوی ' خاطر غزنوی ' نظیر لدھیانوی (ریڈیو پاکستان مشاعرہ ۱۹۴۸ء)

۹۱

دوستوں کے ہمراہ سیر پر

(اوپر سے) عبدالودود قمر، سید ضیاء جعفری، نذیر مرزا برلاس، فرید عرش، مجید شاہد، رضا ہمدانی، تسنیم سرحدی، مضطر تاتاری، فارغ بخاری اور محسن احسان

دوستوں کے ساتھ سیر کے موقع پر۔
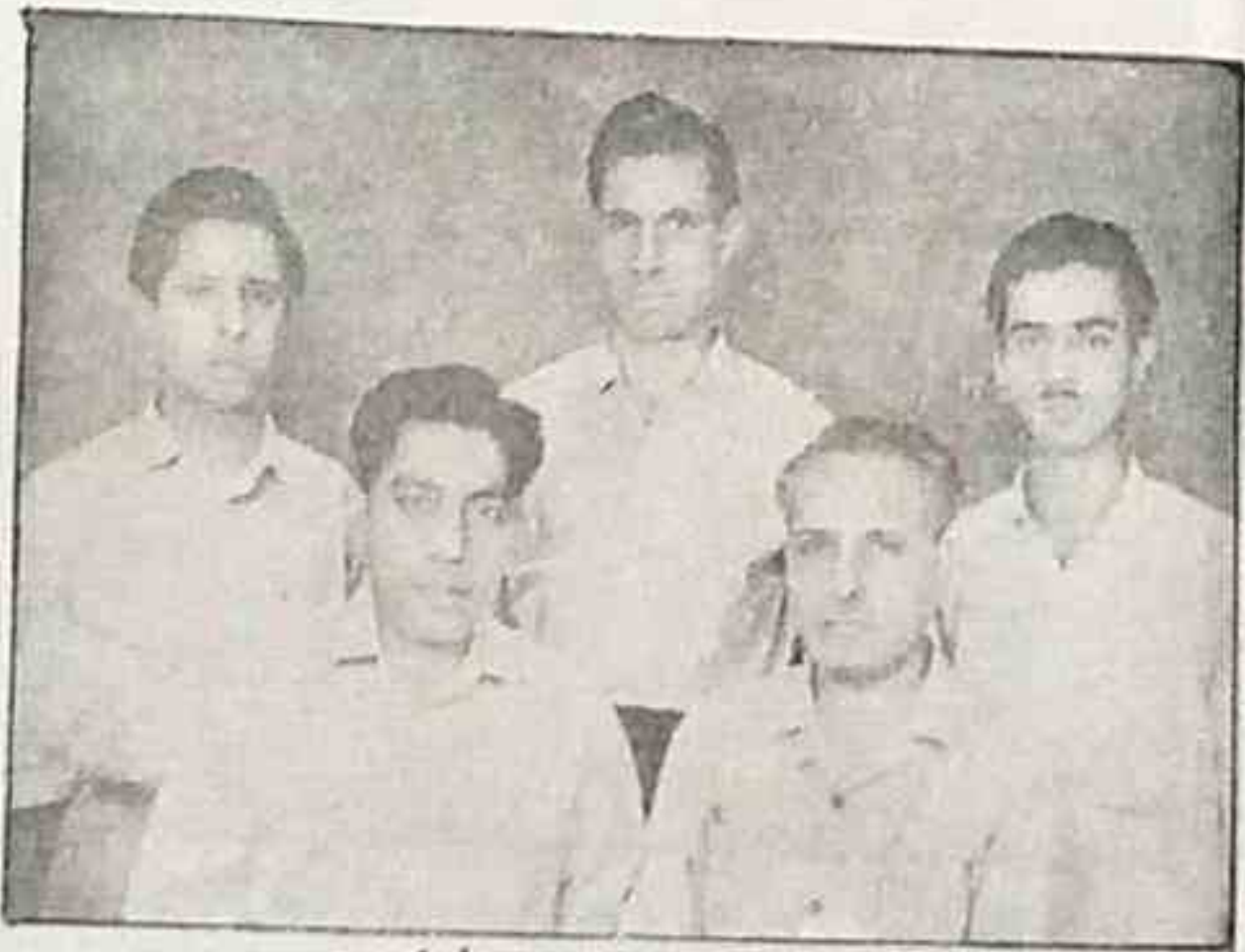
تاج سعید، جوہر میر اور رضا ہمدانی کے ساتھ

کرسی پر فارغ بخاری، فیض احمد فیض، اجمل خٹک۔ ایستادہ۔ ارباب سکندر، افضل بنگش۔

ولی محمد طوفان ، فارغ بخاری ، اجمل خٹک ، خان عبد الغفار خان ۔ ۱۹۵۳ء کی ایک یادگار تصویر ۔
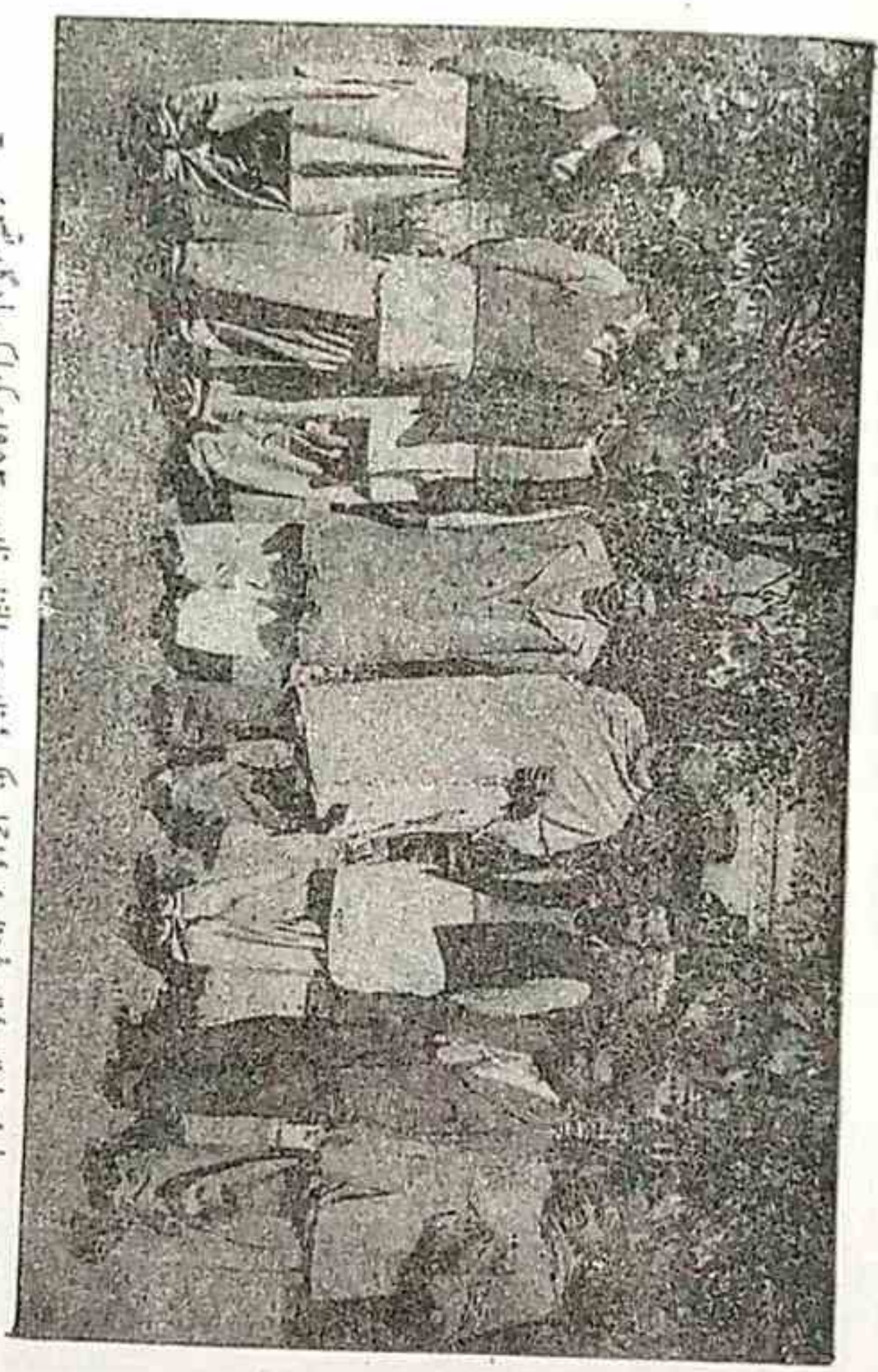
مظہر تاتاری، شاہد ہانی، حاجی لق لق، انور گرداسپوری، خاطر غزنوی، فارغ بخاری
ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ایک مشاعرہ میں احباب کے ساتھ۔

موجد، احمد ندیم قاسمی اور رضا ہمدانی کے ساتھ۔

ایک یادگار تصویر، شہزاد احمد، جمیل الدین عالی اور احمد ندیم قاسمی نمایاں ہیں۔

ولی محمد طوفان، لطیف وہمی، فارغ بخاری، دوست محمد کامل، امیر حمزہ شینواری، ...
، کاکاجی صنوبر حسین، اجمل خٹک، افضل بنگش، سیف الرحمن سلیم، ہمیش خلیل، قلندر مومند۔
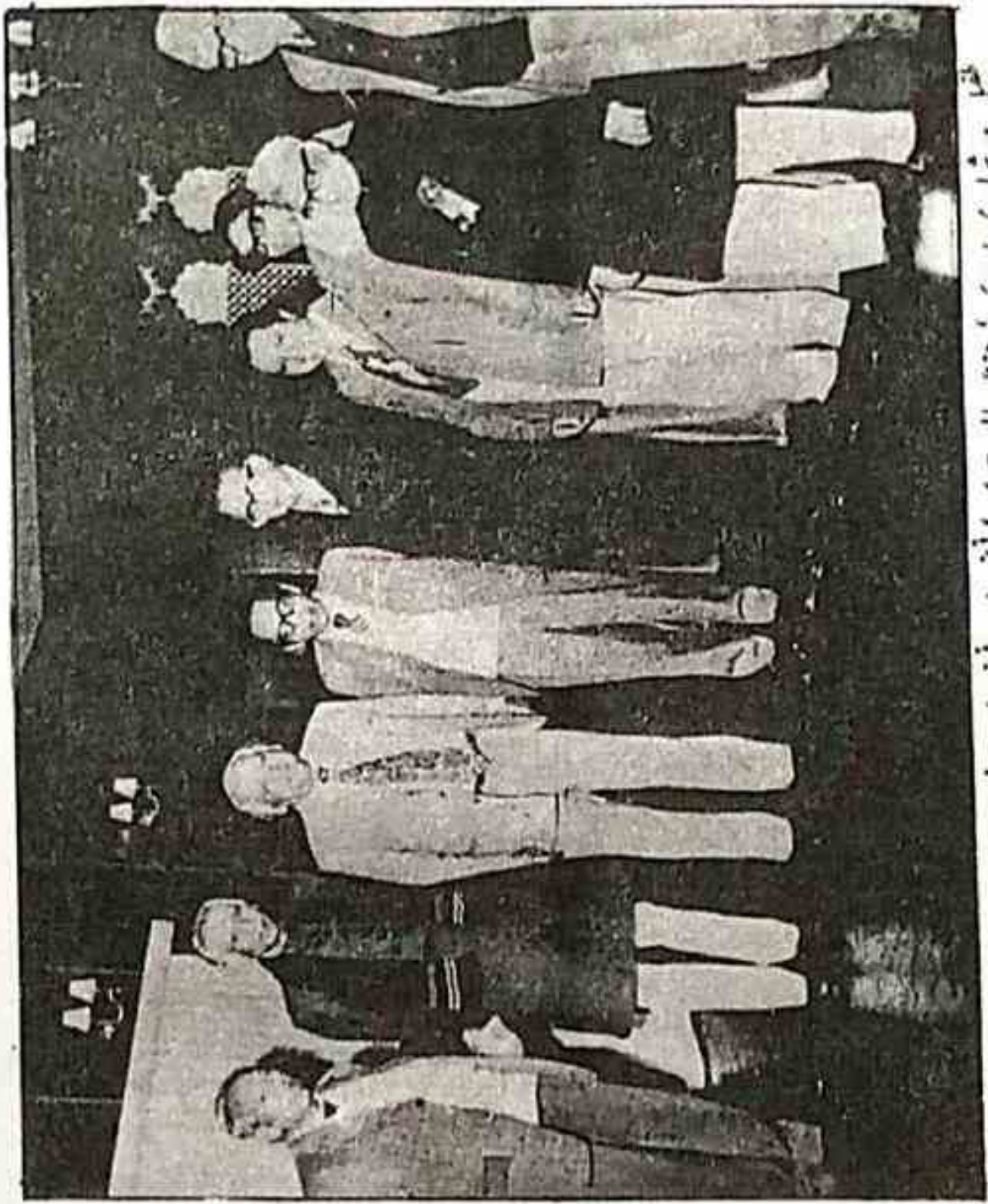
طفیل ہوشیارپوری، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، فارغ بخاری، احمد ندیم قاسمی، تاج سعید اور دیگر شخصیات کے ساتھ۔

قید و بند

چوبیس جولائی کی گرم دوپہر تھی - آج تمام دوستوں نے حسب معمول کی طرح رات کو میری بیٹھک میں چوکڑی جمائی تھی - دن بھر لو چلنے سے فضا میں حدت کم ہوگئی تھی - آسمان پر کہیں کہیں دودھیا رنگ کے بادل منڈلا رہے تھے رات نشست جمی اور ہلکی پھلکے لطیفوں سے لے کر دقیق مسائل تک زیر بحث آتے رہے - رات ساڑھے بارہ بجے محفل برخواست ہوئی - احباب کو رخصت کرکے بستر میں پہنچا اور حسب عادت کچھ لکھنا چاہا لیکن موڈ نہیں بن رہا تھا میں نے صرف ایک شعر لکھا -

گونجی ہے فغاں بن کے وہ زنجیر کی جھنکار
آئی ہے اسیروں کو تری یاد قفس میں

اور میری آنکھ لگ گئی - کہ نانی اماں کی گھبرائی ہوئی آواز آئی' فارغ نیچے پولیس والے دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں " میں چونک کر اٹھا' کھڑکی سے جھانک کر دیکھا گلی میں حد نظر تک پولیس ہی پولیس تھی' عین اسی وقت گھنٹہ گھر نے بارہ بجائے - - - نیچے جا کر دروازہ کھولا ایک ایس پی اور ایک سب انسپکٹر معہ پوری مسلح گارڈ کے موجود تھے' سب انسپکٹر نے پوچھا -

" فارغ بخاری آپ ہی کا نام ہے "

" جی ہاں ! فرمایئے کیا حکم ہے " -

مکان کی تلاشی لینی ہے " اور یہ کہتے ہی مجھے مہلت دیئے بغیر ہی اندر گھس آئے' تلاشی پورے اڑھائی گھنٹوں تک جاری رہی - ایک ایک کونہ' ایک

ایک گوشے، ایک ایک طاق میں کمیونزم کو ڈھونڈا جا رہا تھا، لیکن وہ کہیں نہ ملا۔
۔۔ لائبریری میں پہنچ کر کتابوں سے بھری ہوئی دس قد آدم الماریاں دیکھ کر انسپکٹر نے مڑ کر مجھے حیرت سے دیکھا اور مسکرا کر کہا، آپ کی تو بہت بڑی لائبریری ہے "۔۔۔ میں نے دل میں کہا، واقعی بڑا بے شرم ہوں، پاکستان میں رہ کر اتنی بڑی لائبریری بناتا ہوں، حکومت سے نہیں ڈرتا، قانون سے نہیں ڈرتا، خدا رسول سے نہیں ڈرتا۔۔۔ الماریوں سے تمام کتابیں نکال کر فرش پر الٹ دی گئیں، ایک ایک کتاب کو خوب چھان پھٹک کر دیکھا گیا، وہاں کیا تھا، ادب ادب، ادب۔۔۔ لیکن انہیں اپنی کچھ کار گزاری تو دکھانا تھی، سب سے پہلے میری نظموں کی بیاض اٹھا کر قبضہ میں کر لی گئی، اس کے بعد آٹھ دس کتابیں جو روسی ادب کے متعلق تھیں تحویل میں لے لی گئیں۔۔۔۔ میں سوچنے لگا ہزار کتابوں کے سٹاک میں سو دو سو تو اسلامی ہوں گی، اگر اتنی ساری اسلامی کتب سے میں مسلمان نہیں ہو سکتا تو آٹھ دس روسی کتب سے کیسے کافر بن گیا۔۔۔ تلاشی جاری تھی۔۔۔۔ سب کچھ دیکھ چکے تو بچوں کے بستے ٹٹولنے لگے۔ مجھے اس حرکت سے سخت دھچکا لگا نارمل رہنے کی شعوری کوشش کے باوجود خون کھولنے لگا، میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا " جناب یہ بچوں کے بستے ہیں ان میں کوئی ایٹم بم نہیں ہے "۔ " اچھا بچوں کے بستے ہیں چلو جانے دو " سب انسپکٹر کھسیانا ہو کر بولا۔۔۔۔ لیکن ابھی کوٹھا دیکھنا باقی ہے۔۔۔۔ کوٹھے پر سوائے چارپائیوں کے کچھ نہیں، میں نے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ کسی طرح نہ مانے۔۔۔ کوٹھے پر جا کر باورچی خانے کو ٹٹولا، غسل خانے اور پاخانے میں جھانکا اور نادم ہو کر نیچے آئے۔ نیچے آکر انہوں نے ان کتابوں کی فہرست بنائی جو ساتھ لے جا رہے تھے۔۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ محلہ کے لوگ مجھے حیرت و شکوک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ عورتیں اور بچے آپس میں

سرگوشیاں کر رہے تھے - محتاط قسم کے پنشن یافتہ ہمسائے مارے دہشت کے بستروں میں دبک گئے تھے -

فہرست بن چکی تو حکم ملا ہم مطب کی تلاشی بھی لیں گے --- میں دکان کی چابیاں لینے گیا تو بچوں کی ہچکی بندھی ہوئی تھی' بیوی کی طرف دیکھا اس نے دوپٹے میں منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی - میں نے سمجھایا گھبرانے کی ضرورت نہیں' انہیں رخصت کر کے ابھی آرہا ہوں --- باہر نکلا پولیس کی لاری تیار کھڑی تھی' میں نے گھر پر نگاہ ڈالنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہاں کتنی ہی آنسوؤں بھری آنکھیں تعاقب کر رہی تھیں -

مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ معاملہ تلاشی تک ہی محدود ہے یا گرفتاری بھی عمل میں آنی ہے ---- لاری اڑتی ہوئی جا رہی تھی' کافی رات جا چکی تھی' قصہ خوانی کا با رونق اور زندگی افروز بازار سنسان پڑا تھا' دکانوں کے تختوں اور فٹ پاتھ کی سلوں پر ننگ دھڑنگ مزدور اور بھکاری محو خواب تھے ---- آسمان پر سیاہ بادلوں نے پورا تسلط جما لیا تھا - چاند کی روپہلی کشتی ڈوب چکی تھی - ستاروں کا امید کی کرنوں کی طرح کہیں نام و نشان نظر نہ آتا تھا --- لاری کابلی تھانے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی گزر گئی' لیڈی گرفتھ سکول آئی اور گزر گئی - ڈبگری دروازہ گزر گیا - میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا - عجیب بات یہ تھی کہ ہمیشہ اس سانحے کے تصور سے جو خوف و ہراس محسوس ہوتا تھا' اس وقت اس کا شائبہ تک موجود نہ تھا - یوں لگتا جیسے موہوم دہشت کی بہت بڑی سل سینے سے اتر گئی ہے' میں نے اطمینان کا سانس لیا - سگریٹ سلگایا اور انسپکٹر صاحب سے پوچھا' گرفتاری کا تو مجھے یقین ہوچکا ہے - اب صرف اتنا بتا دیجئے کہ مجھے لے جایئے گا کہاں؟" میں اس کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتا - اس نے نہایت کرخت لہجے میں کہا --- میں نے نفرت سے منہ موڑ لیا اور نفرت کے اس جذبے کو

سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے کر دھوئیں کے مرغولوں میں تحلیل کرنے لگا --
-- لاری دکان پر پہنچ کر ٹھہر گئی - میں نے اتر کر مطب کھولا - ا --- انہوں نے
الماریوں کا جائزہ لینا شروع کیا - وہاں دوائیوں کے سوا کیا تھا ---- میں نے
انہیں بلا کر کتابوں سے بھری ہوئی الماری دکھائی - جس میں ہمارے مکتبہ کی
کتابوں کا سٹاک تھا - کتابوں کا یہ ذخیرہ دیکھ کر ایک دفعہ پھر انسپکٹر صاحب کا منہ
کھلے کا کھلا رہ گیا اور جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ یہ میری ہی لکھی ہوئی ہیں تو
بڑے تعجب سے بولا " اوہو آپ اتنی کتابوں کے مصنف ہیں " ---- " جی ہاں
بدقسمتی سے " میں نے بد دلی سے جواب دیا - کتابیں دیکھنے کے بعد وہ ادھر ادھر
جھانک رہے تھے کہ اچانک میز پر نظر پڑی اور جب میز کی دراز کھولنے لگے تو
میرا دل دھک سے رہ گیا اس میں میری نومولود کتاب ادبیات سرحد (اردو) کا
مسودہ اور کتابت شدہ کاپیاں پڑی تھیں - یہ کتاب میری مدتوں کی کاوش کا نتیجہ
تھی - جسے اسی خدشہ کے پیش نظر میں ایک عرصہ سے کونے کھدروں میں
چھپائے پھرتا تھا --- آج ہی یہ مسودہ اور کاپیاں بھائی کے گھر سے پڑھنے کے
لئے منگوائیں - کیا خبر تھی کہ آج ہی یہ افتاد پڑے گی --- انسپکٹر صاحب نے
کتاب کا مسودہ اٹھایا اور نہایت غور سے دیکھنے لگا ---- میرا دل زور زور سے
دھڑکنے لگا ---- اگر یہ بے ضرر سی خالص ادبی چیز کسی غلطی کی بناء پر یہ اپنے
ساتھ لے گئے تو کیا ہوگا - میری حالت عجیب ہو رہی تھی - اضطراب چھپائے نہ
چھپتا تھا - وہ تو خیریت گزری جو کسی نے میری طرف دیکھا نہیں - ورنہ میری بد
حواسی ہی ان کے شکوک مین اضافہ کرنے کو کافی تھی - میری نظریں انسپکٹر کے
چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں، اس کی حرکات کے ساتھ ساتھ میری تشویش بڑھ
رہی تھی - ذہن سے اپنی تلاشی، گرفتاری اور قید و بند کی صعوبتوں کا خیال یکسر
کافور ہوگیا - اس وقت مجھے صرف ایک ہی فکر تھی ---- نہ جانے کیا ہونے

والا ہے --- انسپکٹر کی ہاں یا نہیں پر میری قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا --- جی چاہتا تھا کہ اپنی تمام خود داری' وقار اور پندار کو بالائے طاق رکھ کر انسپکٹر سے التجا کروں کہ خدا کے لئے اس مسودے کو رہنے دو - یہ تمہارے کسی کام کا نہیں' یہ خالص ادبی چیز ہے' یہ حکومت کے خلاف نہیں' برسر اقتدار لوگوں کے خلاف نہیں' کسی کے خلاف نہیں' اس میں اشتراکیت نہیں کیمونزم نہیں' انار کزم نہیں' یہ تو یہاں کے بد نصیب شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ ہے' سرحد کی ادبی تاریخ ہے' علمی اور تحقیقی کتاب ہے --- اسے تم نے لے جا کر کہیں ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تو مجھ پر ظلم ہوگا' سرحد پر ظلم ہوگا' ادب پر ظلم ہوگا --- لیکن وہاں ان باتوں کو سمجھنے والا کون تھا ---- میں بے حس و حرکت ٹکٹکی باندھے انسپکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا --- اس نے مسودہ بند کر کے میز پر رکھ دیا - سب انسپکٹر نے پوچھا اسے ساتھ لے جانا ہے ---- میرا خون خشک ہوگیا - پاؤں لڑکھڑانے لگے - میں نے کرسی کا سہارا لے کر اپنے آپ کو بمشکل گرنے سے بچایا --- انسپکٹر بولا --- نہیں یہ تو کوئی ناول سا ہے' میں بمشکل ہنسی ضبط کرسکا --- ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا' جان میں جان آئی' اتنی خوشی ہوئی کہ گرفتاری کا احساس تک نہ رہا -

لاری پھر ہمیں سمیٹ کر چل پڑی - اب میرا ذہن سلیٹ کی طرح صاف تھا' لاری نہایت تیز رفتاری سے حد نظر تک پھیلی ہوئی سڑک کی سیاہ پٹڑی کو کاٹ رہی تھی لیکن حال اور مستقبل کے درمیان حائل شدہ خلیج کی وسعت بڑھتی جا رہی تھی ---- ماضی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا اور مستقبل کے متعلق تصورات کے عجیب و غریب گھروندے بن بن کر ٹوٹ رہے تھے -

لاری اچانک کابلی تھانے کے قریب محمد افضل بنگش ایڈوکیٹ کے بالا

خانے کے نیچے آکر ٹھہر گئی - تھوڑی دیر بعد افضل اپنی لافانی مسکراہٹ لئے نیچے آیا اور آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا اتنے میں کاکا جی صنوبر حسین بھی آگئے --- انہیں دیکھ کر میری بجھتی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں - تنہائی کے روگ سے نجات ملی - لیکن ابھی تک منزل مقصود کا یقینی طور پر کوئی پتہ نہیں تھا ---- ہم نے شہر پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور سپاہیوں کے نرغے میں لاری میں لد کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئے' ہمیں زیادہ تشویش نہ کرنا پڑی' لاری جلد ہی منزل مقصود یعنی جیل کے بڑے آہنی پھاٹک پر رک گئی ---- پھاٹک اژدہے کے منہ کی طرح کھلا اور ہمیں نگل کر بند ہوگیا- افضل نے ایس پی سے گرفتاری کے وارنٹ طلب کئے جنہیں دیکھ کر پہلی دفعہ پتہ چلا کہ ہمیں سیفٹی ایکٹ نمبر 3 کے تحت ایک ایک سال کے لئے نظر بند کیا گیا ہے -

جیل کی ڈیوڑھی میں پہنچ کر ایک انکشاف یہ ہوا کہ افضل اپنا سوٹ کیس اور بستر بھی ساتھ لایا ہے - ہم میں صنوبر کاکا کافی تجربہ کار تھے - ان کی تمام عمر قید و بند میں کٹی تھی لیکن اس معاملہ میں وہ بھی اناڑی نکلے' میرا تو پہلا موقع تھا اور اس سلسلے میں میری معلومات صفر کے برابر تھیں - افضل کا بھی یہ پہلا چانس تھا - اس نے بتایا " میں نے یہ بات حمید اختر کی کتاب " کال کوٹھڑی " سے نوٹ کی ہے - بہر حال افضل ہمارے لئے کار آمد ثابت ہوا - اس کے سوٹ کیس میں صابن' تولیا' حجامت کا سامان اور بعض دوسری ضروری چیزیں موجود تھیں -

میرا خیال تھا افضل کچھ سگریٹ بھی لایا ہوگا - جب اس نے بتایا کہ وہ صرف دو پیکٹ لا سکا ہے تو دل ڈوبنے لگا - لیکن جلد ہی سنبھلتے ہوئے ایک سگریٹ سلگا لیا -

جیل کی ڈیوڑھی میں کافی انتظار کرنا پڑا - یہ جیل کا دیباچہ ہے' یہاں سے

اس کی تمہید کا آغاز ہوتا ہے' ایک قیدی کو جب جیل کی ڈیوڑھی میں لایا جاتا ہے جہاں اس کے وارنٹ داخل کئے جاتے ہیں اور یہیں سے اس کے ساتھ جیل کا مخصوص برتاؤ شروع ہو جاتا ہے' ڈیوڑھی کا جمعدار نہایت توہین آمیز طریقہ سے قیدی کی جامہ تلاشی لے کر اسے " سلس " کے حوالے کر دیتا ہے. " سلس " جیل کی اصطلاح میں اس قیدی کو کہتے ہیں جو ڈیوڑھی سے چکر تک چپڑاسی کے فرائض انجام دیتا ہے۔

ڈیوڑھی کے جمعدار نے ہمارے ناموں کا اندراج کرلیا اور جامہ تلاشی بھی ہو چکی تو ہمیں حسب قاعدہ " سلس " کے سپرد کردیا گیا۔ جس نے ہمیں ایک اور بڑے پھاٹک سے گزار کر جیل کے احاطے میں پہنچا دیا۔ جیل کا وسیع احاطہ رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ نمبرداروں کی ہولناک آوازوں نے اس دہشت ناک منظر کو اور زیادہ بھیانک بنا دیا تھا۔ بی کلاس کے احاطہ میں پہنچتے ہی افضل نے شاہین اور ارباب عبدالغفور خان کے نام لے کر پکارنا شروع کئے' زیادہ دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ احاطہ کے تمام لوگ اٹھ کر ہم سے لپٹنے لگے' ان میں سے میں تو صرف ارباب عبدالغفور خان' مولانا نور الحق اور شاہین کو پہچان سکا' افضل اور صنوبر کاکا کے کئی ملنے والے نکل آئے' شاہین نے کہا شکر ہے آپ لوگ آگئے ہم تو مدت سے راہ دیکھ رہے تھے۔ سب اس کی شرارت پر مسکرانے لگے۔ افضل نے ایک ہی سانس میں گھر سے جیل تک کے تمام واقعات پوری تفصیل سے سنا ڈالے ... ہم جیل کے احاطہ میں داخل ہوئے تو صبح کی اذان ہو رہی تھی' تھوڑی دیر بعد ارباب غفور اور ان کے ساتھی ہمیں آرام کرنے کی ہدایت کرکے خود نماز پڑھنے چلے گئے' رات بھر سو نہیں سکے تھے' آنکھیں جل رہی تھیں۔ ہم گھنٹہ بھر تک سونے کی ناکام کوشش میں کروٹیں بدل بدل کر اٹھ بیٹھے ... شاہین سے غسل خانے کا پوچھا اس نے با

خانے کا راستہ بتا دیا - جب میں صابن اور تولیا لے کر ادھر جانے لگا تو سارا احاطہ قہقہوں سے گونج اٹھا - غسل کرنے کے بعد طبیعت قدرے بحال ہوئی' پھر باتوں میں لگ گئے' یار دوستوں کی باتیں اپنے پرایوں کی باتیں' ادھر ادھر کی باتیں' دنیا جہان کی باتیں --- اتنے میں چائے آگئی' چائے پی کر حواس بجا ہوئے تو یاد آیا جیل میں یہ ہمارا پہلا دن ہے' گرد و پیش پر نظر ڈالی' ایک نئی دنیا آباد تھی' محدود و مقید دنیا' سہمی سہمی اور لرزاں دنیا' ایسی دنیا جہاں کوئی قانون' کوئی انصاف' کوئی خدا نہیں ---- جہاں زندگی کے پر کاٹ کر اسے لنڈورا بنا دیا جاتا ہے جہاں انسانوں کو جانوروں کی طرح ہانکا جاتا ہے' جہاں انسانیت اپنی توہین کے آخری مراحل طے کرتی ہے -

میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے احاطہ کے پھاٹک سے باہر جھانکا ---- شاہین نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا --- باہر چلو یار' ڈرتے کیوں ہو میں نے چونک کر کہا' اچھا تو ہم باہر بھی جاسکتے ہیں - اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے مجھے باہر دھکیل دیا اور بولا آؤ تمہیں اصل جیل دکھاؤں ---- بی کلاس کے قیدی' قیدی نہیں ہوتے فارغ ---- وہ تو شاہی مہمان ہوتے ہیں - طبقاتی اونچ نیچ تمہیں ہر جگہ نظر آئے گی' یہاں تک کہ جیل کا ماحول بھی اس سے نہیں بچ سکا ---- خیر چھوڑو ان باتوں کو اور دیکھو یہ چکر ہے ---- چکر جیل کا مرکز کہلاتا ہے' اسی مرکز سے جیل کا سارا نظام چلایا جاتا ہے ---- "چکر" ایک جمعدار کے ماتحت ہوتا ہے جو چکر جمعدار کہلاتا ہے' چکر جمعدار خداوندان جیل کی بے آواز لاٹھی ہے ---- وہ سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے احکام حاصل کرکے انہیں ڈنڈے کے زور سے نافذ کرتا ہے' اسے جیل کے انتظامات میں کچھ خصوصی اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں جنہیں وہ ہنگامی حالات میں استعمال کرنے کا مجاز ہوتا ہے' شاہین بے تکان بولے جا رہا تھا ---- نئے قیدی سب

سے پہلے چکر ہی میں لائے جاتے ہیں یہاں سے انہیں بارکوں میں تقسیم کر دیا
جاتا ہے' قیدیوں کا بارکوں میں چلے جانے کے بعد بھی چکر سے رابطہ نہیں ٹوٹنے
پاتا۔ چکر قیدی ایک زندگی کا محور ہے' انہیں عدالتی اور جیل کی پیشیوں کے
لئے یہیں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے' شام کو کارخانے سے لوٹتے ہوئے بھی وہ
چکر ہی سے ہو کر اپنی بارکوں کو جاتے ہیں' اگر کہیں جیل کے کسی حصے میں
قیدیوں کے مابین تصادم ہو جائے تو سب سے پہلے انہیں چکر ہی میں لایا جاتا ہے
جہاں معاملہ کی تحقیق کرنے کے بعد اس حاکم اعلیٰ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔
۔۔۔ شاہین نے انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اس بوڑھے درخت کے سائے میں
ان قیدیوں کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں' اس سامنے والی کوٹھڑی میں خطرناک
مجرموں کو بیڑیاں پہنائی جاتی ہیں ۔۔۔۔ یہ لنگر خانہ ہے جہاں قیدیوں کے لئے
کھانا تیار ہوتا ہے' یہ غلہ گودام ہے وہ کپڑا گودام اس کے ساتھ گھڑی گودام
ٹکٹ گھر اور لائبریری ہے ۔۔۔ شاہین کی رننگ کومنٹری جاری تھی۔
یہ ملاحظے کی جگہ ہے نئے آنے والے قیدیوں کا دوسرے دن ملاحظہ ہوتا
ہے۔ ان قیدیوں کو بارکوں میں تقسیم کرنے سے پہلے کپڑا گودام سے ایک ایک
بستر ملتا ہے۔ جو ڈیڑھ گز لمبے اور تین بالشت چوڑے بوسیدہ ٹاٹ' ایک گھسی پٹی
چھوٹی سی دری اور دو کمبلوں پر مشتمل ہوتا ہے اس کے علاوہ ایک مٹی کا پیالہ
کنڈول بھی ہر قیدی کو دیتے ہیں جو کھانے پینے دونوں کے کام آتا ہے ۔۔۔
تکیہ قیدی کو اینٹوں یا مٹی کے تودے کا بنانا پڑتا ہے یہ سامان دے کر قیدیوں کو
لوہے کی سلاخوں والی بارکوں میں پہنچا دیا جاتا ہے جو قیدیوں کی رہائش گاہ ہوتی
ہے' انہیں رفع حاجت سے لے کر غسل تک اپنی تمام ضروریات وہیں پوری
کرنی پڑتی ہیں' وہ غروب آفتاب سے پہلے پہلے گنتی کر کے بند کر دیئے جاتے
ہیں۔ بارکوں میں بند کرتے وقت انہیں بالکل جانوروں کی طرح ہانکا جاتا ہے وہاں

وہ ایک دوسرے سے بالکل پیوست پڑے رہتے ہیں - یہاں تک کہ کروٹ بدلنے کی بھی گنجائش نہیں ہوتی' ہر بارک میں 250 سے 300 تک قیدی ہوتے ہیں - جن کے لئے صرف ایک بیت الخلاء اور ایک نلکا ہوتا ہے اور بعض بارکوں میں تو نلکا بھی نہیں ہوتا - - - ملاحظہ انگریزی عہد میں اس لئے کیا جاتا تھا کہ نیا قیدی کوئی متعدی مرض لے کر آیا ہو یا اس کی صحت خراب ہو تو مناسب علاج کے لئے ہسپتال بھیج دیا جائے تاکہ دوسرے قیدی متاثر نہ ہوں - - - - ڈاکٹر ہر قیدی کا مکمل معائنہ کرتا' اس کا وزن لیا جاتا' ٹکٹ پر سزا کی نوعیت صحت اور ہسٹری لکھی جاتی' لیکن اب محض رسمی طور پر اس روایت کو پورا کیا جاتا ہے' وزن احتیاطاً" کم لکھا جاتا ہے تاکہ خرابیِ صحت کی صورت میں حکام جیل پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہو - - - - شاہین نے اپنی تقریر کے دوران میں یکایک مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا - - - تم کہیں بور تو نہیں ہو رہے' میں چاہتا ہوں جیل کے متعلق پہلی صحبت ہی میں تمہیں کچھ ابتدائی معلومات حاصل ہو جائیں تو بہتر ہے - - - - میں نے اپنی بے چینی چھپاتے ہوئے کہا نہیں ایسی کوئی بات نہیں - - - - اس نے میری بات سنے بغیر ہی اپنی تقریر جاری کردی - - - - یہ رہٹ دیکھتے ہو یہاں سے تمام جیل میں پینے کا پانی سپلائی کیا جاتا ہے - - - - اس کوٹھڑی میں بوائلر ہے' یہاں بھاپ کے ذریعے قیدیوں کے بستر جوؤں سے پاک کئے جاتے ہیں - یہ سبز پوش وارڈروں کا کمرہ ہے - یہ وارڈر جیل کی ملیشیاء پولیس ہے - قیدی کا ریکارڈ اچھا ہو اور حکام مہربان ہوں تو ایک مقررہ میعاد کے بعد پہلے نمبرداری ملتی ہے' پھر سیاہ پوشی' پھر زرد پوشی اور آخر میں سبز پوشی - - - - اس ترقی کے اعتبار سے معافیاں بھی ملتی ہیں اور دوسری مراعات بھی - - - - اس لئے اس کے لئے بڑی جدوجہد ہوتی ہے - سفارشیں اور دوسرے ذرائع بھی استعمال کئے جاتے ہیں -

واپسی پر شاہین مجھے لائبریری لے گیا - اس نے بتایا لائبریری کا انچارج داروغہ تعلیم ہے - اس نے آگے ایک قیدی کو لائبریرین مقرر کر رکھا ہے ایک پرانی طبع شدہ فہرست پر نظر پڑی جس میں دو ہزار کے قریب کتابوں کا اندراج تھا - لیکن اب وہاں بمشکل دو تین سو کتابیں موجود تھیں - بعد میں معلوم ہوا اکثر کتابیں افسروں کے گھروں میں پڑی رہتی ہیں - وہ جب یہاں سے تبدیل ہوتے ہیں تو انہیں واپس کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے' ایک علم دوست سپرنٹنڈنٹ نے تو اس طرح ایک اچھی خاصی اپنی ذاتی لائبریری بنا لی تھی --- لائبریری کے ساتھ ہی ایک مختصر سی کوٹھڑی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے مسکراتے ہوئے کہا یہ جو سامنے ریکوں میں ٹکٹوں کے بنڈل دیکھتے ہو --- یہ ہم سب قیدیوں کے اعمال نامے ہیں - ملاحظہ کے وقت ہر قیدی کا ٹکٹ بن جاتا ہے - اس میں اس کا نام پتہ' فرد جرم' سزا' مشقت اور بعد میں اس کا جیل میں چال چلن' پیشیاں' معافیاں' ملاقاتیں اور درخواستوں کا اندراج ہوتا رہتا ہے -

میں تھک کر چور ہو گیا تھا - شب خوابی کے باعث بدن ٹوٹ رہا تھا' دل و دماغ پر سکر کی سی کیفیت طاری تھی' جی چاہتا کسی طرح جان چھڑا کر بھاگ نکلوں اور خوابوں کے پر سکون جزیروں میں پہنچ جاؤں --- شاہین نے مجھے ایک ہی سانس میں اتنا کچھ بتا دیا کہ وہ سب کچھ حافظے میں رکھنا دشوار ہو گیا --- راستے میں بیسیوں قیدیوں نے ڈاکٹر صاحب خیر سے آئے ہو" کہتے ہوئے میرا استقبال کیا --- جو ذرا سوجھ بوجھ رکھتے تھے' انہوں نے گرفتاری کی نوعیت پوچھی اور مجھے واقعات دہرانا پڑے -

احاطہ میں نیچے کمرے میں ہمارے بستر لگوا دیئے تھے' خیال تھا کھانے کے وقت تک کچھ آرام کرلیا جائے - لیکن ملنے والوں کا ایسا تانتا بندھا کہ کچھ بھی

نہ ہو سکا۔۔۔ شاہین کے چھوٹے بھائیوں مبارک شاہ اور سنگین شاہ سے تعارف تو آتے ہی ہو گیا تھا۔ اب تفصیلی ملاقات ہوئی' وہ دونوں بڑے دلچسپ نکلے' مبارک شاہ وزیر خارجہ اور سنگین وزیراعظم کہلاتا تھا' خصوصاً" سنگین کی طبیعت میں تو مزاح کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔۔۔۔ بعض مشہور شخصیتوں کی اس خوبی سے نقل کرتا کہ دیکھنے والے مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔۔۔۔ مولانا نور الحق مجلس احرار کا جنرل سیکرٹری تھا۔ اسے وزیر خوراک کا عہدہ ملا ہوا تھا' مطبخ کا انتظام اسی کے سپرد تھا اور وہ اس کے لئے موزوں بھی تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ملنے والوں کی آمد کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ ان میں زیادہ تر قتل کے مقدمات میں جرگہ کے تحت سزا پانے والے قیدی تھے۔ ہر ایک ہمیں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی یوں کوشش کرتا جیسے ہم ان کی رحم درخواستیں سننے آئے ہیں۔

یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ صوبہ سرحد کی جیلوں میں تقریباً" نوے فیصد لوگ قتل کے مقدمات میں ماخوذ ہیں ان میں سے پچاس فیصدی جرگہ کے تحت سزا یافتہ ہیں اور اکثر بے گناہ ہیں کیونکہ عموماً" وہی مقدمات جرگہ سپرد کئے جاتے ہیں جن کے متعلق کوئی جوڈیشنل ثبوت نہیں ہوتا۔ لیکن انہیں سزا دلانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

پختون قوم کی زندگی کا یہ پہلو نہایت گھناؤنا ہے' قتل و غارت گری کے حادثات نے ان کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے' چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کا خون بہانا ان کا معمول بن چکا ہے' چچا زاد بھائیوں کو وہ "ترٖبور" (دشمن) سمجھتے ہیں' زر' زن اور زمین ان کی مخالفتوں کے محور ہیں' پٹھانوں کی بہادری کے جذبے کو قبیلوی اور خاندانی دشمنیوں کی طرف منتقل کرنے میں غیر ملکی حکمرانوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے انگریز سامراج نے غلام ملکوں کو زیر نگیں رکھنے کے

لئے حریت پرست قوموں میں جو زہر پھیلائے وہ کہیں افیون کی صورت میں تھے
تو کہیں انتشار و افتراق کی شکل میں ---- پٹھانوں کی یہ دشمنیاں پشت در پشت
چلی جاتی ہیں' خاندانوں کے خاندان تباہ و برباد ہو چکے ہیں - یہ ایک متعدی
مرض ہے جو پھیلتا ہی چلا جاتا ہے' ان کی جہالت بھی بہت حد تک اس کی ذمہ
دار ہے لیکن پڑھے لکھے افراد بھی اس سے چھٹکارا نہیں پا سکے' اس ترقی یافتہ
دور میں بھی ان کا وہی عالم ہے اپنی آزاد مملکت بن جانے کے بعد بھی ان کی
حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اس کے لئے نہ تو حکومت نے کوئی قدم
اٹھانا مناسب سمجھا نہ ہی سیاسی رہنماؤں نے ---- اکثر خوانین دشمنیوں
میں ملازمین کو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے' بیشتر سنجیدہ' فہمیدہ اور کم آزار لوگوں کو بھی
اس دلدل میں بادل ناخواستہ پھنسنا پڑتا ہے --- میں اس صورت حال سے اس
قدر متاثر ہوا کہ تمام سیاست وریاست بے کار نظر آنے لگی ---- سب کچھ
چھوڑ چھاڑ کر اس بد نصیب قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا چاہئے - وسیع پیمانہ پر تعلیم
بالغان کی مہم شروع کرنی چاہئے - اصلاحی کمیٹیاں بنانی چاہئیں - دیہاتوں میں
پھیل کر لوگوں کو احساس دلانا چاہئے کہ وہ آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے
ہیں تباہی و بربادی کے مہیب غار میں لڑھک رہے ہیں زہریلی اور مسموم فضا میں
پل رہے ہیں -

میں اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ ارباب غفور نے آکر یہ افسوس ناک خبر
سنائی کہ احاطہ میں جگہ ناکافی ہے اس لئے انہوں نے داروغہ کو بلا بھیجا ہے تاکہ
وہ ہمارے لئے کسی دوسری جگہ کا بندوبست کرے ---- اس احاطہ کا ماحول کچھ
مانوس سا تھا' نئی جگہ نہ جانے کس قسم کی ہو اس تصور سے تھوڑی دیر کے لئے
خاصی پریشانی ہوئی' "یا اللہ یہ لوگ ہمیں جیل میں بھی آرام سے نہیں جینے
دیتے" مجھے ارباب غفور پر غصہ آنے لگا ---- اتنے میں اطلاع آئی' داروغہ

صاحب آرہے ہیں --- داروغہ صاحب کی آمد کا سن کر اخلاقی قیدیوں پر عجب سی کیفیت طاری ہوگئی - وہ ہنستے بولتے لوگ یوں اپنی اپنی جگہ سہم کر دبک گئے جیسے داروغہ نہیں ملک الموت آرہا ہے ---- داروغہ صاحب کچھ عجیب شان اور تمکنت سے تشریف لائے ان کے آگے آگے دو نمبردار' ہٹو بچو' سر تسلیم خم کرو' حضور صاحب عالم تشریف لا رہے ہیں' کی قسم کا پارٹ ادا کر رہے تھے - ایک طرہ دار پگڑی والا وارڈر پنکھا جل رہا تھا۔ دوسرا بجا ہے درست ہے کہنے پر مامور تھا ---- میں سمجھا کہ یہ سپرنٹنڈنٹ ہوں گے لیکن وہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھا جسے جیل کی اصطلاح میں داروغہ کہا جاتا ہے - منحنی قسم کا دبلے پتلے گندمی رنگ اور لمبے قد کا آدمی جو داروغہ کے بجائے پرائمری سکول کا ٹیچر یا کسی یتیم خانے کا مہتمم معلوم ہوتا تھا اس نے ارباب غفور کے مطالبے پر یورپین وارڈ میں ایک بڑے کمرے کا بندوبست کرنے کا وعدہ کیا - فیصلہ ہوا کہ ہم پانچ سیاسی قیدی ارباب غفور' مولانا نور الحق' صنوبر خان کاکا خیل' افضل بنگش اور میں اس کمرے میں منتقل ہو جائیں گے ---- داروغہ صاحب چلے گئے ---- مجھے نئی جگہ جانے میں کوفت محسوس ہو رہی تھی - ادھر ایک حادثہ یہ ہوا کہ سگریٹ ختم ہوگئے سگریٹ نہ ہونے کے روح فرسا تصور نے طبیعت کو ایسا مکدر کیا کہ میں نے غصے اور غم کے عالم میں ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود حجام کو بلا کر سر منڈوا دیا ---- یہ ایک اضطراری فعل تھا - سر منڈوانے کے بعد آئینہ دیکھا تو وہاں فارغ کے بجائے کوئی اور ہی صورت نظر آئی ---- کمرے میں داخل ہوا تو پہلی نظر میں اپنے ساتھی بھی نہ پہچان سکے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میں ہوں تو دیر تک مذاق اڑاتے اور ہنستے رہے ---- افضل بولا بھئی تم نے سر تو منڈوا دیا - لیکن اولے پڑنے کے بعد --- میں نے کہا فکر کی کوئی بات نہیں ابھی تو اولے شروع ہوئے ہیں --- کاکا جی نے کہا جیل میں یہ مزے ہیں' سر

منڈاؤ چاہے جو کچھ کرو مجال ہے جو کوئی روکے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ جھلسا دینے والی گرمی نے بد حواس کردیا۔ ہر ایک اپنی اپنی چارپائی سنبھال کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بھی ایک کونے والی چارپائی پر جا لیٹا اور آنکھیں بند کرکے خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔۔۔۔ میرے آنے کے بعد گھر والوں پر کیا گزری ہوگی۔ رضا بھائی کا کیا حال ہوا ہوگا۔ بچوں نے کیا طوفان اٹھایا ہوگا۔۔۔۔ اپنے پانچ سالہ بچے ظفر کا خیال آیا جو ہمارے ساتھ مری جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ گزشتہ کئی دنوں سے بیمار تھا۔ اس رات بھی اسے شدید بخار تھا۔ پھر پولیس کی دہشت سے وہ ایسا سہم گیا کہ منہ سے بات تک نہ نکلتی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ "ابا تم اکیلے ہی مری چل پڑے۔۔۔۔ ابا تم نے تو مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا"۔۔۔۔ میں ندامت کے مارے اسے پیار بھی نہ کرسکا، الوداعی بوسہ بھی نہ دے سکا اور ننھا قمر جو گھر میں اتنا ہنگامہ برپا ہونے پر بھی میٹھی اور گہری نیند سوتا رہا۔۔۔۔ اور میری بچیاں سدرہ اور عذرہ جنہیں میں سسکتا اور بلکتا چھوڑ آیا تھا اور ننھی بتول کی شرارت بھری مسکراہٹ اور اپنی شریک حیات کی رکی رکی ہچکیاں اور والدہ بھائیوں کے خشک آنسو۔۔۔۔ ان سب سے بڑھ کر عزیز از جان رضا بھائی کا اضطراب اور پریشانی۔۔۔ جس کے سر پر دو خاندانوں کا بوجھ آن پڑا تھا، میں حیران تھا۔ اس کی محدود آمدن اتنے مصارف کی کیونکر متحمل ہوسکے گی۔۔۔۔ رضا جو گزشتہ بیس برسوں میں ایک لمحہ کے لئے بھی مجھ سے جدا نہ ہوا تھا۔ اب حالات کی ستم ظریفی نے ہمارے درمیان ایسی خلیج حائل کردی، کہ ایک شہر میں بستے ہوئے بھی ایک دوسرے کی صورت کو ترستے تھے۔۔۔۔ یکایک شاہین کی آواز نے میرے خیالات کے تانے بانے کو توڑ دیا، وہ مجھے چائے کے لئے جگا رہا تھا۔

چائے پیتے ہی ہمارا سامان نئی قیام گاہ پر منتقل ہونے لگا - شام کے قریب ہم بھی دوستوں سے رخصت ہو کر نئے کمرہ میں چلے گئے - وہاں جاتے ہی وحشت سی محسوس ہونے لگی - کمرہ برائے نام تھا لیکن اس کا محل وقوع بڑا تکلیف دہ تھا - سامنے "سی کلاس" کے قیدیوں کا وارڈ تھا - جس میں شام سے پہلے ہی بے شمار قیدی بھیڑ بکریوں کی طرح بند کر دیئے جاتے' گرمی پورے شباب پر تھی' باہر کی فضا میں ہمارا دم گھٹتا جا رہا تھا' میں سمجھ نہیں سکتا تھا کہ اس بلیک ہول میں وہ بدنصیب کیونکر زندگی بسر کرتے ہوں گے -

دائیں طرف پھانسی والوں کی کوٹھڑیاں تھیں جن میں موت کے منتظر زرد چہرے یاس و قنوطیت میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے ہر وقت لوگوں کو گھورتے رہتے ---- بائیں طرف زنجیروں کی مسلسل جھنکار اور نمبرداروں' جمع داروں کی ہیبت ناک آوازیں دل و دماغ پر مسلسل چوکے دیتی رہتیں --- سوچتے سوچتے میرا دم گھٹنے لگا پھر خود ہی اپنے آپ سے کہا فارغ بخاری بھیا یہ جیل ہے جیل - --- ابھی تو پہلا ہی دن ہے' یوں بات بات پر کڑھنے لگے تو یہ ایک سال کٹ چکا تم سے -----

اتنے میں کسی نے آکر کہا ہمیں ارباب غفور بلاتے ہیں معلوم ہوا وہ غلام محمد گامے کے پاس بیٹھے ہیں' جو پھانسی کی کوٹھڑی میں بند ہے اور گزشتہ چودہ روز سے بھوک ہڑتال پر ہے ---- میں یہ لکھنا بھول ہی گیا کہ آج دن کو ارباب غفور نے داروغہ سے کہا وہ کئی دنوں سے گامے سے ملنے کا مطالبہ کر رہے ہیں' لیکن انھیں کوئی جواب نہیں ملتا سنا ہے اس کا چونتیس پونڈ وزن گر چکا ہے اور حالت تشویش ناک ہے اگر ہمیں آج شام تک اس سے ملنے کی اجازت نہ ملی اور اس کی بھوک ہڑتال ترک کرانے کا بندوبست نہ کیا گیا تو کل تمام سیاسی قیدی ایک دن کی علامتی بھوک ہڑتال کریں گے' اور اس کے بعد

کوئی مناسب قدم اٹھائیں گے، غالباً یہ اسی دھمکی کا اثر تھا کہ ارباب صاحب
داروغہ نے گامے سے ملنے کے لئے بلا بھیجا اور اب ہمیں بھی بلایا جا رہا تھا۔
۔۔ ارباب صاحب کا پیغام ملتے ہی ہم بغیر کسی توقف کے روانہ ہوگئے، وہاں
کر عجیب درد ناک منظر دیکھنے میں آیا، گاما گرمی کے اس طوفان میں پھانسی کی
تپتی ہوئی بند کوٹھڑی میں گرم کمبلوں کے جھلسا دینے والے بستر پر ننگے بدن
تھا، اس نے صرف ایک لنگوٹ باندھ رکھا تھا، حالت نہایت خطرناک تھی۔
غش آرہے تھے، منہ سے بات تک نہ نکلتی تھی لیکن چہرے پر بدستور فاتح
مسکراہٹ موجود تھی۔ اس کا حوصلہ بلند اور عزم چٹان کی طرح مضبوط تھا۔
۔۔ ڈاکٹر گلوکوز کے پانی کا پیالہ لئے سرہانے کھڑا تھا، ارباب صاحب اسے بھوک
ہڑتال توڑنے پر مجبور کر رہے تھے، لیکن وہ کسی صورت تیار نہ تھا۔ یہ بھوک
ہڑتال اس نے سی کلاس قیدیوں کی ناقص غذا کے خلاف کی تھی۔ داروغہ
یقین دلایا کہ اس کے مطالبات پر غور کیا جائے گا، ہم سب نے کافی اصرار
بعد اسے راضی کر لیا اور گھنٹہ بھر تک اسے گلوکوز پلاتے رہے، داروغہ
اجازت سے بستر اٹھوا کر باہر لگایا اور اسے لٹا کر لوٹ آئے۔

غلام محمد گاما انجمن غرباء کا بانی میانی اور سرخ پوش تحریک کا سر
کارکن ہے وہ قیام پاکستان کے بعد چھ برس تک جیل میں رہا، 1954ء
اوائل میں رہا ہونے کے بعد وہ بمشکل تمام چند ماہ ہی باہر گزار پایا تھا کہ
سال کے لئے ایف سی آر کے تحت سزا ہوگئی، گامے سے جیل کے حکام
بدکتے تھے، وہ جیل والوں کو بے نقط سناتا تھا۔ اس شور شغب کو وہ اپنی اص
میں "بانگیں" کہتا اور اس بناء پر لوگ اسے گاما کے بجائے ہنگامہ کہتے
پوچھئے تو وہ ایک بنا بنایا ہنگامہ تھا۔ اس کی غوغا آرائی اور ہرزہ سرائی سے
بھی نہ بچ سکتا، سپرنٹنڈنٹ، داروغہ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور ڈاکٹر سب اس کے

سے پناہ مانگتے تھے۔

غلام محمد گاما کی بھوک ہڑتال ٹوٹنے سے ہمیں کافی ذہنی سکون ہوا۔ دن ڈھل چکا تھا۔ آسمان سے تاریکیوں کے قافلے اترنے لگے' شامیں تو یوں بھی اداس ہی ہوتی ہیں' لیکن جیل کی شاموں کی اداسی کا کچھ نہ پوچھئے ---- ہر طرف ایک سوگوار فضا دکھائی دیتی تھی جسے دیکھو معلوم ہوتا آنسو پینے کی ناکام کوشش میں مصروف ہے' ہم واپس آئے تو کھانا کھاتے ہی بستروں پر دراز ہو گئے' سگریٹ کی یاد بری طرح ستا رہی تھی' کیسے آئیں کہاں سے آئیں اور نہ آئیں تو کیونکر جیا جائے' یہ سوالات ذہن میں رہ رہ کر ابھر رہے تھے کہ شاہین نے آتے ہی دو پیکٹ کیپٹن کے میری جھولی میں ڈال دیئے میں خوشی سے اچھل پڑا' جیسے ہفت اقلیم کی بادشاہت مل گئی ہو ---- گزشتہ رت جگے اور سارا دن کی مصروفیت نے نڈھال کر دیا تھا۔ ہم جلد ہی سو گئے۔

اچانک تین بجے شب ایک نمبردار نے آکر جگا لیا اور خوشخبری سنائی کہ ارباب سکندر خان گرفتار ہو کر ابھی ابھی آیا ہے ہم نے اٹھ کر جلدی جلدی کپڑے پہنے اور اسے لینے کے لئے ڈیوڑھی کی طرف جانے لگے' اسی لمحہ شاہین بھی ہمارے پاس آپہنچا ارباب سکندر سے ہم گلے مل رہے تھے کہ کاکا خوشحال خان بھی آگئے ---- ارباب سکندر دیر تک اپنی گرفتاری کے واقعات سناتا رہا' ایک عجیب بات اس نے یہ بتائی کہ اس کی گرفتاری کے متعلق سرکاری اعلان کل دن کو شائع ہو چکا تھا۔ لیکن وہ سارا دن قصہ خوانی بازار میں گھومتا رہا اور لوگ حیرانی سے اسے دیکھ کر "سبحان تیری قدرت" کا ورد کرتے رہے۔ میں نے کہا شکر کیجئے لوگوں نے بھوت نہیں سمجھا ورنہ شہر میں بھگدڑ مچ جاتی ---- افضل بولا رات کا وقت ہوتا تو ایسا ہونے میں شک بھی نہ تھا۔ ارباب صاحب نے مزید بتایا کہ آدھی رات کے وقت اسے گاؤں سے دفعہ چالیس سرحدی کے

تحت گرفتار کیا گیا۔ اس کے خلاف ایبٹ آباد کے ایک جلسہ میں قابل اعتراض تقریر کرنے کا الزام ہے۔

خوشحال کاکا اور ارباب سکندر کے آنے سے ہماری زندگی میں ایک عجیب گہما گہمی پیدا ہو گئی' خوشحال کاکا " جیل برڈ " کہلاتے ہیں - وہ 76 برس کے ضعیف العمر پٹھان ہیں تمام عمر قید و بند میں کٹی - - - آج سے بیس برس پہلے کانگریس جماعت سے وابستہ ہوئے ان بیس برسوں میں کم از کم پندرہ برس جیل میں گزار دیئے - - - - وہ آٹھ مہینے پیشتر دو سال کے بعد رہا ہوئے اور آج پھر گرفتار ہو کر آ گئے' وہ اس وقت صوبہ سرحد میں کسانوں کے سب سے بڑے رہنما ہیں' ان کے لئے جیل کوئی نئی جگہ نہیں' جیل کے حکام سے لے کر در و دیوار تک سب خوشحال کاکا سے مانوس تھے' ان کے آتے ہی سارے جیل میں غلغلہ مچ گیا - دن بھر قیدیوں' نمبرداروں اور وارڈوں کی ٹولیاں ان سے ملاقات کرنے اور انہیں (پہ خیر راغلے) خیر سے آئے ہو کہنے کے لئے آتی رہیں' یوں معلوم ہوتا تھا - جیسے وہ سفر سے اپنے گھر لوٹے ہوں - خوشحال کاکا قیدیوں کے پیر معلوم ہوتے تھے - قیدی آکر عقیدت سے انہیں ملتے اور وہ انکی کمر تھپتھپا کر مسکراتے ہوئے کہتے " خوش رہو' خوش رہو بھائی " -

ارباب سکندر خان سرحد عوامی لیگ کے رہنما اور مشہور وکیل ہیں - وہ 1933ء میں کانگریس کی تحریک آزادی میں اس وقت پہلی دفعہ جیل گئے' جب کہ وہ مڈل میں پڑھ رہے تھے' یہ ان کی دوسری بار تھی اس لئے مطمئن نظر آتے تھے - - - - وہ بڑے زندہ دل اور آزاد منش انسان ہیں افضل اور خوشحال کاکا سے ان کی ہر وقت نوک جھونک لگی رہتی - - - - جب انہوں نے بتایا کہ انہیں اے کلاس ملی ہے تو میں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا آپ پر تو حکومت نے بڑا ظلم کیا' افضل بولا " چہ چہ کم بختوں نے اس غریب کو اے

کلاس دے دی "۔۔۔۔ ساری محفل مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہورہی تھی۔
پھر میں نے ارباب غفور کو مخاطب کرکے کہا۔۔۔۔ دیکھئے نا ہمارے ساتھ تو
انہوں نے کافی مہربانی کی ہے بی کلاس دی۔ لیکن نامعلوم اس بیچارے سے ایسی
کیا دشمنی تھی جو غریب کو اے کلاس دے دی' ہمارے بار بار کہنے سے اس کی
آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے اور جب ہم نے تسلی دی کہ خیر ہے ہم تمہیں
اپنے ساتھ ہی رکھیں گے تو وہ عجیب معصومیت سے مسکرانے لگا۔

اب خوشحال کاکا سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی انہیں گرفتار کرکے لایا جا رہا
تھا کہ راستے میں گر پڑے اور گھٹنوں پر چوٹ آگئی۔ جس کی وجہ سے چلنے
پھرنے سے معذور ہوگئے۔ ارباب سکندر نے کہا " پولیس والوں نے عمداً" کاکا
جی کو گرایا ہے ان کے خلاف استغاثہ کرنا چاہئے" افضل بولا " سکندر کی وکیلانہ
ذہنیت یہاں بھی اپنا کام کررہی ہے "۔۔۔۔ میں نے کہا پہلی دفعہ کاکا نے
سرکاری دانتوں کا سیٹ لگوایا تھا۔ اب نئی ٹانگ لگوانے کا ارادہ ہوگا۔

کھانے پر بیٹھے تو ارباب غفور نے کہا "۔۔۔۔ کاکا جی زیادہ کھانا نہ کھایئے
ٹانگ پر بوجھ پڑ جائے گا۔۔۔۔ صنوبر کاکا بولے۔۔۔ " ان لوگوں کی باتوں پر نہ
جایئے ان کے ارادے نیک نہیں معلوم ہوتے۔۔۔۔ " مولانا نور الحق نے
داروغہ سے کہا کہ " کاکا جی کے لئے بیساکھیاں بنوا لینا چاہئے "۔۔۔۔ ارباب
سکندر نے تجویز پیش کی۔۔۔۔ " کاکا جی کو چارپائی سے ہلنے نہ دیا جائے!"۔۔۔
۔ کاکا جی نے سکندر کو دھمکی دی " زیادہ باتیں نہ بناؤ ورنہ اے کلاس میں بھجوا
دیئے جاؤ گے" اس پر ساری محفل زعفران زار بن گئی۔

دوپہر کو اخبارات آئے تو معلوم ہوا' کہ گرفتاریاں ہم تک ہی محدود نہیں
بلکہ پاکستان گیر ہیں۔۔۔۔ یہ بھی انکشاف ہوا کہ کمیونسٹ پارٹی اور اس سے
متعلقہ جماعتوں کو سارے ملک میں خلاف قانون قرار دیا گیا ہے اور ہماری

گرفتاری بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے' اس خبر سے ہمیں کوئی اچنبا نہ ہوا کیونکہ اس کا اندازہ بہت حد تک ہم نے پہلے ہی کر لیا تھا۔

گرفتار ہونے کے باعث جیل آنے کے بعد دو ایک روز جو دل پر اضطرابی کیفیت طاری رہی' وہ اب رفتہ رفتہ اعتدال پذیر ہو رہی تھی' باہر کی دنیا سے تو ہمارا رشتہ کٹ بھی چکا تھا' یہاں آکر پتہ چلاکہ عزیز و اقرباء کی ملاقات سے بھی یکسر محروم کر دیئے گئے ہیں' یہ وہ مراعات ہیں جو جیل میں عام اخلاقی قیدیوں کو بھی حاصل ہیں' پہلے پہل اس انکشاف سے بڑا شاق ہوا پھر سوچا چلو اچھا ہی ہوا۔ یوں بھی کون ملنے آتا اس پابندی نے احباب کا بھرم بھی رکھ لیا اور اپنا بھی۔

رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

زندگی میں باہر ہی کون سا سکھ ملا تھا جو قید و بند کی مصیبتوں کا ماتم کیا جاتا' گزشتہ الجھی ہوئی اور مصروف زندگی کا تصور کیا تو یہ فراغت غنیمت معلوم ہوئی۔ اہل و عیال کے نان و نفقہ کی فکر نہ ہوئی' تو جیل فراغت سے حتیٰ الوسع فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ کم مائیگی کہیں بھی تو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی' ہمارے ایک سیاسی دوست جو بہت بڑے لینڈ لارڈ ہیں' ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ باہر ماہانہ پانچ ہزار روپے میرا ذاتی خرچہ تھا۔ میں نے خیال کیا یہاں یہ بہت عیاشی کریں جب بھی ایک سو روپے مہینہ سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتے گویا یہ حضرت اگر سال بھر جیل میں رہ جائیں تو ساٹھ ہزار روپے کے قریب بچا کر لے جائیں گے اور ہم ایک سال کے بعد نکلے تو شاید دس برس تک قرضہ ہی چکاتے رہیں ۔۔۔۔ ایک دوست کہا کرتے تھے۔ ہمارے ملک کی سیاست اونچے

طبقے کے لوگوں کے لئے ہی مخصوص ہے' غریب آدمی کے لئے اس میں کوئی گنجائش نہیں وہ تو صرف آلہ کار بننے کے لئے ہیں' ان کی قربانیوں سے اقتدار کی عمارتیں بنتی ہیں ان کے خون سے ان کے محلات کی آرائش ہوتی ہے' ان کے فاقوں سے ان کی ذخیرہ اندوزی میں اضافہ ہوتا ہے' ان کی تباہی سے ان کی دنیا آباد ہوتی ہے ---- اونچے طبقے نے زندگی کے ہر شعبے میں غریبوں کو قربانی کا بکرا بنا رکھا ہے' مذہب' سیاست' سماج کہیں بھی عوام کی حیثیت بے زبان بھیڑوں سے زیادہ نہیں ---- انہیں استعمال کرنے کے بعد پرانے کپڑوں کی طرح پھینک دیا جاتا ہے' کوئی ٹوٹی ہوئی لاٹھی کی طرح آگ میں جھونک دیا جاتا ہے' محبوب کے وعدوں کی طرح بھلا دیا جاتا ہے'

میں نے سوچا چلو اور کچھ ہو نہ ہو جیل کی زندگی کا تجربہ تو ہو ہی جائے گا' اتنی سی سزا کے بدلے اتنا بڑا تجربہ ---- سودا مہنگا نہیں یوں محسوس ہوا جیل میں آنے سے پہلے زندگی میں ایک بہت بڑا خلاء تھا۔ جسے اس تجربے نے بھر دیا ہے جیل بھی ایک دنیا ہے حسرت ناک اور عبرت ناک دنیا جسے دیکھے بغیر انسان کی شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے ایک بھٹی ہے جس میں پگھل کر ہی انسان زر خالص بنتا ہے جس نے یہ دنیا نہیں دیکھی اس نے کچھ نہیں دیکھا' زندگی میں ایک بار تو ہر ایک کو یہاں آنا ہی چاہئے' چاہے اسے اخلاقی جرم ہی میں کیوں نہ آنا پڑے' انسان کی زندگی میں بے شمار خلاء ہوتے ہیں' جنہیں وہ تجربات کے گارے سے پر کرتا رہتا ہے۔

زندگی تجربات کا میدان ہے' انسان کی تمام عمر تجربات حاصل کرنے میں کٹ جاتی ہے' یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جاتی ہے' لیکن تجربے ختم نہیں ہوتے' تجربات ان غلطیوں کا نام ہے جو ہم سے سرزد ہوتی رہتی ہیں ان غلطیوں کا سلسلہ لامتناہی ہے غلطی ہم عمر کی ہر سٹیج میں کرتے رہتے ہیں' ہر

آنے والے لمحے ہم اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ ہوشیار سمجھتے ہیں اور پھر زیادہ ہوشیاری سے نئی غلطیوں کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں، غلطی کرنا انسانی زندگی کی فطرت ہے ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہمیں پوری ہوشیاری سے غلطیاں کرتے رہنا چاہئے - ابتداء میں غلطیوں سے گھبراہٹ ضرور ہوتی ہے، لیکن گھبراہٹ کے اس پل صراط سے گزر جانے کے بعد انسان پوری جرات سے غلطیاں کرنے لگتا ہے، پھر ایک اسٹیج ایسی بھی آتی ہے کہ غلطی کو غلطی سمجھ کر کرنے میں ایک عجیب لطف حاصل ہوتا ہے، بعض غلطیاں بڑی پیاری ہوتی ہیں، وہ ہزاروں نیکیوں پر بھاری ہوتی ہیں وہ غلطی جس کی وجہ سے مجھے جیل آنا پڑا۔ ایسی پیاری غلطی تھی کہ جی چاہتا تھا حالات اجازت نہ بھی دیں پھر بھی بار بار اس کا ارتکاب کیا جائے اور حالات کا کیا ہے وہ کم بخت تو کبھی بھی کسی بات کی اجازت نہیں دیتے، معاملہ حالات تک رہتا تو ہم عالم وجود ہی میں نہ آتے، والدین نے حالات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہمیں پیدا کر دیا، پھر حالات کا انتظار کئے بغیر وہ اس دنیا سے چل دیئے - ہم نے حالات کا رخ دیکھے بغیر جینا شروع کر دیا - - - حالات تو ہمیشہ نا مساعد ہی رہتے ہیں - - - دنیا حالات کا منہ دیکھتی رہتی تو آج وہیں ہوتی، جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا - حالات کا مقابلہ کرنے میں ہی ارتقاء کا راز مضمر ہے، دنیا میں جتنے اولو العزم انسان گزرے ہیں سازگار حالات سے انہیں کم ہی سابقہ پڑا۔

میں اسی خیال میں کھویا ہوا تھا کہ شاہین آتے ہی مجھے گھسیٹ کر باہر لے چلا "کسی وقت گھومنا پھرنا بھی چاہئے - تم تو چارپائی سے نیچے قدم نہیں دھرتے صحت کا ستیا ناس کر بیٹھو گے "۔ اس نے ذرا سنجیدگی سے کہا - - -

میں مسکراتے ہوئے اس کے ہمراہ چل پڑا۔

"ہنسنے کی بات نہیں ہم لوگوں کے پاس صحت کے سوا رکھا ہی کیا ہے

یہی ہماری دولت ہے اور اس کا ہمیں پورا خیال رکھنا چاہئے" -
اچھا فرمایئے تو اب مال روڈ جانے کا ارادہ ہے یا کمپنی باغ -----
"تو کیا جہاں مال روڈ اور کمپنی باغ نہیں ہوں گے، وہاں بیٹھ بیٹھ کر جان ہلکان کرو گے" - پھانسی کی کوٹھڑیوں کے پاس پہنچ کر شاہین نے مجھے ٹھہرا لیا اور دور ہی سے تعارف کرانے لگا - اس کا نام طاؤس ہے، اس پر اپنے چچا زاد بھائی (ترپور) کے قتل کا الزام ہے - اس کی اپیل نا منظور ہو چکی ہے، رحم درخواست کا فیصلہ ہونا باقی ہے ---- دوسری کوٹھڑی میں وہ خوبصورت سا جوان جمیل ہے اس نے معمولی سے جھگڑے میں ایک شخص کو چاقو سے موت کے گھاٹ اتار دیا، اس کی اپیل اور رحم درخواست دونوں نا منظور ہو چکی ہیں، اب حکام جیل کوئی تاریخ مقرر کر کے اسے پھانسی دے ڈالیں گے ---- تیسری کوٹھڑی میں جو مریل سا شخص دیکھتے ہو وہ اپنے حقیقی بھائی کا قاتل ہے ---- اس زرد رو نوجوان نے اپنی بیوی کو ہلاک کیا ہے ---- ان دو لمبے دھڑنگے آدمیوں نے تین گاؤں والوں کو فائرنگ کر کے موت کی نیند سلا دیا --- وہ لمبی لمبی مونچھوں والا اجرتی قاتل ہے اس سے پہلے کئی دفعہ پھانسی کا حکم سن چکا ہے، لیکن خوش قسمتی سے ہر دفعہ بچ نکلا، لیکن اس دفعہ اس کے تمام سہارے ٹوٹ چکے ہیں، اس نو عمر لڑکے نے اپنے ایک دوست کو نشے کی ترنگ میں مار دیا - اس ٹھگنے سے قد والے نے اپنے داشتہ لڑکے کو ذبح کیا --- وہ پتلا دبلا لمبے قد کا لڑکا ایک قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا کہ پچھلے سال سامنے والی بارک کے اندر ایک شخص کو چاقو گھونپ کر ہلاک کر دیا - اس کی اپیل خارج ہو گئی ہے اور رحم درخواست منظور ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں -

پھانسی والوں سے آگے قصوریوں کی کوٹھڑیاں ہیں، قصوری جیل کی اصطلاح میں ان قیدیوں کو کہتے ہیں جو جیل میں کسی قصور، شرارت یا جرم کی بناء پر حکام جیل کی طرف سے سزا پاتے ہیں انہیں عموماً چکی میں بند کیا جاتا ہے بعض کو چکی پیسنے کی سزا ملتی ہے بعض کو تھوڑی دیر کے لئے برآمدہ میں ٹہلنے کی اجازت ہوتی ہے بعض کو یہ اجازت بھی نہیں ہوتی - یکایک شور و غل کی آوازیں سن کر ادھر ادھر دیکھنے لگا، شاہین نے میری حیرت دور کرتے ہوئے بتایا کہ جیل کے اس طرف پاگل خانہ ہے، یہ آوازیں وہیں سے آ رہی ہیں --- - جاتے جاتے ہم لنگر خانہ کے پاس پہنچے تو وہ بولا ---- سامنے بڑا پھاٹک کارخانے کا ہے جہاں قیدیوں سے قسم قسم کی مشقت لی جاتی ہے - اس نے مجھے بازو سے کھینچتے ہوئے کہا، آؤ آج تمہیں کارخانے کی سیر کرا لاؤں ---- میں اس کے ساتھ ہو لیا --- اندر پہنچ کر اس نے بتایا --- سامنے کمرے میں کرسی پر جو بھاری بھرکم توند والا شخص بیٹھا ہے وہ فیکٹری منیجر ہے، جیل میں سپرنٹنڈنٹ کے بعد منیجر ہی سب سے بڑا افسر ہوتا ہے، البتہ اس کے فرائض کارخانہ کے انتظام تک محدود ہیں، فیکٹری منیجر کے ماتحت چند اسسٹنٹ جیلر کام کرتے ہیں، فیکٹری کا ایک بڑا دفتر ہے اور ایک سٹور ---- وہ رنگ سازی کا کمرہ ہے یہاں فرنیچر تیار ہوتا ہے، یہ لوہار خانہ ہے، یہاں نوار تیار ہوتی ہے، یہاں چکیں بنتی ہیں، یہ درزی خانہ ہے، یہ کپڑے کا کارخانہ ہے، اس کمرے میں کمبل بنتے ہیں اس کے اگلے کمرے میں دریاں اور قالین تیار ہوتے ہیں --- گرمی ہو یا سردی، قیدیوں کو بارکوں میں اندر رہ کر ہی کام کرنا پڑتا ہے --- کارخانے کے لئے لکڑی، سوت، اون اور دوسرا ہزاروں لاکھوں روپے کا تمام سامان سپرنٹنڈنٹ اور منیجر کی مرضی اور مصلحت سے خریدا جاتا ہے -

فیکٹری کا ایک اپنا پریس ہے جس کا انچارج ایک اسسٹنٹ جیلر ہوتا ہے اس پریس سے جیل کا ایک ماہانہ آرگن بھی شائع ہوتا ہے جو قیدیوں کی اصلاح کی غرض سے جاری کیا گیا ہے اور شاید اسی لئے اس کا نام بھی اصلاح رکھا گیا ہے لیکن طباعت اور اشاعت کی تمام سہولتوں کے باوجود وہ مشہور عالم جنتریسے بھی کہیں گھٹیا صورت میں چھپتا ہے۔

تازہ شمارہ دیکھا بارہ مختصر مضامین میں سے آٹھ مدیر صاحب کے اپنے قلم کے تھے اور لطف یہ کہ اس جیل میگزین میں جیل کی اصلاح یا قیدیوں کے متعلق ایک لفظ بھی نہ پایا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس پرچے کو شہر میں بکنا چاہئے' دوم اس کا مدیر کوئی پڑھا لکھا قیدی ہو' جو نہایت آسانی سے بل سکتا ہے' تیسرا اس میں مضامین سے زیادہ تر قیدیوں کی ذہنی اصلاح' جرائم کے سدباب اور جیل کی اصلاح کا کام لیا جاسکتا ہے' لیکن غلط ہاتھ میں پڑھ کر یہ ایک نہایت کار آمد چیز بھی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔

اس پرچے کا منتظم اور ایڈیٹر داروغہ تعلیم ہے جو تعلیم کے سوا ہر چیز میں ماہر ہوتا ہے' جیل والوں کا خیال ہے' ہماری حکومت جو مڈل فیل وزیر تعلیم مقرر کرنے کا خاص خیال رکھتی ہے تو اس میں ضرور کوئی راز ہے' ان دنوں کوئی بنگش داروغہ تعینات تھا۔ جو بعد میں غالباً" ڈیرہ اسماعیل خان تبدیل کر دیا گیا' جس کا علم و ادب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور اس بات کا اقرار وہ نہایت فخر سے کیا کرتا تھا۔ چرس بے تحاشا پیتا' جس سے طبیعت چڑچڑی ہوگئی تھی۔ منیجر' سپرنٹنڈنٹ اور داروغہ سب کو بے تحاشا گالیاں بکتا رہتا' لیکن ان کے سامنے جاتے ہی اخلاص و مروت کا پیکر بن جاتا' سر عقیدت سے جھک جاتا اور زبان ان کی ثناء و تعریف میں رطب اللسان ہو جاتی۔

کمبل سلائی اور جگائی دونوں سخت ترین مشقتیں ہیں جو کمبل نئے بنے جاتے ہیں انہیں پیروں سے دھویا جاتا ہے' اسے کمبل سلائی کہتے ہیں - یہ مشقت اس لئے سخت ہے کہ صبح سے شام تک سیمنٹ کے چھوٹے چھوٹے تالابچوں میں کھڑا رہ کر ننگے پاؤں سے کمبلوں کو رگڑنا پڑتا ہے جس سے پاؤں کا ستیا ناس ہو جاتا ہے اور پاؤں کے تلوے اتنے کچے ہو جاتے ہیں کہ ان سے خون بہنے لگتا ہے' پاؤں پھٹ جاتے ہیں اور ان میں سخت سوزش اور درد شروع ہو جاتا ہے - - - - سردیوں میں اکثر قیدی اس مشقت سے بیمار پڑ جاتے ہیں اور گرمیوں میں تپتی دھوپ میں گھنٹوں کھڑا رہنے سے ان کی حالت غیر ہو جاتی ہے -

جگائی بھی اسی نوعیت کی مشقت ہے اس میں پرانے کاغذات اور ردی اخبارات وغیرہ لا کر چھوٹے تالابچوں میں ڈال دیئے جاتے ہیں - قیدی پانی ڈال کر پاؤں سے ان کا مولو تیار کرتے ہیں - ان کے پاؤں پر چھالے پڑ جاتے ہیں اور بسا اوقات ان کے پاؤں کو ردی کاغذوں کے پن چھلنی کر دیتے ہیں' یہ مشقت ہر نئے قیدی کو ایک مہینے تک لازماً" کرنی پڑتی ہے' لیکن صاحب استطاعت اور صاحب اثر لوگ اس سے بچے رہتے ہیں - بعض قصوریوں سے بھی سزا کے طور پر مہینوں یہ مشقت کرائی جاتی ہے جس سے ان کی صحت تباہ و برباد ہو جاتی ہے'

ہم اپنی دھن میں چلے جا رہے تھے کہ اچانک ایک ادھیڑ عمر شخص نے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا - - - - شاہین نے تعارف کرایا - یہ مشہور آرٹسٹ ماسٹر فیروز ہیں جو نوٹ بنانے کے الزام میں دس برس قید گزار رہے ہیں - ماسٹر صاحب سے

بالمشافہ تعارف کا یہ پہلا موقع تھا - لیکن وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھے' میں ان کی تعریف سن چکا تھا اور ان سے ملنے کا اشتیاق بھی تھا - وہ بھی مجھے غائبانہ طور پر جانتے تھے بڑی گرم جوشی سے ملے اپنے کمرے میں لے گئے - جہاں اپنے آرٹ کے کچھ نمونے دکھائے - ایک طرف رنگ' برش' قلم' کاغذ اور دوسرا سامان بکھرا پڑا تھا - دوسری طرف کچھ مکمل و نا مکمل خاکے پڑے تھے ---- تھوڑی دیر کے لئے اس مختصر کمرے کی آرٹسٹک فضا نے مجھے قید و بند کے تصور سے آزاد کر دیا --- اتنے میں قیوم نمبردار آگیا اسے دیکھ کر میرے دل میں بچپن کی بہت سی یادیں جاگ اٹھیں ہم ایک ہی محلہ میں رہتے تھے' ایک ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے' وہ پڑھائی چھوڑ کر رنگسازی کا کام سیکھنے لگا' پھر شادی کرلی' بال بچے دار ہوگیا اپنے کام میں بہت کاریگر تھا' کافی پیسے کماتا اور خوب مزے سے زندگی گزارتا --- پھر ایک دن اچانک سنا کہ اس نے اپنی بیوی کو گولی مار دی ---- گرفتار ہوا' مقدمہ چلا' پھانسی کی سزا ہوئی اور رحم درخواست میں یہ سزا عمر قید میں بدل گئی --- اب وہ قیدیوں کے لباس میں سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا - تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ہم پھر ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوئے - میں نے شاہین سے پوچھا کارخانے میں کوئی چھٹی بھی ہوتی ہے؟ یہ سوال اسے چھیڑنے کو کافی تھا' بولا --- ہاں اتوار کی چھٹی ہوتی ہے دوسری چھٹیاں بھی ان کے لئے لازمی ہیں' لیکن محرم' شب برات اور عید کے سوا اور کوئی خاص چھٹی نہیں دی جاتی اس کا انحصار فیکٹری منیجر کی مرضی پر ہے بسا اوقات اتوار کے دن بھی اکثر کاریگروں کو کارخانہ میں کام کے لئے جانا پڑتا ہے' قیدیوں کو صبح سویرے ہی چائے پلا کر کارخانے میں مشقت کے لئے

لے جاتے ہیں' جمع دار کارخانے کے گیٹ پر ملازمتوں لور وارڈروں کے ساتھ
قیدیوں کی تلاشی لیتا ہے - - - - کارخانے میں صبح دو گھنٹے قیدیوں کو دینیات یا
درسی کتب پڑھائی جاتی ہیں - تعلیم لوئی جماعت سے چوتھی جماعت تک دی جاتی
ہے - انہیں مختلف کلاسوں میں بانٹ دیا جاتا ہے - پڑھانے کے لئے استاد بھی
یہیں سے لئے جاتے ہیں - - - - لن تمام باتوں کے باوجود قیدی اس تعلیم سے
کوئی استفادہ نہیں کر سکتے' کیونکہ تعلیم پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی اور نہ
ہی اس کے ذریعے قیدیوں کی اصلاح پیش نظر ہوتی ہے - پڑھائی کے بعد قیدی
مختلف بارکوں میں اپنی مقررہ مشقت کے لئے چلے جاتے ہیں - - - - شاہین نے
ایک قیدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ جو اس کے پاؤں میں زنجیر دی
دیکھتے ہو یہ بیرونی پنجے کے قیدیوں کی نشانی ہے' کارخانہ کے علاوہ قیدیوں سے کئی
قسم کی دوسری مشقت بھی لی جاتی ہے' پڑھے لکھے قیدیوں کو منشی اور کلرک
کے طور پر دفتر' چکر' بارکوں لور ہسپتال میں کام پر لگایا جاتا ہے' بعض سے
گوداموں اور لنگر خانہ میں کام لیا جاتا ہے' بی کلاس والوں کے لئے "خدمتی"
بھی انہی قیدیوں سے دیئے جاتے ہیں - افسران بالا اور وزراء کے بنگلوں' باغوں
اور ہسپتال وغیرہ میں جو قیدی باہر بھیجے جاتے ہیں - انہیں پنجے کے قیدی کہا جاتا
ہے' ان کے پاؤں میں زنجیر پہنا دی جاتی ہے یہ عموماً" تھوڑی سزا والے قیدی
ہوتے ہیں - انہیں علی الصبح باہر کام پر لے جاتے ہیں اور عصر کے وقت واپس
لے آتے ہیں' ان کے ساتھ حفاظت کے لئے نمبردار لور جمع دار وغیرہ ہوتے
ہیں -

میں نے کہا اس خوفناک گرمی میں بھی قیدیوں کو بارکوں کے اندر ہی سونا پڑتا ہے یہ تو بڑا ظلم ہے اندر انہیں خاک نیند آتی ہوگی ---- شاہین بولا --- ظلم تو یہاں قدم قدم پر ہے کس کس کا رونا روؤ گے - قیدیوں کو پابندی سے سونا اور پابندی سے اٹھنا پڑتا ہے' سردیوں میں سردی کی شدت سے جینا دو بھر ہوتا ہے تو گرمیوں میں بے پناہ گرمی اور پسینے کی سرانڈ سے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں ---- بڑے بڑے سرکش مجرموں کو یہاں آکر ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں - جو قیدی خوددار یا سرکش ہو اس سے سخت مشقت لی جاتی ہے - اس پر بھی وہ ٹھیک نہ ہو تو چکی پیسنے کی بھی مشقت دی جاتی ہے - ڈنڈہ بیڑی بھی لگائی جاتی ہے اور ہفتوں چکی سے باہر نہیں نکالا جاتا' اس سے قیدی کی اصلاح کے بجائے اس کی جھنجلاہٹ بڑھ جاتی ہے اور وہ ڈھیٹ بن کر رہ جاتا ہے' اس کی مجرمانہ ذہنیت کو تقویت پہنچتی ہے' وہ چرس' بھنگ' افیون کا استعمال شروع کر دیتا ہے'

ملک میں جرائم کا انسداد کرنا حکومت کا سب سے پہلا فریضہ ہے لیکن گزشتہ سات برس میں برسر اقتدار لوگوں نے اس سلسلہ میں کوئی تعمیری قدم اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی ---- مجرموں کو مروجہ قوانین کے تحت بھاری سزائیں دے کر جیلوں میں ٹھونس دینے سے جرائم کا انسداد ممکن نہیں - --- ظلم و جبر سے بگڑے ہوئے ذہنوں کی اصلاح کبھی نہیں ہو سکی - بلکہ ہمیشہ اس کا رد عمل بد ترین نتائج کا حامل ہوتا ہے بچہ غلطی کرے تو مار پیٹ سے اس کا تجسس اور بڑھتا ہے اور وہ غلط راہ پر چل نکلتا ہے - ضرورت اس امر کی ہے کہ جسمانی سزا کے بجائے اسے نفسیاتی طور پر غلطی کا احساس دلایا جائے - اس طرح وہ آئندہ کبھی بھول کر بھی غلطی کا مرتکب نہ ہوگا۔

جیلوں میں مجرموں سے حکام کا تشدد اور سفاکانہ رویہ جرائم کے جذبے کو کچلنے کے بجائے اسے اور ہوا دیتا ہے۔ مجرم کے مزاج میں ایک ایسی تلخی پیدا ہو جاتی ہے جو نہایت خوفناک ثابت ہوتی ہے۔ جبر و تشدد سے دبا ہوا غم و غصہ اندر ہی اندر پرورش پاتا رہتا ہے اور جب بھی اسے موقع ملتا ہے وہ اس کا انتقام سوسائٹی کے دوسرے افراد سے لیتا ہے جیل میں جو ذلت آمیز زندگی قیدیوں کو گزارنا پڑتی ہے، باہر جا کر اس کا ازالہ کرنے کے لئے وہ ناجائز ذرائع سے حصول دولت کی کوشش کرتے ہیں، اس کے لئے وہ جرائم کے بڑے بڑے منصوبے تیار کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ زہر ساری سوسائٹی کے جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔

ہم واپس آئے تو عصر کی چائے پر ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔

جیل میں جو اخبارات ہمیں ملتے ہیں ان میں کوئی بھی آزاد اخبار نہ تھا۔ لیکن اس گھٹے ہوئے ماحول میں یہ نیم سرکاری اخبار بھی غنیمت معلوم ہوتے، اخباروں کو دیکھتے ہی ہم بری طرح ٹوٹ پڑتے، ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی کہ

اور اس کا ذہن مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔۔۔۔ جیل خانہ کے مخصوص نظام میں قیدی کی اصلاح تو کیا ہوگی، البتہ یہ ماحول اسے مجرم بنانے میں کافی مدد دیتا ہے۔ اکثر قیدی حکام جیل کی بد سلوکیوں اور ظلم و تعدی کو برداشت نہیں کر سکتے، ان کے ذہن ماؤف ہو جاتے ہیں وہ نیم پاگل ہو جاتے ہیں اور پھر پاگل خانے بھجوا دیئے جاتے ہیں۔

غرض جیل میں اس کی خشک زمین کی طرح وہ سب کچھ ہے جس سے زندگی کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں اور حیات مرجھا جاتی ہے نیا قیدی کچھ دن اپنے آپ کو سنبھالنے کی ناکام جدوجہد کے بعد آخر اس گلے سڑے اور متعفن

ماحول کے حوالے کر دیتا ہے اور رفتہ رفتہ خود کو بھول جاتا ہے -
شاہین کی تقریر جاری تھی - اس نے ذرا ستانے کے بعد کہنا شروع کیا -
- - - جیل کو مجرموں کی ذہنی اصلاح کی درس گاہ ہونا چاہئے اسے ذہنی امراض کا ہسپتال ہونا چاہئے لیکن ہمارے جیل جرائم کی تربیت گاہ ہیں - بد اخلاقی کا اکھاڑہ ہیں یہاں مجرم ایک بیماری لے کر آئے تو صحت یاب ہونے کے بجائے کئی متعدی امراض کا شکار ہو جاتا ہے ان امراض کے جراثیم کو وہ باہر جا کر سوسائٹی میں پھیلاتا ہے اور سارے معاشرہ کی صحت کو تباہ وہ برباد کر ڈالتا ہے -
غیر ملکی حکمرانوں کو ہمارے ملک و قوم سے کوئی ہمدردی نہ تھی - وہ ہماری قوم کی خرابیوں کی اصلاح کے بجائے ہمیشہ ان میں اضافہ کرنے کی فکر میں رہے وہ ہمیں نا اہل ثابت کرکے زیادہ سے زیادہ مدت تک زیر نگیں رکھنا چاہئے تھے - انہوں نے اپنے ظالمانہ قوانین سے ہمیشہ مطیع رکھنے کی کوشش کی وہ سنگینوں کے سائے میں حکومت کرنے کے قائل تھے' چنانچہ جیلوں میں بھی انہوں نے کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت محسوس نہ کی قیام پاکستان کے بعد بھی یہاں وہی ظالمانہ قوانین رائج ہیں -
سب سے پہلے وہ دیکھیے - - - - رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں یہی ایک ایسا موقع ہوتا' جب کہ ہمیں آپس میں تصادم کا خطرہ محسوس ہونے لگتا - باہر کی دنیا سے رابطہ رکھنے کا واحد ذریعہ یہ اخبارات ہی تھے - اس لئے نہایت بے صبری سے ان کا انتظار کیا جاتا' اخبارات صبح ہی صبح آجاتے لیکن ہمیں دوپہر سے پہلے کبھی نہیں ملے' ڈیوڑھی میں سپرنٹنڈنٹ اور داروغہ سے لے کر معمولی

ملازمین تک اخباروں کو پوری طرح چاٹ لینے کے بعد اندر بھجواتے ---- ہم میں صنوبر کاکا اور ارباب غفور اس معاملہ میں نہایت صبر ناک واقع ہوئے تھے وہ سب سے آخر میں پڑھتے اور پوری دل جمعی سے پڑھتے - ہمیں ایک ہی نظر میں اخبار پڑھ لینے کا ڈھنگ آتا تھا' لیکن خوشحال کاکا بڑے بور تھے - انہیں ہر اخبار کو شروع سے آخر تک حرف بہ حرف پڑھنے کا جنون تھا - یہاں تک کہ اشتہارات بھی پڑھ ڈالتے - پھر ان کے پڑھنے کی رفتار بھی صبر آزما تھی - اگر شروع ہی میں اخبار ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو ہمیں بے حد مایوسی ہوتی کیونکہ آسانی سے اس کا واپس ملنا دشوار ہو جاتا -

ہم سات سیاسی قیدیوں کا قافلہ بی کلاس کے اس نئے کمرے میں قیام پذیر تھا' پانچ قیدی خدمت کے لئے تھے جو ہمارے پاس ہی رہتے تھے - یہ کمرہ بڑا ہوتے ہوئے بھی اتنے سارے آدمیوں کے لئے یقیناً" ناکافی تھا - لیکن ہم خوش تھے - کیونکہ آپس میں ہمارا وقت اچھا کٹ رہا تھا - ہم سب مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے' اس لئے قدرتی طور پر مختلف الخیال تھے - لیکن ہم میں بے مثال یک جہتی اور اتفاق و اتحاد تھا - ہم آپس میں بھائیوں کی طرح مل جل کر گزار رہے تھے - کسی سے کسی کو کوئی شکایت پیدا ہونے کا موقع نہ ملتا - ارباب غفور' صنوبر کاکا اور خوشحال کاکا ہم میں بزرگانہ حیثیت رکھتے تھے ہم سب ان کا حد درجہ احترام کرتے وہ بھی ہمیشہ شفقت سے پیش آتے ---- کوئی ذرا اداس نظر آتا تو سب اس کے گرد جمع ہو جاتے - کسی کو کوئی تکلیف ہوتی تو سب کے سب مضطرب و بے قرار نظر آتے --- اس بے نظیر اتفاق کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نظریاتی اختلافات کے باوجود ہم سب میں ایک قدر مشترک موجود تھی اور وہ ملک و وطن کی خدمت کا جذبہ تھا - ہم سب حزب اختلاف سے

تعلق رکھتے تھے اور ملک و قوم کی بہتری کے لئے برسر اقتدار پارٹی کی بے راہ روی پر نکتہ چینی ہمارا سب سے بڑا جرم تھا' اسی ناقابل عفو جرم کی سزا بھگتنے کو ہم سب اپنا گھر بار بال بچے' کاروبار' شہری زندگی اور تمام آسائشیں چھوڑ کر ان آہنی دیواروں کے سائے میں پڑے پگھل رہے تھے۔

مولانا نور الحق کار آمد شخص تھا۔ اس کی عمر سینتالیس برس کے قریب تھی' مجلس احرار سرحد کا جنرل سیکرٹری اور انتھک کارکن ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے اپنی خوش اخلاقی اور خوش خلقی کے باعث ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ میں بتا چکا ہوں' کہ وہ ہمارا وزیر خوراک تھا۔ نظم و نسق قائم رکھنے' روزانہ ناپ تول کر سامان لانے' مشقتیوں سے مناسب کام لینے اور دوسرے تمام انتظامات کے لئے مولانا ہی کو زحمت اٹھانا پڑتی اسے ایک لمحہ کے لئے بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا' یہاں تک کہ بعض اوقات ان مصروفیات میں اس کی نماز بھی قضا ہو جاتی' ہم سب بلا امتیاز بڑے نکمے واقع ہوئے تھے' سوائے لکھنے پڑھنے' باتیں کرنے اور سونے کے ہم سے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مولانا نور الحق کھانا چن کر ہمیں بلاتے تو پتہ چلتا کہ کھانے کا وقت ہوگیا ہے حتیٰ کہ رات کو ہمارے بستر بھی باہر لگواتے اور پھر صبح ہوتے ہی انہیں کمرے میں ڈلوا دیتے' غسل کے لئے پانی تیار کراتے' کپڑے دھلواتے' کوئی بیمار پڑتا تو ہسپتال سے دوائی منگواتے' کمرے میں روزانہ فینائل چھڑکواتے' حجامت کے لئے نائی کو پکڑ کر لاتے ۔ ۔ ۔ ۔ مختصر یہ کہ ہمیں اپنے ہاتھ سے پانی بھی اٹھ کر نہ پینا پڑتا ۔ ۔ ۔ ۔ میں بعض اوقات مذاق سے کہتا مولانا تمہارا تکلف ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ ورنہ ہم چلے جائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ اپنے مخصوص انداز میں جواب دیتا " بھئی ابھی سے جانے کی رٹ مت لگاؤ' ابھی

بہت وقت پڑا ہے، ایک دفعہ یہاں آجاؤ تو پھر ذرا مشکل ہی سے جانا ہوتا ہے"

مولانا کی داڑھی اتنی کالی تھی کہ معلوم ہوتا۔ ابھی ابھی تازہ خضاب کرکے آرہے ہیں، میں انہیں چھیڑنے کے لئے کہتا مولانا یہاں جیل میں کون دیکھنے والا ہے جو تم روزانہ خضاب کرتے ہو -------- وہ قسمیں کھانے لگتا کہ میں نے کبھی خضاب نہیں لگایا۔ بالوں کا رنگ ہی ایسا ہے پھر میں شرارتاً پوچھتا اچھا اتنا تو بتاؤ کہ یہ خضاب لگاتے کس وقت ہو ----- وہ پھر قسمیں کھانے لگتا اور میں کہتا خیر ہے مولانا قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں۔ خضاب بے شک لگاؤ لیکن روزانہ یہ تکلف نہ کیا کرو۔ باہر روزانہ شیو کرتے تھے۔ یہاں دو دو تین تین دن یونہی گزر جاتے ہیں۔

مولانا آخر چڑ جاتا اور ہمیں برا بھلا کہنے لگتا، معاملہ بگڑتا دیکھ کر ہم اسے منانے لگتے اور الفاظ واپس لے کر معاملہ رفع دفع کرتے۔

گرمی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، ہمارے کمرے میں آدمی بھی مقررہ تعداد سے دگنے تھے اور بجلی کا پنکھا بھی نہیں تھا۔ دوپہر تک تو جوں توں کرکے گزارا چل جاتا لیکن دوپہر کے بعد کمرہ لوہے کی طرح تپ جاتا، سلاخ دار دروازوں پر کمبل لٹکا کر بند کردیئے تو جس سے دم گھٹنے لگتا اور کھلا چھوڑتے تو دھوپ اندر پھیل جاتی ------ ساری دوپہر ہم باری باری نہاتے رہتے لیکن نہانے کے بعد پھر وہی پسینے ------ پنکھا جھلتے جھلتے ہاتھ شل ہو جاتے، پانی پی پی کر پیٹ پھول جاتے۔ ایک دن میں نے کہا نہ جانے کس جرم کی سزا میں ہمیں یہ دوزخ ملا ہے، صنوبر کاکا بولے تم لوگ اسلامی حکومت کے خلاف تقریریں کرتے ہو تمہیں دوزخ ہی میں رہنا چاہیے" کاکا جی لیکن میں نے تو کوئی

تقریر بھی نہیں کی ---- میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ---- افضل بولا' ---- تم کوئی تقریر نہیں کرو گے تو حکومت تیرا منہ دیکھتی رہے گی --- پھر کاکا جی نے ڈیرہ جیل کی گرمی کے دل دہلا دینے والے واقعات سنائے جہاں انہوں نے پچھلی گرمیاں گزاری تھیں - انہوں نے بتایا میں وہاں "سی" کلاس میں تھا - ڈیرہ کی گرمی الامان و الحفیظ ------ دن بھر بدن پر پانی انڈیل کر یا بھیگی ہوئی چادر لپیٹ کر گزر کرتے تھے لوگ چلتے چلتے گر کر بے ہوش ہو جاتے اور ہسپتال پہنچتے پہنچتے عدم آباد جا پہنچتے' ڈیرہ کے بعد منٹگمری' ملتان اور سبی کے جیلوں کا تذکرہ ہونے لگا - جو ساتھی وہاں دن گزار رہے تھے - ان کے لئے دل ہمدردی کے جذبات سے بھر آئے - وہاں کی حالت کا تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ہم تھوڑی دیر کے لئے اپنا تمام دکھ بھول گئے -

یہ چند دن بڑے بدمزگی سے گزرے' لکھنا' پڑھنا' گھومنا پھرنا سب کچھ جاتا رہا حتیٰ کہ خوراک بھی کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی اور وزن کم ہونے لگے -

سپرنٹنڈنٹ کو پنکھے کے متعلق بار بار کہا گیا لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی --- - اس دن صاحب بہادر نے راؤنڈ پر آنا تھا - ان کی آمد کے لئے وہ اہتمام ہو رہا تھا کہ ہمارے ہاں شاہ ایران کی آمد پر بھی نہ ہوا ہوگا - صبح ہی سے صفائی اور چھڑکاؤ ہونے لگا' نالیوں میں فینائل ڈالی گئی' لوہے کے جنگلوں اور دروازوں کو تیل سے چمکایا گیا - وارڈر' نمبردار اور سپاہی سارے جیل میں پھیل گئے کوئی قیدی بارک سے باہر نہ رہے کسی بارک کا دروازہ کھلا نہ رہے ----- یہ سب کچھ ہو چکا تو پہلے چکر جمعدار نے آکر دیکھا کہ کوئی کمی نہ رہ گئی ہو - پھر داروغہ صاحب نے آکر ملاحظہ فرمایا اور جب انہیں پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ "سب

اچھا ہے" تو پھر کہیں جا کر سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کو لایا گیا ان کی آمد بھی عجیب ڈرامائی انداز سے ہوئی ۔۔۔۔۔ آگے سبز پوش وارڈر' دائیں بائیں وارڈر' پیچھے داروغہ صاحب' اسسٹنٹ جیلروں' کلرکوں' نمبرداروں' وارڈروں' سپاہیوں اور جمعداروں کا ایک ہجوم ۔۔۔۔۔۔ ساتھ ساتھ ہٹو بچو کی آوازیں ۔۔۔۔۔۔ سارے جیل پر ایک دہشت اور خوف کا عالم طاری جیسے کوئی طوفان آرہا ہو' آسمان ٹوٹنے والا ہو' قیامت آنے والی ہو ۔۔۔۔۔ صاحب بہادر کے راؤنڈ پر نکلنے کے بعد جیل کے ہر حصہ میں لحظہ بہ لحظہ اطلاعات موصول ہوتی رہتیں ۔ صاحب بہادر فلاں جگہ پہنچ چکے ہیں' اب فلاں راستے سے ہو کر فلاں جگہ جائیں گے اور پھر فلاں طرف سے فلاں طرف کو ۔۔۔۔۔ اخلاقی قیدیوں کو صاحب بہادر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہ تھی' سر جھکائے بیٹھے رہنے کا حکم تھا ۔ کوئی سر اٹھا کر دیکھ لے تو فوراً" پیشی ہو جاتی اور سخت سزا ملتی ۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ قیدیوں پر محض صاحب بہادر کا رعب داب قائم رکھنے کے لئے کیا جاتا ۔۔۔۔۔ سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت خداوند سے کم نہیں تھی' اس کا نام سنتے ہی جسموں پر کپکپی طاری ہو جاتی اور سر جھک جاتے ۔

صاحب بہادر ہمارے کمرے میں آیا تو احتیاطاً" سارے سٹاف کو باہر ٹھہرنے کا حکم دیا ۔ اسے معلوم تھا کہ سیاسی قیدی بڑے بدتمیز ہوتے ہیں ۔ ان کم بختوں کو جیل کے آداب تک نہیں آتے' وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ بڑے افسروں سے کس طرح ملنا چاہئے' اور کس طرح بات کرنا چاہئے ۔ وہ جانتے تھے کہ اندر جاتے ہی کوئی نہ کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہو گا ۔ ایسے موقع پر بعض ایسی ناخوشگوار صورتیں پیش آجاتیں کہ ملازمین کے سامنے صاحب بہادر کی بے عزتی ہونے کا خدشہ ہوتا ۔۔۔۔ اور ہوا بھی وہی ۔۔۔۔۔ انہیں دیکھتے ہی ہم نے پھر اپنا مطالبہ دہرایا' انہوں نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا ۔ ارباب

غور نے ذرا سختی سے کہا ----- یہ ہمارا حق ہے آپ کو پنکھا لگانا ہوگا -----
معاملہ نے طول کھینچا، تو تو میں میں تک نوبت پہنچی صاحب بہادر نے رعب
جمانا چاہا - ارباب صاحب نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا ------ صاحب بہادر
ان گستاخیوں کے عادی نہ تھے وہ لال بھبوکا ہو کر بڑبڑاتے ہوئے نکل کر جاتے
ہے -

یہ خبر آن کی آن میں جیل کی مختصر دنیا کے کونے کونے میں جا پہنچی ---
-- کچلے اور دبے ہوئے بیچارے اخلاقی قیدی مزے لے لے کر اس جھگڑے کی
روداد ایک دوسرے کو سناتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے ----- جیل میں
سیاسی قیدیوں کی آمد اخلاقیوں کے باعث رحمت اور حکام کے لئے عذاب جان بن
جاتی ہے، اخلاقی خوش ہوتے ہیں، کہ سیاسیوں کے آنے سے جیل کے خدائی
فوجداروں کی رعونت میں کسی حد تک لچک پیدا ہو جاتی ہے سیاسی حکام جیل کی
فرعونیت سے مرعوب نہ ہوتے ان کے ناجائز سلوک کے خلاف احتجاج کرتے -
قیدیوں کے جائز حقوق کے لئے پوری جرات سے نبرد آزما ہوتے اور حکام کی
دھمکیوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے ----- ادھر حکام جیل کا وقار سیاسیوں کی
نکتہ چینی سے مجروح ہوتا - ان کی خدائی پر حرف آتا، اس لئے وہ گھبراتے اور
بعض اوقات بد حواس ہو جاتے -

سپرنٹنڈنٹ شیخ صاحب کو میں پہلے سے جانتا تھا وہ ہنس مکھ اور بھلے مانس
تھا - جیل میں بھی وہ مجھ سے ہمیشہ اچھی طرح پیش آتا رہا - لیکن افسری کے
عارضے نے اس سے وہ سدابہار مسکراہٹ اور خوش خلقی چھین لی تھی - اگرچہ
اب بھی جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ کئی دوسرے افسروں سے بہتر تھا - لیکن
سابقہ آشنائی کی وجہ سے اس کے کردار میں تصنع آمیز تبدیلی سے مجھے بڑا دھچکا
لگا - روایتی افسرانہ شان قائم رکھنے کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے - اس کے

چہرے کی تمام سرخی اور گداز منقلب ہو کر شقاوت و کلبیت کے سانچے
میں ڈھل گئے تھے۔ اسے سارا دن ماتھے پر تیوری چڑھا کر اور زبان پر زہریلا
ڈنگ جما کر بیٹھنا پڑتا۔۔۔۔۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آنے لگا۔۔۔۔۔ آہ
بے چارا صاحب بہادر بننے سے پہلے کتنا اچھا آدمی تھا۔ اس زندگی سے وہ خود
بھی مطمئن نہ ہوگا۔ یہ سب کچھ اسے مجبوراً" کرنا پڑتا ہے مجھے یقین تھا اپنی ان
نازیبا حرکات پر تنہائی میں وہ خود بھی اپنے آپ کو ضرور کوستا ہوگا۔

شیخ صاحب علم دوست شخص تھا' سارا دن دفتر میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتا
رہتا۔ جیل کا سارا نظام اس نے داروغہ کو سونپ رکھا تھا۔ داروغہ اتنا لالچی آدمی
نہیں تھا اور ہم سیاسی لوگوں سے تو وہ بالکل لالچ نہ کرتا۔ فروٹ کی تین ٹوکریاں
آتیں تو وہ صرف ایک رکھ کر دو ہمیں بھجوا دیتا۔ سگریٹ کی پانچ ڈبیوں میں
سے چار ہمیں مل جاتیں۔ عام طور پر وہاں نصف والا معاملہ چلتا تھا۔ وہ
خود سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن ایک ڈبی احتیاطاً" لے لیتا کیونکہ وہ اپنی ساکھ
خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک دن شربت کی چار بوتلیں آگئیں تو میں گھبرا گیا
لیکن وہ صبح و شام ہمارے ہاں آکر شربت پینے لگا تو میں نے اطمینان کا سانس
لیا۔۔۔۔۔ بال بچے دار آدمی تھے۔ تنخواہ میں گزر نہیں ہوتی تھی۔ لیکن
اس کے باوجود اس بیچارے نے ہم سے کبھی لالچ نہیں کیا۔۔۔۔۔ زیادہ ضرورت
پڑتی تو چالان کا چرچا کر کے کچھ کام چلا لیتا ویسے وہ قیدیوں سے وقتاً" فوقتاً"
قرض دام بھی لیتا رہتا جس کی ادائیگی کا موقع کبھی نہ آتا۔ کیونکہ وہ حساب
دوستاں در دل کا قائل تھا۔

اس ناخوشگوار واقعے سے ہماری طبیعتیں مکدر ہوگئیں اور ہم دیر تک
کڑھتے رہے۔ ایک دن اچانک افضل کے سگریٹ آگئے۔ جنہیں دیکھ کر ہماری
باچھیں کھل گئیں۔ رات گئے تک مسلسل سگریٹ پھونکتے رہے اور اس خوشی

میں گاتے اور مسکراتے رہے۔

اس دن صبح ہی صبح افضل کا موڈ بگڑا ہوا تھا اسے اپنی بیوی کی یاد ستا رہی تھی اپنے ہونے والے بچے کا خیال آرہا تھا۔ جو اس کی غیر حاضری میں جنم لینے والا تھا۔ افضل وکیل بھی ہے اور سرحد امن کمیٹی کا سیکرٹری بھی ----- وہ تیس برس کا اونچا خوبرو جوان ہے اسے گلے سڑے نظام سے نفرت ہے وہ سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا ہے اور ملک میں جمہوری نظام رائج کرنے کے لئے جدوجہد کرنا اس کی زندگی کا آدرش ہے۔ اس کا دل آئینہ کی طرح صاف اور زندگی کرنوں کی طرح بے داغ ہے۔ اس کی شادی کو ایک سال کا عرصہ ہوا ہوگا اور اب اسے اپنی محبوب شریک حیات سے جبرا" چھین کر جیل کی چار دیواری میں محبوس کروایا گیا----- اس کی تعلیم یافتہ بیوی اپنی کوکھ سے دو تین مہینے بعد ایک نئی زندگی کو جنم دینے والی تھی جس کا باپ جیل میں تھا۔ حکومت کا معتوب تھا اور اس کی سزا ان لوگوں کو دی جا رہی تھی جو حکومت کے معتوب نہیں تھے بلکہ ایک ایسے دشمن کے لواحقین تھے جو حکومت کا معتوب تھا۔

افضل بڑا حوصلہ مند انسان ہے، اس کی فطری رجائیت ہمیشہ رنج و غم کے پتھروں کو جھٹک کر مصائب و آلام کی چٹانوں میں بھی اپنا راستہ بنا لیتی ہے۔ لیکن آج اس کے جذبات چھلکے پڑتے تھے ----- میں اور صنوبر کاکا اس کے خیالات کو موڑ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

صنوبر کاکا ساٹھ برس کا بوڑھا پہلوان 1916ء سے آج تک ملک کی جنگ آزادی میں زور بازو دکھا رہا تھا۔ وہ متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے علاوہ اٹھارہ بیس برس جلا وطن بھی رہ چکا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس امید پر وطن لوٹ آیا کہ انگریزوں کے اخراج کے بعد باقی زندگی اپنی قومی حکومت کے زیر سایہ آرام سے گزارنے کا موقع ملے گا۔ لیکن یہاں آکر دیکھا تو سنہری رو

پہلی خوابوں کے شیش محل دھڑام سے زمین پر آرہے' اس نے سیاست سے
کنارہ کش ہو کر ادبی اور صحافتی زندگی گزارنے کا تہیہ کرلیا اور اس مقصد کے
لئے ماہنامہ اسلم (پشتو) کا اجراء عمل میں لایا ۔ اس کے علاوہ پشتو کے ایک ترقی
پسند ادبی ادارے " اولسی ادبی جرگہ " کی داغ بیل بھی ڈالی ۔ لیکن 1956ء میں
سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کرکے ایک سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا اور ایک
سال گزرنے پر مزید چھ ماہ کا اضافہ کردیا گیا ۔ 1956ء کے اوائل میں تمام سیاسی
قیدیوں کے ساتھ وہ بھی رہا ہوا ۔ لیکن صرف پانچ ماہ باہر گزار پایا تھا کہ ہمارے
ساتھ ہی پھر ایک سال کے لئے اسیر زندان ہونا پڑا ۔ اس کی صحت بالکل گر چکی
ہے دل کی بیماری کا مستقل مریض ہے لیکن حوصلہ بلند اور عزم خارا شگاف
رکھتا ہے ۔ ایک دائمی مسکراہٹ اس کے بوڑھے چہرے پر ہر وقت کھیلتی رہتی
ہے ۔ چلم اور چائے میں اس کی زندگی ہے ۔ یہ دونوں چیزیں اس کے مرض کے
لئے زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہیں ۔ لیکن اس زہر سے پرہیز کرنا ان کے بس کا
روگ نہیں ۔

صنوبر کاکا نے شادی نہیں کی' اس لئے اولاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'
وہ اپنی متبنیٰ بیٹی کو بہت چاہتا ہے اس پر جان چھڑکتا ہے اور لمحہ کے لئے بھی
اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے نہیں دیتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس حقیقت سے شاید
اس کے چند ایک قریبی دوست ہی آگاہ ہوں گے کہ کاکا کو اپنی بیٹی کتنی عزیز ہے
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اتنی کہ شاید اپنی حقیقی اولاد سے بھی کسی کو کم ہی اتنی محبت ہوگی ۔
لیکن جیل میں آنے کے بعد اس نے کبھی بھول کر بھی ذکر نہ کیا ۔

افضل کو اداس دیکھ کر کاکا نے کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے دکھ بڑے ہیں لیکن
ہماری قوم' ملک اور دنیا بھر کے انسانوں کے دکھ جن کے لئے ہم یہ دکھ جھیل
رہے ہیں ان کے لئے ہمیں اپنے دکھوں کو بھول جانا چاہئے اور پھر یہ دکھ بھی تو

انہی انسانی دکھوں کا ایک حصہ ہیں۔
کاکا جی کی اس فلسفیانہ گفتگو نے افضل کے دل سے درد و غم کا سارا غبار دھو ڈالا۔ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ ناچنے لگی اور وہ جھوم جھوم کر وطنیت میں ڈوبا ہوا ترانہ گانے لگا۔

یہ وطن --- یہ وطن ---- یہ میری ماں کا وطن
اس کی حفاظت کے لئے میں اپنا سب کچھ لٹا دونگا
اپنی محبت تک قربان کردوں گا
مجھے اس کی خاک سے محبت ہے
اس میں میرے اجداد کی ہڈیاں دفن ہیں

ارباب عبدالغفور خان کا
سلوک ہم سے مہربانہ اور مشفقانہ تھا۔ مجھے پہلے پہل انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ بحیثیت انسان پاکیزہ اور بلند کردار شخص ہیں۔ عمر کا قیمتی حصہ زندان کی نذر ہوا۔ 1930ء میں پہلی دفعہ کانگریس ایجی ٹیشن میں جیل آئے اور اس کے بعد آج تک بمشکل چند مہینے ہی باہر گزارے ہوں گے۔ کانگریس کے ساتھ وہ اس وقت تک وابستہ رہے جب تک وہ آزمائش کے دور سے گزر رہی تھی جب اس نے اقتدار سنبھالا تو انہوں نے اصولی اختلاف کی بناء پر الگ ہو کر "افغان جرگہ" بنا لیا۔ پھر 1945ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ اس جماعت کا ساتھ بھی انہوں نے انتہائی دشوار مراحل میں دیا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کے اقتدار پسند رہنماؤں سے ان کی نہ نبھ سکی۔ آپ نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے مل کر "عوامی لیگ" کی بنیاد رکھی اور گرفتار ہو کر نامعلوم مدت کے لئے جیل بھیج دیئے گئے چھ سال بعد تمام سیاسی قیدیوں کے

ساتھ رہا ہوئے اور اب پھر دفعہ چالیس سرحدی کے تحت ایک سال کی سزا بھگت رہے تھے۔

آپ خان عبدالغفار خان کے دست راست رہ چکے ہیں، سامراج دشمنی ان کی زندگی کا خاصہ ہے، ارباب صاحب، خوشحال کاکا اور صنوبر کاکا کی جدوجہد سے بھرپور زندگی پر نظر کرنے سے ہم ایسے نوگرفتار اور ناتجربہ کار نوجوانوں کے لڑکھڑاتے ہوئے عزائم فولاد کی طرح مضبوط اور پہاڑوں کی طرح بلند ہو جاتے۔

جیل میں سیاسی قیدیوں سے بھی مشقت لی جاتی ہے، ہم سیفٹی ایکٹ کے تحت نظربند تھے۔ ہمارے لئے مشقت نہیں تھی اور چونکہ مشقت نہیں تھی اس لئے فرصت ہی فرصت تھی ۔۔۔۔ شروع شروع میں تو کچھ گرمی کی شدت نے بدحواس کیا۔ کچھ نوگرفتار ہونے کے باعث اسیری نے پریشان رکھا۔ کچھ ملنے والوں نے دم نہ لینے دیا ۔۔۔۔ اب جو ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو سوچا کہ یوں کام نہیں چلے گا۔ تمام عمر یہی آرزو رہی کہ کاش لکھنے پڑھنے کے لئے فرصت مل سکتی اور اب جو فرصت میسر آئی ہے تو اس سے فائدہ نہ اٹھانا انتہائی بد نصیبی ہوگی ۔۔۔۔ یہ سوچ کر پروگرام بنانا شروع کیا۔ سب سے پہلے خیال آیا، کوئی امتحان دے ڈالوں، معلوم ہوا چیف سیکرٹری سے اجازت لینی ہوگی ۔۔۔۔ وہاں ہماری زندگی میں دو شخصیتوں کا بڑا دخل تھا۔ ایک "چیف سیکرٹری" دوسرا "چکر جمعدار" ۔۔۔۔ ہمیں قدم قدم پر ان دو ہستیوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ بجلی خراب ہو۔ خدمت کی ضرورت ہو۔ نلکوں میں پانی نہ ہو۔ ڈاکٹر نہ ملتا ہو، داروغہ یا سپرنٹنڈنٹ سے ملنا ہو، حجامت کے لئے نائی کی ضرورت ہو، غرض کہ تمام داخلی امور کے لئے چکر جمعدار ہی سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ اس کے برعکس جہاں تک خارجی ضروریات کا تعلق تھا۔ چیف سیکرٹری کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ پتہ بھی ہل نہیں سکتا تھا۔

چیف سیکرٹری داخلی امور سے بھی لا تعلق نہ تھے - سپرنٹنڈنٹ اور داروغہ سے
جب بھی ہم کسی بات کے متعلق کہتے وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا کہ اس کے
لئے چیف سیکرٹری سے اجازت لینی پڑے گی - ارباب سکندر نے ریڈیو کے لئے
کہا - سپرنٹنڈنٹ بولے چیف سیکرٹری کو درخواست دیجئے - درخواست دی گئی جو
نامنظور ہوگئی - حالانکہ ڈیرہ' ہری پور اور سندھ و پنجاب میں بی کلاس قیدیوں کو
یہ سہولت حاصل تھی - خوشحال کاکا نے ستار کے لئے کہا انہیں بھی یہی ہدایت
ہوئی اور یہی نتیجہ نکلا' حالانکہ اپنے پندرہ برس کے زمانہ اسیری میں ستار ہمیشہ ان
کے ساتھ رہی - لیکن وہ جیل ہی کیا جہاں نئے نئے احکام نہ ہوں'

ہمارے ایک خوش مزاج دوست سردیوں میں صبح ہی صبح خدمتی کو بلا کر
کہتے جاؤ بھئی چکر جمعدار سے کہو ہمارے کمرے میں ابھی تک دھوپ نہیں آئی

گرمیوں میں رات کو ہماری چارپائیاں باہر لگا دی جائیں تو جیل کے احکام
کے مطابق جمعدار آکر ایک لمبی اور مضبوط زنجیر سے انہیں جکڑ کر تالا لگا دیتا -
افضل حیرت سے بولا آخر ان بیچاری چارپائیوں نے کیا گناہ کیا ہے جو انہیں پابہ
زنجیر کیا جا رہا ہے - میں نے کہا ان کا ہم سے جو تعلق پیدا ہوگیا ہے یہ اسی کی
پاداش ہے آپ نے غالب کا یہ مصرعہ نہیں سنا - ع

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد

ایک رات بارش آگئی ہم نے جمعدار کے لئے دو تین دفعہ آدمی بھیجا کہ
آکر زنجیر کا تالہ کھولے تاکہ چارپائیاں کمرے کے اندر کی جائیں' لیکن وہ نہ آیا -
ارباب سکندر نے کہا یہ جمعدار آخر آتا کیوں نہیں' صنوبر کاکا بولے چیف
سیکرٹری سے اجازت لینے گیا ہوگا - اس بات سے ہم بہت محظوظ ہوئے اور دیر

تک مزے لیتے رہے چنانچہ جب گھنٹہ بھر کے بعد جمعدار صاحب تشریف لائے تو بارش ختم ہو چکی تھی۔

سپرنٹنڈنٹ کی ہر بات پتھر پر لکیر ہوتی' ایک دفعہ جو بھی ان کے منہ سے نکل جائے' اسے الہامی درجہ حاصل ہو جاتا۔ چنانچہ اس کی کتنی ہی ناجائز بات کیوں نہ ہو اسے پورا کرنے اور منوانے کے لئے ساری مشینری حرکت میں آجاتی' جیل کے عملے کے ایک شخص نے ہمیں بتایا ہمارے پاس بہت سے ٹیبل کے پنکھے فالتو پڑے ہیں' لیکن چونکہ سپرنٹنڈنٹ صاحب ایک دفعہ انکار کر چکے ہیں اس لئے اب وہ کبھی بھی آپ کو پنکھا نہیں دیں گے۔ کچھ دنوں بعد اس نے کہا۔ آپ لوگوں نے وزیروں اور حکام بالا سے جو شکایت کی ہے۔ اس سے سپرنٹنڈنٹ صاحب کچھ گھبرائے ہیں' اب وہ آپ کو پنکھا دینا تو چاہتا ہے لیکن انہیں کوئی ایسا طریقہ نہیں سوجھتا جس میں ان کی ہیٹی نہ ہو۔

ہاں تو بات امتحان کی ہو رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ستمبر میں سپلیمنٹری امتحان ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے لئے درخواست دے دی۔ اب کتابوں کا پرابلم تھا۔ ملاقات تو ویسے ہی بند تھی۔ خط لکھو تو سنسر کے مراحل طے کرنے میں ہی مہینہ ڈیڑھ لگ جاتا' بہرحال کسی نہ کسی طرح گھر اطلاع بھجوا دی۔ کورس کے علاوہ کچھ تنقیدی کتابیں اور ایک نسخہ قرآن حکیم کا بھی مانگا تھا۔ کتابیں تو دوسرے دن ہی آگئیں۔ لیکن داروغہ صاحب نے بتایا کہ سنسر ہوئے بغیر نہیں مل سکیں گی اور سنسر ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ چنانچہ تقریباً" پندرہ دن بعد جب یہ سنسر شدہ کتابیں ملیں تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ قرآن کریم پر بھی سنسر شدہ کی مہر ثبت تھی۔ ارباب سکندر نے کہا کھول کر دیکھو کوئی آیت کاٹ نہ دی ہو۔

میں یہ لکھنا تو بھول ہی گیا کہ ہمیں اپنے کپڑوں کا بکس اور ضروری

سامان منگوانے میں کتنی دقت کا سامنا کرنا پڑا - بی کلاس والوں کو قانوناً" یہ سامان
منگوانے کا حق تھا - اخلاقی قیدیوں کا سامان آئے دن بلا روک ٹوک آرہا تھا -
لیکن ہمارے بکس بیسیوں دفعہ آکر واپس ہوئے پہلے تو سامان لانے والے کو
جیل کے احاطہ میں ہی نہ چھوڑتے اور جو کسی نہ کسی طرح وہ ڈیوڑھی تک پہنچ
جاتا - تو جیل کے ملازمین خشک آسامی دیکھ کر سامان لینے سے انکار کر دیتے - - -
- - کتنے دن تو ہمیں پتہ ہی نہ چلا اور گھر والوں کو کوستے رہے' جب حقیقت
حال معلوم ہوئی تو داروغہ سے شکایت کی - اس نے لا علمی ظاہر کی - آخر خدا
خدا کر کے لڑ جھگڑ کر ہم یہ سامان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے -

ہمیں نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے بھی افسروں سے جھگڑے مول
لینے پڑتے' ان کی ذہنیت کچھ ایسی مسخ ہو چکی تھی کہ کوئی جائز بات بھی وہ
آسانی سے ماننے کو تیار نہ ہوتے ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ
خواہ مخواہ حالات کو خراب کیا جائے - اس لئے ہم حتی الوسع معاملے کو سلجھانے
کی کوشش کرتے - لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ بعض کج فطرت افسر ہماری
اس شرافت کو کمزوری پر محمول کرتے اور ان کا رویہ اور زیادہ نا مناسب صورت
اختیار کر جاتا' بر خلاف اس کے یہ چیز بھی ہمارے مشاہدے میں آرہی تھی کہ
جو لوگ انہیں آنکھیں دکھاتے تھے' ان کی دلجوئی کا حتی الوسع خیال رکھا جاتا تھا
- افسروں کی یہ انوکھی ذہنیت ہمارے لئے ناقابل فہم تھی - کافی غور و خوض کے
بعد میں اس پر پہنچا کہ جرائم پیشہ لوگوں کے ماحول میں تمام عمر گزارنے کے
باعث ان کے اذہان بھی اس سانچے میں ڈھل گئے ہیں اور وہ اس مایوس کن
درجہ کو پہنچ چکے ہیں کہ اب ان پر اصلاح کا کوئی حربہ بھی کارگر نہیں ہوسکتا -
ان لوگوں کی باہر کوئی سوسائٹی نہ تھی' تعلقات نہ تھے' میل جول نہ تھا - رات
دن یہیں رہنا پڑتا - انہیں لوگوں سے سابقہ رہتا' وہی سستی سیاست' گھٹیا سوچ

نورالحق اپنی بیاض پر نوٹ کر لیتا' افضل اپنے گھر' ،میں 'کھ بھیجتا اور شاہین یاد کر کے قوالی کرتا' قوالی رات کے سناٹے میں جمتی زیادہ تر فیض کی نظمیں' غزلیں گائی جاتیں فیض نے جو کلام جیل میں لکھا ہے۔ اس کا لطف بھی جیل ہی میں آتا ہے۔ دست صبا کی بیشتر شاعری وارداتی ہے اور جب تک انسان ان حالات سے نہ گزرے جن سے شاعر کو گزرنا پڑا اس وقت تک اس کی حقیقی تاثیر اور حلاوت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

دن ڈھلتے ہی جب زنداں کے اداس احاطوں پر تاریکیاں برسنے لگتیں یہاں تک کہ تھک ہار کر لوٹنے لگتے تو فیض کا یہ شعر گنگنانے سے جو کیفیت پیدا ہوتی اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

در قفس پر اندھیروں کی مہر لگتی ہے!
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

یاس و حرماں کے خوفناک لمحوں میں اس شعر نے کیا کیا تسکین نہیں پہنچائی

صبا نے پھر در زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

ایک اور شعر میں ہفتوں گنگناتا رہا اردو میں اس کیفیت کے شعر بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں - میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکا۔ کہ اس شعر میں رجائیت کا اظہار کیا گیا ہے یا قنوطیت کا

اور کچھ دیر نہ گزرے شب فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے وہ یاد بھی کم آتے ہیں

رات کی ڈسنے والی تنہائیوں میں ہمارے دل درد سے بھر جاتے' بچوں' بیویوں اور دوستوں کی یاد میں آنکھیں نمناک ہو جاتیں' احباب کی چہکتی مہکتی محفلوں کے تصور سے چہروں پر اداسیاں ٹوٹ پڑتیں اور ہم میں سے کوئی ایک

اور پست خیالی ان کی زندگی کی اساس تھی' وہ بڑے افسروں کے سامنے جھکنا اور چھوٹوں کو جھکانا جانتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں آتا تھا انہیں ماحول نے کچھ نہیں سکھایا۔ بس یہی کہ ہر وقت تنے رہو' اکڑے رہو۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرو' کسی کو خاطر میں نہ لاؤ۔ انسان کو انسان نہ سمجھو۔ ایک بات میں نے یہ نوٹ کی کہ اپنے بچوں سے بھی ان کا سلوک ایسا ہی تھا۔ جیسا قیدیوں سے اور پھر ان بچوں میں بھی وہی خصائل پیدا ہو گئے تھے۔ ایک جیلر کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ اس نے اپنے نوجوان لڑکے کو کسی قصور کی بناء پر تین دن تک چکی میں بند رکھا اور یہ بات تو میرے اپنے مشاہدے میں آئی ہے کہ ایک افسر کا نو عمر بچہ کسی قیدی سے کہہ رہا تھا۔ مجھے گود میں اٹھا کر کارخانے لے چلو نہیں تو ابا سے کہہ کر پٹائی کراؤں گا۔

کتابیں ملتے ہی میں نے پورے زور شور سے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ دن کو ذرا کم ہی فرصت ملتی۔ البتہ رات کو جب کھانے کے بعد سب باہر اپنی اپنی چارپائیوں پر دراز ہو کر گپیں اڑاتے ------ میں کمرے کی تنہائی کا فائدہ اٹھا کر بارہ ایک بجے تک مطالعہ میں لگا رہتا ہرچند میری یہ حرکت نوجوان پارٹی کے لئے ناقابل برداشت تھی اور انہوں نے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو رہے

ہمیشہ کی طرح اب یہاں بھی مجھے پڑھتے پڑھتے شاعری کا دورہ پڑ جاتا اور میں کتابوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے کاغذ قلم لے کر شعر لکھنے بیٹھ جاتا۔ غزل مکمل ہوتے ہی دوستوں کو آواز دے کر بلاتا اور سنا کر داد وصول کرتا۔ رفتہ رفتہ مطالعہ میں وقت ضائع کرنے کی بجائے میں نے پوری باقاعدگی اور تسلسل سے شعر کہنے شروع کر دیئے کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ ایک آدھ نظم غزل نہوتی ہو۔ اور بعض اوقات تو ان کی تعداد دو دو تین تین تک پہنچ جاتی' یہ غزلیں مولانا

نہایت پرسوز اور دردناک لے میں پکار اٹھتا۔

اگر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

میں نے جب جیل میں پہلی غزل کہی تو دوسروں کے علاوہ مجھے خود بہت پسند آئی، اسمیں کچھ ایسی کیفیت تھی جو اس سے پہلے میسر نہ آئی تھی۔

ساغر ہے نہ مئے ہے نہ کوئی جام قفس میں
پی لیتے ہیں خون دل ناکام قفس میں
تڑپے ہیں تیری یاد کو سینے سے لگا کر
روئے ہیں بہت لے کے ترا نام قفس میں
گونجی ہے فضا میں کبھی پازیب کی جھنکار
ابھرے ہیں کبھی تیرے در و بام قفس میں
پھولوں کی زباں سے کبھی کرنوں کی نظر سے
مل جاتا ہے کہلو ترا پیغام قفس میں
اس راہمیں سب دوست جدا ہو گئے لیکن
ہمراہ رہی گردش ایام قفس میں

یہ غزل جس نے سنی تڑپ کر رہ گیا مجھے پہلی دفعہ پتہ چلا کہ شاعری کے لئے درد دل کا ہونا کتنا ضروری ہے اور پھر فیض کا وہی مصرع ذہن میں گونجنے لگا۔

اور کچھ دیر نہ گزرے شب فرقت سے کہو

اپنے دل کو ٹٹولا تو عجیب انکشاف ہوا رہائی کی امنگ کے ساتھ ہی کسی

کونے کھدرے میں "اور کچھ دیر نہ گزرے" کی حسرت بھی سانس لے رہی، اب کھلا، کہ لذت آزار پر فدا کیوں جاں چھڑکتے تھے،

ایک دن کچھ ایسی بات ہوئی کہ ہم سب اداس تھے، ایسا اتفاق کم ہی ہوتا تھا یہ دورہ ویسے تو سب کو پڑتا تھا لیکن اس کی نوعیت انفرادی قسم کی ہوتی تھی اس دن اس با جماعت دورے نے بہت پریشان کیا سب بت بنے بیٹھے تھے۔ میں نے گھبرا کر فکر و سخن شروع کر دی اتفاق دیکھئے جلد ہی ایک اچھی خاصی غزل ہو گئی۔ غزل تیار ہوتے ہی میں نے حسب معمول اعلان کر دیا۔ سب نے دلچسپی ظاہر کی اور میں غزل سنانے لگا۔

دل و نظر میں ترے حسن کا نکھار لئے
قفس سے نکلیں گے ہم مژدہ بہار لئے

اور جب اس شعر پر پہنچا۔

جو طول حشر بھی رکھتے تھے تلخی سم بھی
ترے اسیروں نے وہ روز و شب گزار لئے

تو سب کھلکھلا اٹھے ان کے چہروں کی ساری اداسی دھل گئی اور مجھے گویا اپنی غزل کی قیمت وصول ہو گئی۔

اگلے روز لائبریری جا رہا تھا کہ چکر کے پاس دیکھا ایک قیدی نوجوان لڑکے کو داروغہ ننگی گالیاں دے رہا ہے۔ اور اس کے آدمی اسے بے تحاشا مار رہے تھے۔ یہاں تک کہ اسے گرا کر اس کے سینے پر کود رہے تھے۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے جا کر سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کی اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ آپ جائیں اپنا کام کریں اور جیل کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ مجھے غصہ آیا میں نے کہا یہ غلط بات ہے اور غلط بات ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اس نے پولیس والوں کو بلا کر مجھے چکی میں بند کرا دیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا' کوئی پوچھنے نہ آیا میں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی ایک ہفتے بعد میرے ساتھیوں کو بھیجا گیا کہ مجھے سمجھائیں کہ بھوک ہڑتال ختم کر دوں میں نے انکار کر دیا' اگلے روز سپرنٹنڈنٹ نے آکر سمجھایا کہ ہڑتال توڑ دوں میں نے انکار کر دیا' آخر میرے دوستوں نے سمجھا سمجھا کر میرے گیارہ دن کی بھوک ہڑتال ختم کرائی۔ میں بہت کمزور ہو گیا تھا مجھے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ دو ہفتوں بعد میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔

میں رات کو بارہ ایک بجے فارغ ہو کر بستر پر جاتا تو سب محو خواب ہوتے وہ سب جلدی سو جانے کے عادی تھے۔ جب کہ میرا یہ عالم کہ بارہ بجے سے پہلے نیند نہیں پڑتی تھی۔ میں جاتے ہی سب کو جگا دیتا۔ اور ارباب سکندر تو مسکرا کر اٹھ بیٹھتا' افضل اور مولانا نورالحق بڑے سٹپٹاتے لیکن میں لطیفے سنانے لگتا تو ان کی ترشی کافور ہو جاتی' سب میرے گرد جمع ہو جاتے جب میں کہتا ایک سکھ تھا' تو افضل اور سکندر مولانا نورالحق کی طرف شرارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرانے لگتے مولانا پہلے تو غصے ہوتا پھر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگتا کچھ دیر لطیفوں کا دور چلتا پھر ادھر ادھر کی باتیں آہستہ آہستہ مولانا خاصے بے تکلف ہو گئے۔

آخر میں ہم باہر کی دنیا کے متعلق سوچنے لگتے' اگرچہ ہم پانچ پھاٹکوں میں بند تھے لیکن بیرونی دنیا سے فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا' صرف جیل کی ایک اونچی فصیل نے ہمیں جدا کر رکھا تھا ایک دن مولانا نے کہا ہم دو چھلانگوں میں اپنے گھر پہنچ سکتے ہیں ارباب سکندر بولا کہیں سے اللہ دین کا چراغ پیدا کرنا چاہئے میں نے کہا یارو۔ یہ سب باتیں فضول ہیں وہ جو سٹنٹ فلموں میں ہیرو "گھوں" کر کے دیوار پھاند جاتا ہے نا۔ بس وہ "گھوں" سیکھنے کی ضرورت ہے اس پر سب ہنسنے لگے۔ افضل بولا لیکن یہ "گھوں" سیکھی کیسے جائے' میں نے کہا یہ تو

بالکل آسان ہے ہم تمہیں سامنے والے اونچے درخت پر چڑھا دیتے ہیں تم "گھوں" کر کے نیچے چھلانگ لگاؤ اول تو چوٹیں آئیں گی لیکن رفتہ رفتہ پریکٹس ہو جائے گی اور پھر اس گھوں کے ذریعے تم جیل کی اونچی فصیل بھی پھاند سکو گے۔ رات کافی جا چکی تھی سب قہقہے لگاتے ہوئے بستروں میں جا گھسے اور نیند کی دنیا میں کھو گئے۔

صبح اٹھے تو چائے پیتے ہوئے افضل نے بتایا کہ خواب میں وہ واقعی ہیرو بن کر گھوں کے ذریعے دیواریں پھاندتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ زمین پر اکڑوں بیٹھا اور منہ سے گھوں کی آواز نکالتے ہوئے اچک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہم ہنسنے لگے بولا ہنستے کیوں ہو یارو۔ مبارک باد دو' پہلے ہی دن اتنی پریکٹس کتنی بڑی کامیابی ہے یہی رفتار رہی تو مہینہ بھر میں فصیل پھاندنا کیا مشکل ہے۔

میں لطیفے سنانے میں ہر چند کفایت شعاری سے کام لے رہا تھا۔ لیکن آخر کار یہ تمام سٹاک ختم ہو گیا۔ اب روزانہ دو چار لطیفے گھڑنے پڑتے' ہر لطیفہ "ایک سکھ تھا" سے شروع ہوتا انہی دنوں ایک اور داڑھی والے مولانا ہمارے ہاں آنے لگے ایک رات حسب معمول لطیفوں کا تقاضا ہوا' دماغ بالکل سپاٹ تھا اصرار بڑھا تو میں نے کہا اچھا سنو' ایک سکھ تھا۔ افضل نے شرارت کی "ایک نہیں دو سکھ تھے" دونوں مولانا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے ہنستے ہنستے ہمارے پیٹوں میں بل پڑ گئے۔

ہر چند طبیعت ادھر نہیں جاتی تھی۔ لیکن میں نے کچھ نہ کچھ امتحان کی تیاری کر ہی لی ایف اے کے امتحان کی تاریخ قریب آ گئی لیکن چیف سیکرٹری کی طرف سے اجازت نامہ نہ ملا۔ یہاں تک کہ تاریخ گزر گئی' ایک دن مجھے ڈیوڑھی میں بلایا گیا تو باہر جا کر معلوم ہوا' امتحان میں شامل ہونے کی اجازت مل گئی ہے۔ میں نے داروغہ سے کہا ایسی بھی کیا جلدی تھی ابھی تو امتحان کو ختم

ہوئے پندرہ بیس دن ہی ہوئے ہیں'

ایک دن کچھ دوست کھینچ کر بیڈ مٹن کھیلنے کے لئے لے گئے' بیڈ منٹن کھیلنے کا میرا پہلا تجربہ تھا۔ میرے اناڑی پن پر خوب قہقہے لگتے رہے' ارباب سکندر بھی میری ہی طرح نو آموز تھا لیکن وہ پہلے ہی دن کافی طاق ہو گیا۔ افضل پرانا کھلاڑی تھا۔ ہم نے باقاعدہ کھیلنا شروع کر دیا مجھے کھیلوں سے نہ کبھی دلچسپی رہی ہے نہ اب تھی صرف وقت ضائع کرنے کو چلا جاتا اس لئے ایک عرصہ تک کھیلنے کے باوجود کوئی خاص ترقی نہ کر سکا۔ افضل میری بے توجہی پر کڑھتا مجھے کھیل کے دوران ٹوکتا ریکٹ یوں پکڑو۔ یوں کٹ لگاؤ یہ کرو وہ کرو میں نے چڑ کر ریکٹ پھینک دیا میں نہیں کھیلتا' مجھے چیمپئن نہیں بننا' میں تو صرف وقت کاٹنے کو آجاتا ہوں۔ "آخر کیوں ایک ادیب ہو کر تم کھیل میں اتنے کورے ہو" اس نے مجھے چھیڑنے کو شرارتاً" کہا اس لئے کہ میں تمہاری طرح ذہنی طور پر کورے نہیں ہوں۔ فزیکل کھیلوں میں اکثر وہی لوگ طاق ہوتے ہیں جو مینٹلی بانجھ ہوں۔ میں نے اس پر شدید چوٹ کی۔ یہ تو الزامی جواب ہوا۔ اس نے کھسیانا ہو کر کہا۔ الزامی جواب نہیں یہ حقیقت ہے' تم ثابت نہیں کر سکتے کہ کوئی بڑا رائٹر اچھا کھلاڑی بھی گزرا ہو۔ خیر رائٹروں کی یہ روایت ہو بھی تو ہم اسے کوئی اچھی روایت نہیں کہہ سکتے' وہ بحث کو طول دینا چاہتا تھا۔ لیکن میں چپکے سے کھسک آیا۔

رفتہ رفتہ بیڈمنٹن کا شوق اتنا بڑھا کہ بعض بڑے بوڑھوں میں بھی زندگی کے آثار پیدا ہو گئے' اور وہ بھی ریکٹ لے کر میدان میں کود پڑے۔ کھیل کے میدان میں ہجوم نظر آنے لگا کئی کھلاڑیوں کو کھیلے بغیر ہی مایوس ہونا پڑتا' بعد میں غلام محمد خان لوند خوڑ آ گئے اور انہوں نے والی بال کا سلسلہ شروع کر دیا والی بال کے شوق نے تھوڑے دنوں کے لئے بیڈ مٹن کی رونق

چھین لی، لیکن لونڈ خوڑ کے جاتے ہی والی بال کی جگہ پھر بیڈمنٹن نے لے لی۔

ہم سات ساتھیوں میں سے خوشحال کاکا، ارباب غفور، ارباب سکندر اور مولانا نورالحق تو پکے نمازی تھے کچھ دنوں بعد میں نے بھی نماز شروع کر دی، ایک دن صنوبر کاکا نے بھی ایک دو نمازیں پڑھ ڈالیں اب افضل باقی تھا۔ وہ بولا میں نمائشی عبادت کا قائل نہیں۔ میں نے کہا نمائشی تو جب ہوئی کہ ہم باہر بھی پڑھتے جیل میں تو نمائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں سوائے خدا کے دیکھنے والا کون ہے۔ خوشحال کاکا بولا میں تو عادتاً" پڑھتا آیا ہوں، اب ترک کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا۔ مولانا نورالحق، ارباب غفور اور ارباب سکندر عقیدتاً" پڑھتے تھے۔ صنوبر کاکا نے کہا میرا جب جی چاہے پڑھ لیتا ہوں۔ پابندی مجھ سے نہیں ہوتی اور نہ ہی معاوضے کا لالچ پیش نظر ہے اب مجھ سے پوچھا گیا کہ تم بھی کچھ بتاؤ۔ میں نے کہا سچ پوچھیئے تو میں آپ لوگوں کے تالیف قلب کی خاطر پڑھتا ہوں آخر آپ لوگ عوام ہی تو ہیں اور ہم عوام کے لئے جیل آ سکتے ہیں تو کیا نماز نہیں پڑھ سکتے۔

رفتہ رفتہ افضل نے بھی نماز شروع کر دی۔ میں تو باہر بھی عموماً" صبح کی پابندی سے اور باقی کبھی کبھی پڑھ لیا کرتا۔ وہاں بھی میری یہی روش رہی۔ صبح کی نماز اگرچہ کبھی وقت پر ادا کرنے کی توفیق نہ ہوئی، لیکن پڑھتا ضرور تھا۔ افضل نے سب سے بعد نماز شروع کی اور پانچوں وقت اس پابندی سے پڑھنے لگا، جیسے تمام عمر کے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہو میں نے حیران ہو کر پوچھا یہ کیا۔ بولا بھئی ہم تو جمہور کے ساتھ ہیں یہاں نمازیوں کی غالب اکثریت ہو گئی ہے۔ لہذا اکثریت کی رائے کا احترام کرنا ہی پڑا۔

ایک دن بارک نمبر 14 کے سامنے چھوٹے سے چمن میں (جسے ہم کمپنی

نامعلوم گوشوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی جوانی اس کی محبت' اس کی حسرتیں اور تمنائیں اور اب اس کی حالت زار کا یہ مہیب نقشہ لے موت کا۔ حکم ہو چکا تھا۔ پھانسی کی تاریخ نزدیک سے نزدیک تر آ رہی تھی۔ ہر گزرنے والا دن اسے موت کے منہ میں دھکیل رہا تھا۔ وہ قصور وار تھا' یا بے قصور یہ کون جانتا تھا' کون کہہ سکتا تھا۔ لیکن ایک زندہ انسان کو اس کی موت کا پیغام سنا دینا اور اس کے مرنے کا وقت متعین کر دینا۔ قوانین فطرت میں مداخلت نہیں تو کیا ہے۔ اس کے شب و روز کیونکر گزرتے ہوں گے۔ موت کے مہیب عفریت کا فرمان اس کے نام آ چکا تھا۔ اور وہ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اس عفریت کی آمد کا منتظر پڑا تھا۔ پھر وہ دن بھی آنے والا تھا' جب اس دنیائے آب و گل میں اس کی آخری رات ہو گی۔ اسے اس احاطے سے نکال کر اس کوٹھڑی میں پہنچا دیا جائے گا۔ جہاں پھانسی پانے والے کو آخری رات بسر کرنی پڑتی ہے۔ یہ آخری رات کو تنہا سفر کیونکر طے ہوتا ہو گا۔ ان لمحات میں اس کے جذبات و احساسات کیا ہوں گے کون ایسا مصور ہے جو ان کی تصویر کشی کر سکے کس کے قلم میں اتنی قوت ہے جو انہیں الفاظ کا جامہ پہنا سکے۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک ساعت کتنی دشوار' کتنی گراں' کتنی صبر آزما ہوتی ہو گی۔ جب زندگی کی مدافعت ختم ہو جاتی ہے جب انسان کی بے بسی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ جب جب بس اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے' دل بھر آیا۔ میں نے پھانسی کی کوٹھڑیوں کی طرف کروٹ
بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

چند دنوں بعد یہ خبر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ سارے جیل میں پھیل گئی' کہ طاؤس کی اپیل منظور ہو گئی' اور اس کی رہائی کا حکم آ گیا۔ مرنے والی کوٹھڑی کا یہ پیلا دبلا نوجوان کتنا بشاش کتنا مسرور تھا۔ سارا جیل اس خوش نصیب

باغ کے نام سے یاد کرتے تھے) ہم ٹہل رہے تھے کہ اچانک سامنے پھانسی کی کوٹھڑیوں سے نہایت دردناک آواز میں پشتو ٹپے گانے کی آواز آئی اس آواز میں کچھ اس بلا کا اثر تھا کہ ہم کھچے کھچے اس کے پاس جا پہنچے' یہ طاؤس گا رہا تھا۔

مجھے اپنے مرنے کا غم نہیں
غم تو یہ ہے کہ میرے بعد تیرا کیا حال ہو گا
میری محبوبہ تیرا عشق تو مرجائے گا
لیکن اسکے خلوص و وفا کی یاد تجھے بھی چین سے جینے نہ دیگی
خدایا تو نے میرا ہرا بھرا چمن مجھ سے چھین لیا
اور مجھے جی بھر کر اس کی سیر بھی نہ کرنے دی
خدایا تو بڑا منصف کہلاتا ہے
لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مجھے زندگی کی بہار سے محروم کر دیا

میری محبوبہ تیرا عاشق وہاں جا رہا ہے
جہاں جرگہ بھی اسے منا کر واپس نہیں لا سکتا
خدایا مجھے مارنے کی اتنی جلدی تھی
تو پیدا ہی کیوں کیا تھا

اسکے ساتھ ہی دوسری کوٹھڑیوں میں بھی ٹپے گونجنے لگے لیکن طاؤس کی واز میں کچھ ایسا سحر تھا جس نے ہمیں دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ یہ ٹپے کیا ۔ ایسے نشتر تھے جو دل میں اترتے گئے' جب واپس آیا تو دل و دماغ پر یہ د انگیز آواز اس طرح مسلط ہو چکی تھی کہ کوشش کے باوجود پیچھا چھڑانا دشوار گیا۔ کانوں میں یہ ٹپے گونج رہے تھے اور میں اس نامراد انسان کی زندگی کے

انسان کے دیکھنے کو ٹوٹ پڑا میں نے جا کر دیکھا تو سخت تعجب ہوا اس کے زرد چہرے پر شفق پھوٹ پڑی تھی۔ بجھی بجھی آنکھوں میں پھلجڑیاں چھوٹ رہی تھیں، لبوں میں زندگی کی حرارت عود کر آئی تھی، مجھے خدشہ ہونے لگا۔ کہیں مارے خوشی کے اس کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔ لیکن اس کا ہارٹ فیل نہ ہوا اور دوپہر تک وہ نئی زندگی سے ہمکنار ہونے کے لئے روانہ ہو گیا۔ اب پھانسی کے پھندے کی جگہ اس کے گلے میں اپنی محبوبہ کے حنائی ہاتھ حائل ہوں گے۔

طاؤس کی رہائی نے دوسرے پھانسی والوں کو اداس کر دیا۔ ان کے چہروں پر پژمردگی چھا گئی، ان کی خشک سپاٹ آنکھیں مجسم سوال بنی ہوئی تھیں۔ ہمارا کیا بنے گا؟

ان میں سے بیشتر نے کھانا بھی نہ کھایا، وہ کوٹھڑیوں سے باہر ٹہلنے کو بھی نہ نکلے، کوئی ٹپہ بھی نہ الاپا کہتے ہیں پھانسی والوں کے لئے ایک تو وہ دن بڑا المناک ہوتا ہے۔ جب ان کا کوئی ساتھی پھانسی چڑھتا ہے، دوسرا وہ جب کوئی رہا ہوتا ہے۔

طاؤس جانے لگا تو میں نے کہا دوست جاتے جاتے ایک آدھ ٹپہ تو سناتے جاؤ مسکراتے ہوئے بولا بابو صاحب اب آپ کو میرے ٹپوں میں وہ لطف نہیں آئے گا اور میں نے سوچا سچ تو کہتا ہے اب وہ درد وہ کرب کہاں سے لائے گا

طاؤس دوپہر کو چلا گیا اور اس کی جگہ ضلع مردان کے دو اور شخص آ گئے وہ سارا دن پھانسی، موت اور قتل کے دہشت ناک قصے سنتے سنتے گزر گیا۔ کچھ دنوں بعد جیل میں اطلاع آئی کہ جمیل نامی لڑکے کے بلیک وارنٹ آ گئے ہیں اگلے روز جمیل کو پھانسی ہونا تھا۔ عصر کے وقت سے اسے موت کے کنواں ملحقہ پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا جمیل بڑا مطمئن اور ہشاش بشاش نظر

آ رہا تھا اس کے ساتھی اداس تھے لیکن وہ ہنستا بولتا تھا اور ساتھیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا کسی نے اظہار ہمدردی کے طور پر کہا' خدا خیر کرے گا وہ بولا خدا بہت خیر کر چکا' لیکن میں حرامی ہوں میں نے اس کی مراعات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا' اور اب مجھے معلوم ہے وہ خیر نہیں کرے گا' دیکھنے والوں کا خون خشک ہو رہا تھا لیکن وہ قہقہے لگاتا رہا' آخر جب جانے کا وقت ہونے لگا تو وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا اب اس کا اضطراب بڑھ چلا تھا۔ اتنے میں وارڈ داروغہ گارڈ لئے آیا اور اسے نکال کر منزل مقصود کی طرف لے چلا جمیل پہلے اپنے تمام پھانسی والے ساتھیوں سے ملا' پھر باہر آکر ہم سے ہاتھ ملائے بخشش کے لئے دعا کرائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا اس کے بعد شام تک اس کے لواحقین ملاقات کے لئے آتے رہے۔

رات کو ہم میں سے کوئی بھی کھانا نہ کھا سکا' جیل پر خوفناک سناٹا چھایا ہوا تھا جمیل نے صبح پانچ بجے پھانسی ہونا تھا۔ یہ رات اس پر کتنی بھاری ہو گی ایک ایک لمحہ اسے موت کے قریب لے جا رہا تھا۔ ہم چپ چاپ دم سادھے پڑے تھے۔

جمیل کو پھانسی دی جا رہی تھی وہ اجرتی قاتل تھا اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہونی چاہئے لیکن انسانی فطرت ایسی ہی ہے کہ اسے ہر مظلوم سے ہمدردی ہو جاتی ہے' جہاں تک جرائم کا تعلق ہے اس کی تخم ریزی بھی تو ہمارے معاشرہ ہی میں ہوتی ہے کوئی شخص بھی پیدائشی مجرم نہیں ہوتا' ہمارا ماحول اور حالات و کوائف اسے ایسا بننے پر مجبور کر دیتے ہیں' جمیل کو اجرتی قاتل کیوں بننا پڑا۔ اس نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا اس لئے کہ ہمارا معاشرہ اسے کوئی جائز روزگار مہیا نہ کر سکا جمیل نے قتل کیا اسے پھانسی پر لٹکانا چاہئے لیکن جب تک اس معاشرہ کی جڑوں سے ان متعدی امراض کے جراثیم کو فنا نہ کیا جائے۔

اس وقت تک سینکڑوں ہزاروں جمیل پیٹ کا ایندھن مہیا کرنے کے لئے اپنے بھائیوں کی گردنیں کاٹتے رہیں گے' ماؤں بہنوں کی عصمتیں لوٹتے رہیں گے۔ قتل و غارت کا بازار گرم رہے گا' جرائم کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جمیل پیدا ہوتے رہیں گے' مرتے رہیں گے اور ان کی خاک سے کئی اور جمیل جنم لیتے رہیں گے۔

جمیل پھانسی پانے والوں میں سب سے زیادہ خوبرو نوجوان تھا ہم جب سے آئے اسے پھانسی کی کوٹھڑی میں دیکھ رہے تھے اب صبح اسے تختہ دار پر چڑھنا تھا۔ میری زندگی میں اپنی قسم کا یہ پہلا حادثہ تھا چارپائی پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے ان مجرموں کی روحیں پھانسی کی کوٹھڑیوں کے دروازوں سے چپکی ہوئی ہیں' گھور رہی ہیں مجھے خوف آنے لگا' نیند کوسوں دور تھی' یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ داروغہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا وہ نمبرداروں سے کہہ رہا تھا پانی لے جا کر اسے جلدی سے غسل کراؤ دیر ہو رہی ہے۔ اتنے میں مجسٹریٹ اور ڈاکٹر بھی آگئے اور پھر جیل کے بڑے پھاٹک پر لہراتا ہوا پاکستانی جھنڈا سرنگوں کر دیا گیا اور جیل پر موت کا سا سکوت چھا گیا۔ یہ کیفیت تقریباً" نصف گھنٹے تک قائم رہی' اس کے بعد جمیل کی لاش اس کے وارثوں کے سپرد کر دی گئی۔

ہماری حالت بڑی عجیب ہو رہی تھی ایک جیتے جاگتے' ہنستے بولتے' زندگی سے بھرپور نوجوان کو دیکھتے ہی دیکھتے موت کا خوفناک دیو نگل گیا ایک دن پہلے تو اس وقت جمیل مسلسل بول رہا تھا لیکن اب وہ ابدی نیند سویا ہوا ہو گا دوپہر کے وقت اس کی خالی کوٹھڑی میں ایک اور شخص گل زمان نامی آگیا جسے اسی دن پھانسی کا حکم ہوا تھا۔

جمیل کا واقعہ ہم بمشکل بھلا سکے تھے کہ اور تین آدمیوں کو پھانسی کے

آرڈر آ گئے ان کے نام جمعہ خان، محبوب علی خان اور عبدالعزیز خان تھے تین آدمیوں کو ایک ساتھ پھانسی ہونے کا کم ہی اتفاق ہوا ہے۔ جیل میں اس خبر سے شدید اضطراب پھیل گیا۔ رات کو ہر طرف سناٹا تھا۔ کہیں سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی ہم بھی سر شام بستروں میں گھس گئے لیکن نیند آتی تھی تمام رات ان بدنصیب انسانوں کا خیال ستاتا رہا۔ صبح ہم دیر سے اٹھے پھانسی کے دن جب تمام کام ختم نہ ہو قیدیوں کو بارکوں اور چکیوں سے نہیں نکلنے دیتے، کافی دیر کے بعد دروازے کھلے باہر بی کلاس کا ایک خان اپنے خدمتی پر ناراض ہو رہا تھا کہ اسے ابھی تک چائے اور پراٹھا کیوں نہیں ملا گویا تین انسانوں کی موت کا حادثہ اس کے نزدیک کوئی خاص بات نہیں تھی میں غالب کا یہ مصرعہ گنگنانے لگا۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

چند دن بعد ہی دو اور نوجوانوں ظفر علی شاہ اور شاد علی کو پھانسی دے دی گئی ظفر علی شاہ نوخیز لڑکا تھا۔ اس نے نشے کی حالت میں اپنے ایک دوست کو گولی سے ہلاک کر دیا پہلے دنوں جب اس کی رحم کی درخواست نامنظور ہوئی تو اس نے افیون پھانک کر خودکشی کی ناکام کوشش بھی کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ عجیب بات ہے کہ کوئی خود مرنا چاہے تو مرنے نہ دیا جائے۔

ہمارے کمرے میں ہر وقت ہنگامہ بپا رہتا، شروع شروع میں میرے لئے اس ماحول میں پڑھنا لکھنا دشوار تھا۔ لیکن آخر کار میں نے اس ہجوم میں تنہا زندگی گزارنے کا گر سیکھ لیا۔ میں ایک دفعہ اپنے خیالات کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا تو پھر اپنے گرد و پیش سے اتنا بے خبر ہوتا کہ ڈھول پیٹنے کی آواز بھی سنائی نہ دیتی۔ بارہا ایسا ہوا کہ کوئی صاحب آکر بیٹھے گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ میں بھی ہوں ہاں کرتا رہا۔ وہ چلے گئے اور استغراق ٹوٹا تو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کون

آیا اور کون گیا اور کیا کہا اور کیا سنا۔

میری خود فراموشی کا عالم دیکھ کر بعض لوگ غلط رائے قائم کرنے پر مجبور تھے' وہ مجھے مغرور اور بد اخلاق سمجھنے لگے' لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ ہر وقت کا اژدحام میرے لئے ناقابل برداشت تھا تخلیہ میری بہت بڑی ضرورت تھی اور اس کے بغیر میرے لئے زندہ رہنا محال تھا۔ کتابوں' کاغذوں اور سگریٹ کے سوا مجھے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ ان تین چیزوں کا میں کافی سٹاک رکھتا تھا اور جب ان میں سے کوئی چیز بھی ختم ہونے لگتی تو میری تشویش بڑھ جاتی اور اسیری کا احساس جاگ اٹھتا۔

بعض اوقات ہم قریب رہتے ہوئے بھی کتنی اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ نگار کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس سے رسمی تعارف تو آتے ہی ہوگیا۔ لیکن بہت دنوں تک ہمیں ایک دوسرے کے ذہنوں میں جھانکنے کا موقع نہ مل سکا۔ میری خلوت گری سے سب نالاں تھے۔ میں نے کمرے کے ایک گوشے میں سب سے الگ تھلگ اپنی چارپائی ڈال رکھی تھی۔ میں دوستوں کی ہنگامہ آرائی اور گپ بازی میں ضرور شریک ہوتا۔ لیکن ہر وقت کی گپ شپ مجھے پسند نہ تھی۔ میں نے کچھ اوقات مقرر کر رکھے تھے۔ لکھنے پڑھنے سے جو وقت ملتا اسے دوستوں کی نذر کر دیتا۔ جیل سے باہر بھی میرا یہی اصول تھا اور جیل میں بھی اسی پر عمل پیرا رہا' کوئی مشغلہ نہ بھی ہوتا تو بیشتر وقت خاموشی سے گزارنے میں فرحت محسوس ہوتی۔ پہلے پہل تو احباب نے میری اس ناگوار روش کے خلاف پر زور احتجاج کیا۔ لیکن آہستہ آہستہ جب میری افتاد طبع سے واقف ہوگئے تو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

نگار میری زندگی میں کچھ اس طرح دبے پاؤں داخل ہوا کہ مجھے پتہ بھی نہ چل سکا۔ وہ پڑھا لکھا ذہین نوجوان تھا۔ اس کا مطالعہ وسیع اور فکر و نظر بلند

تھے وہ فلسفہ کا طالب علم رہ چکا تھا - وکالت کا امتحان اس نے باپ کے اصرار پر پاس کیا اور جیل میں بڑے بھائی کی وجہ سے آنا پڑا - اب تک وہ مجھے نرا شاعر سمجھتا تھا اور میں اسے خشک وکیل ----- لیکن جب ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا تو ہم دونوں ایک ہی خاندان کے فرد نکلے ----- ہماری ملاقاتیں طویل ہوتی گئیں - یہاں تک کہ علیحدہ علیحدہ وارڈوں میں رہتے ہوئے بھی ہر وقت ہم ایک ساتھ رہنے لگے - وہ صبح اٹھتے ہی میرے پاس آجاتا اور وارڈ بند ہونے لگتا تو بادل ناخواستہ رخصت ہوتا ---- میری مختصر سی چارپائی ہماری نشست گاہ تھی، جہاں ہم سر جوڑے ہر وقت بحث کرتے رہتے، ہماری باتیں لا متناہی تھیں جو کبھی ختم ہونے میں نہ آتیں ----- ادب، آرٹ، سیاست، فلسفہ، منطق ہر موضوع پر پہروں گفتگو رہتی ---- ساتھی ہمارا مذاق اڑاتے ----- آخر ایسی کیا باتیں ہیں جو ختم ہی نہیں ہوتیں ---- ہماری باتیں واقعی کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں تھیں، یہ باتیں زندگی کے متعلق تھیں اور زندگی کبھی ختم نہیں ہوتی

نگار ہر چیز کو فلسفیانہ نکتہ نظر سے دیکھنے کا عادی تھا - آسکر وائلڈ اس کا محبوب مصنف تھا - ویسے اسے برنارڈ شاہ، ٹالسٹائی، شیکسپئر، ٹیگور، حافظ، غالب، اقبال، رحمٰن بابا سبھی پسند تھے -

وہ چھوٹے سے قد کا پتلا دبلا زرد اور تیس سالہ نوجوان تھا - دیکھنے میں اپنی عمر سے چھوٹا معلوم ہوتا، باتیں اپنی عمر سے بڑی کرتا - دقیق مسائل پر گھنٹوں بے تکان بولتا - بولتے وقت بے تحاشا سگریٹ پھونکتا - بڑے بڑے چشموں میں اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک اٹھتیں، ماتھے کی شکنیں گہری ہو جاتیں اور زرد چہرے پر اور زیادہ زردی کھنچ جاتی -

وہ روزانہ بحث کے لئے ایک نیا موضوع لے کر آتا ہم اس موضوع کے

مختلف زاویوں پر روشنی ڈالتے۔

نگار کے خیالات پختہ نہیں تھے۔ وہ تجرباتی دور سے گزر رہا تھا حقیقت کی تلاش میں اس کا ذہن بھٹکے ہوئے پرندے کی طرح آوارہ تھا۔ اس میں خود اعتمادی کی کمی تھی۔ وہ ہر راہرو کے ساتھ تھوڑی دور جاتا اور پھر دل شکستہ ہو کر لوٹ آتا' اس کے نظریات میں تضاد تھا' یہ تضاد خود اس کے اندر موجود تھا۔ وہ شدید بے اطمینانی کا شکار تھا۔ وہ ماحول سے مطمئن نہیں تھا۔ مذہب سے مطمئن نہیں تھا۔ زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔ کسی چیز سے مطمئن نہیں تھا۔

بعض اوقات وہ مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا اس کا چہرہ یوں مرجھا جاتا جیسے زندگی کی تمام حرارت نچوڑ لی گئی ہو وہ ایسی بانسری بن جاتا جس سے صرف غمگین سر ہی نکلتے ہوں

وہ دن بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ صبح اٹھتے ہی خبر آئی' اٹھارہ قیدیوں کا چالان ڈیرہ اسماعیل خان جا رہا ہے جن میں ایک سیاسی قیدی بھی شامل ہے---- یہ سنتے ہی ہم سب پریشان ہوگئے' پشاور میں ہمیں کوئی خاص سہولت نہ تھی' ملاقات بند تھی اس لئے اپنے بیگانوں سے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی اپنے جیل کے رفیقوں سے جدائی اور نئے ماحول میں زندگی گزارنے کا خیال کافی تکلیف دہ تھا۔ ویسے ڈیرہ کی گرمی کا تصور بھی کم ہولناک نہ تھا۔ چالان گیارہ بجے جاتا تھا۔ ہم انتہائی کوشش کے باوجود معلوم نہ کرسکے کہ سیاسی قیدیوں میں سے اس چالان میں کون شامل ہیں ----- یہ وقت بڑے عذاب میں کٹا' سب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے اور دل مضطرب ---- آخر گیارہ بجے چالان جانے لگا تو پتہ چلا کہ گامے کو ڈیرہ بھیج رہے ہیں ---- عین اس وقت گاما سامنے سے آتا دکھائی دیا وہ کافی کمزور تھا اور سفر کے ناقابل ----- ڈیوڑھی میں اسے بیڑیاں لگانے لگے تو اس نے احتجاج کیا لیکن اسے بیڑیاں لگائی گئیں کیونکہ وہ سی

کلاس کا قیدی تھا -

گامے کے جانے کے بعد ہم سب اداس اور بے حس ہو کر پڑ رہے' اتنے میں ایک ملنے والا آیا اور باتوں باتوں میں کہنے لگا - فارغ صاحب آپ کے لئے پشاور کے ادبی حلقوں نے کچھ بھی نہ کیا - - - - آپ تمام عمران کے لئے لکھتے رہے - خیال تھا - آپ کی گرفتاری پر طوفان مچ جائے گا - لیکن انہیں تو ایک ریزولیشن پاس کرنے کی توفیق بھی نہ ہوئی - مجھے بے اختیار ہنسی آگئی - میں نے کہا بھئی ہمیں اپنے طبقے کی معذوریوں اور مجبوریوں کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کرلینی چاہئیں - اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں خود غرض اور مصلحت کوش عناصر کی کمی نہیں - لیکن مخلص اور ہمدرد دوست بھی اس کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں کہ دلوں ہی میں جلسے کریں' دلوں ہی میں خاموش احتجاج کریں اور ہماری یاد کی لاش کو اپنے دلوں ہی کے کسی کونے کھدرے میں دفنا کر اس کے مزار پر آنسوؤں کے پھول چڑھاتے رہیں -

ہم باتیں کر رہے تھے کہ ہمیش گل آگیا - اجمل خٹک اور ہمیش گل کا مقدمہ سرحد میں تاریخی شہرت حاصل کرچکا ہے انہیں دو دفعہ عدالت نے رہا کیا - لیکن پھر گرفتار کرلئے گئے - آخر جرگہ نے اجمل خٹک کو چھوڑ دیا اور ہمیش گل کو دس سال قید کی سزا ہوئی اس نے جرگہ کے فیصلہ کے خلاف حبس بے جا کی درخواست دائر کر رکھی تھی وہ تفتیش کے دوران میں پولیس کے مظالم کی داستان سنانے لگا - اتنے میں کچھ اور احباب آگئے - ان میں ایک میاں محبوب الرحمان تھے -

میاں صاحب بڑے خلیق اور ملنسار تھے نماز اور قرآن خوانی سے جتنا وقت بچا سکتے - اسے دعوتوں کے انتظامات میں صرف کر دیتے - احمد خان حساس ہونے کے باعث کم سخن اور تنہائی پسند واقع ہوئے تھے - وہ نہایت خوبرو اور تنو

مند نوجوان تھا۔ لیکن تنہائی پسند رہنے کی وجہ سے وقت سے پہلے مرجھانے لگا۔ لیفٹیننٹ بڑا مستعد اور چاک و چوبند رہتا' صبح و شام ورزش کرتا اور عریاں پولیس پڑھتا' ابھی تک آمرانہ فوجی شان کا نشہ اس کے دماغ سے نہیں اترا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن وہ پھر جا کر اپنے دستے کی کمان سنبھال لے گا۔ اس تصور سے اس کی زندگی میں تازگی اور حرارت باقی تھی۔ حکیم خان اور اس کے ساتھیوں کو بم کیس میں جرگہ نے بھاری سزائیں دیں۔ حکیم خان وہ شخص تھا جو جیل سے باہر نکلنے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ لیکن اسے کچھ کرنے کا موقع ہی نہ ملتا وہ اپنی مصیبت بھری داستان ہر ملنے والے کو بار بار شروع سے آخر تک سناتا ہر ملاقات پر اس داستان کو نئے زاویوں' نئے اسلوب اور نئے انداز میں سنانے کا ڈھنگ اسے خوب آتا تھا۔

ہم کمرے سے نکل کر پھرتے پھراتے قصوریوں کی چکیوں کے پاس پہنچے تو ایک کوٹھڑی میں سلطان پر نظر پڑی جو میرے مرحوم دوست کمال شیر کا قاتل تھا ۔ اسے دس سال کی سزا ہوئی۔ گریجویٹ تھا۔ بی کلاس مل گئی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس کا دماغ چل پڑا۔ دو آدمیوں پر حملہ بھی کیا۔ اب قید تنہائی ملی ہوئی تھی وہ سارا دن گالیاں بکتا رہتا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس پر پھر گالیوں کا دورہ پڑا۔ اسے دیکھ کر دل میں کمال شیر مرحوم کی یاد تازہ ہوگئی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔۔۔ سلطان کی حرکتیں پاگلوں کی سی تھیں' پھر خبر آئی وہ پاگل ہو چکا ہے' کئی دنوں سے کھانا پینا ترک کر رکھا تھا۔ ایک دن سنا اسے پاگل خانے لے جا رہے ہیں۔ وہاں گئے تو عجیب تماشا دیکھا' پاگل خانہ سے چند ہوشیار قسم کے پاگلوں کو بلایا گیا تھا۔ انہیں سلطان کی کوٹھڑی میں چھوڑ دیا گیا۔ جنہوں نے اسے مار مار کر باہر نکالا اور دھکے دیتے ہوئے پاگل خانہ کی طرف لے چلے' وہاں جا کر پاگلوں نے اسے جبراً" کھانے پینے اور باتیں کرنے پر مجبور کیا۔ وہ ایسا نہ کرتا تو

پٹائی ہوتی تھی۔ آخر وہ شدید طور پر بیمار پڑ گیا اور پھر مر گیا۔

جیل میں کافی دن ضائع کرنے کے بعد اب کہیں جا کر زندگی میں نظم و ضبط پیدا ہوا۔ میں صبح اٹھتے ہی ورزش کرتا۔ اس کے بعد نماز' ناشتہ پھر خوشحال کاکا سے ترجمہ کے ساتھ قرآن شریف ----- آٹھ بجے کارخانے جا کر ماسٹر فیروز سے پینٹنگ سیکھتا۔ گیارہ بجے کارخانے سے واپس آکر کھانا کھاتا' اخبار دیکھتا' عصر تک کچھ لکھنے پڑھنے کا شغل' عصر کو چائے پی کر بیڈ منٹن' شام کو آکر کھانا کھاتا اور پھر وہی لکھنے پڑھنے کا محبوب مشغلہ۔

ماسٹر فیروز بہت بڑا آرٹسٹ تھا۔ وہ نوٹ بنانے کے جرم میں چودہ سال قید کی سزا بھگت رہا تھا۔ لیکن اندر جیل میں بھی آرام سے نہیں بیٹھتا تھا۔ آرٹسٹ ہونے کے باعث جیلر نے اسے الگ کوٹھی دے کر جیل کا کام اس کے حوالے کر رکھا تھا۔ میں آرٹ سیکھنے اس کے پاس جاتا تھا۔ ایک دن گیا تو کوٹھی کا دروازہ بند تھا۔ دروازہ کھٹکھٹاتا رہا' بڑی دیر کے بعد دروازہ کھولا اور بولا میٹرک کا سرٹیفکیٹ بنا رہا ہوں' سو روپے کی مزدوری آگئی ہے ---- میں نے کہا خدا کا خوف کرو ماسٹر ---- کسی نے دیکھ لیا تو مارے جاؤ گے۔

میں نے عملاً "زندگی کو مصروف بنا لیا' بے کاری یہاں بڑی تکلیف دہ تھی۔ ذرا بے کار بیٹھو تو گھوم پھر کر سوچ کا رخ اپنے الجھے ہوئے حالات کی طرف مبذول ہو جاتا ---- سزا کی طویل مدت ایک سنسان جنگل کی طرح میلوں پھیلی ہوئی نظر آتی۔ امیدوں کے پھول مرجھا مرجھا کر کھلتے اور کھل کھل کر مرجھاتے۔

ذہن و فکر کو اتنا مصروف رکھنا کہ سوچنے کی فرصت ہی نہ ملے' ایام اسیری گزارنے کا بہترین گر ہے۔

ورزش کے لئے باغ میں افضل لیفٹیننٹ اور عبداللہ جان مجھ سے پہلے

ہی پہنچ جاتے، عبداللہ جان اور افضل چمن کے گرد بیسیوں چکر لگاتے میں بھی
لگاتا - لیفٹیننٹ فوجی ڈرل کے ساتھ ساتھ ہائی جمپ اور لانگ جمپ کا مظاہرہ کرتا
- - - - ہم نڈھال ہو کر واپس آتے اور ناشتہ کرتے وقت ایک عجیب فرحت
محسوس کرتے - - - -

ہمارے دیکھا دیکھی خوشحال کاکا نے بھی ورزش شروع کردی - ہر بات
میں نوجوانوں کی تقلید کا جنون ان پر بری طرح سوار تھا - وہ عمر طبعی کو پہنچ چکے
تھے لیکن بڑھاپے کے تصور سے دور رہنے کے لئے ان کی جدوجہد جاری تھی -
شکست خوردگی کے احساس سے بچنے کے لئے خود فریبی کے حسین و جمیل جال
بننے میں رات دن مصروف تھا - اس کے لئے انہیں کافی وقت حجامت کرانے اور
مہندی وسمہ لگانے میں ضائع کرنا پڑتا - اپنی بساط سے بڑھ کر ورزش کرنے میں
بھی فرار کا یہی جذبہ کارفرما تھا - اسی خیال سے انہوں نے انگریزی سیکھنا شروع
کی، وہ عالم فاضل شخص تھے، قرآن و حدیث فقہ تفسیر کے علاوہ عربی زبان پر
بھی انہیں کافی عبور حاصل تھا - اشتراکیت پر عقیدہ رکھتے ہوئے نماز روزہ کے
سختی سے پابند تھے - اسی لئے مسلمان کمیونسٹ کہلاتے تھے - اسلام اور کمیونزم کو
ہم آہنگ ثابت کرنے کے لئے ہر ایک سے بحث کرنا ان کا نصب العین تھا -
مدعا یہ کہ اس عمر میں انگریزی سیکھنے کی انہیں کوئی خاص ضرورت نہ تھی - لیکن
نوجوانوں کو انگریزی بولتا دیکھ کر انہیں انگریزی سیکھنے کا شوق چرایا اور لطف یہ
کہ ابھی پوری طرح اے بی سی بھی یاد نہ کر پائے تھے کہ فرائڈ کی کتاب کو
پڑھنے لے آئے - کبھی شیکسپیئر کبھی کوئی اور انگلش کی کتاب لے آتے -

- - - - ارباب سکندر سے پڑھنا شروع کیا - لیکن جلد ہی اس سے مایوس
ہو کر افضل سے رجوع کیا اسے بھی چھوڑا اور لیفٹیننٹ کے سامنے زانوئے
تلمذ تہہ کیا پھر خود ہی مطالعہ کرنے لگے - یہ سب کام ایک مہینے میں ختم

ہوگیا۔۔۔۔ اس زور و شور سے پڑھنا شروع کیا کہ رات دن انگریزی پڑھ رہے ہیں یا لکھ رہے ہیں۔ اور پھر یہ عالم کہ کتاب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔۔۔۔ ایک دن صنوبر کاکا کہنے لگے۔۔۔۔ بات کیا ہے، خوشحال کاکا نے انگریزی پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ میں نے کہا، فارغ التحصیل ہوگئے ہیں۔ اس پر سب دوست دیر تک ہنستے رہے۔

ورزش کے سلسلہ میں بھی انہوں نے اپنی روایتی انتہا پسندی کا ثبوت دیا۔ ایک دفعہ شروع ہوئے تو دوڑیں بھی لگ رہی ہیں۔ اٹھک بیٹھک بھی ہو رہی ہے۔ لیفٹیننٹ کی دیکھا دیکھی لانگ جمپ اور ہائی جمپ بھی ہو رہی ہے۔۔۔۔ ہم نے بہت سمجھایا۔ کاکا جی اس عمر میں یہ حوصلے خطرناک ہیں۔ لیکن وہاں کون سنتا تھا۔ بولے تم مجھے بوڑھا سمجھتے ہو۔ میں یہ غلط فہمی دور کرکے رہوں گا۔۔۔۔ ایک دن آئے تو کمر میں چوک پڑ گئی تھی۔ لیٹتے ہی بخار ہوگیا۔ رات کو سینے میں درد اٹھنے لگا، ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور بتایا کہ انہیں نمونیہ کی شکایت ہے۔ پندرہ بیس دن کے مسلسل علاج معالجہ سے بمشکل کہیں چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔

ورزش کے معاملہ میں لیفٹیننٹ کے سوا ہم میں سے کوئی ثابت قدم نہ رہ سکا۔ موسم بدلتے ہی پہلے میں بھاگا، پھر افضل اور عبداللہ جان۔۔۔۔

لیفٹیننٹ پھاٹک کے ساتھ ہی بی کلاس کے پہلے کوارٹر میں اپنے بوڑھے چچا کے ساتھ رہتا تھا۔ جس کی تمام عمر بچوں کو پڑھاتے گزری، اور جب پنشن میں صرف ایک سال باقی تھا تو باقی عمر جیل کی نذر ہوگئی۔۔۔۔ انہیں پچھلے دنوں ٹائیفائیڈ ہوگیا اور ان کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی، جیل کا ڈاکٹر پہلے ملیریا جان کر کونین کے ٹیکے لگاتا رہا اور جب سرسامی اور ہذیانی کیفیت پیدا ہوگئی تو ڈاکٹر نے گھبرا کر پنسلین کے ٹیکے لگانے شروع کر دیئے، مریض کی حالت بد سے

بد تر ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ آخر میرے کہنے سننے سے لیفٹیننٹ نے بھائی کو لکھ کر کلو روبائی سین کے کیپسول منگوا کر استعمال کرانے شروع کئے اور لیفٹیننٹ کے چچا باقی ماندہ قید کاٹنے کے لئے صحت یاب ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ورزش کے علاوہ عریاں ناولیں پڑھنا اور امریکن رسالوں کی ننگی تصویریں دیکھنا بھی لیفٹیننٹ کی ہابی تھی ۔ وہ سارا دن فوجی وردی اور فل بوٹ پہنے لیفٹ رائٹ کرتا ہوا سارے جیل کے چکر لگاتا رہتا' وہ پٹھان تھا لیکن پشتو کم اور انگریزی زیادہ بولتا تھا ۔ جیل کے افسروں کو سگریٹ پیش کرکے اسے بڑی خوشی ہوتی' داروغہ اور سپرنٹنڈنٹ کا ذکر غائبانہ طور پر اتنے احترام سے کرتا ۔ جیسے وہ حاضر ناظر ہوں اس کے ساتھ ہی ایک خان کا کوارٹر تھا ۔ تاش کھیلنا اس کا محبوب مشغلہ تھا ۔ جب تاش کا کوئی حریف نہ ملتا تو قرآن خوانی سے جی بہلاتا ۔ اسے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں پشاور جیل سے اسے تبدیل نہ کر دیا جائے ۔ اس کے علاوہ وہ روپیہ پانی کی طرح بہا رہا تھا ۔ اسے اپنے سوا اور کسی کی بے گناہی کا یقین نہ آتا' اپنی امارت اور خانی کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتا ۔ اسے سیاسی لوگوں سے بڑی نفرت تھی اس کا خیال تھا کہ انہیں کی وجہ سے موچی چچا اور دوسرے گھٹیا خوانین آنکھیں دکھانے لگے ہیں ۔

وہ کہتا دیکھئے جی پہلے کوئی خان اپنے دو چار مزارعوں کو جان سے مار دیتا تو کوئی پوچھتا تک نہ تھا ۔ لیکن یہ آخری زمانہ نہیں تو کیا ہے' غضب خدا کا قتل میرے نوکر نے کیا اور عمر قید میں بھگت رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی شخص رہا ہونے لگتا تو اس کو بڑا صدمہ ہوتا اس کا منہ لٹک جاتا ۔ غم و غصہ سے دل بھر آتا اور کچھ بس نہ چلتا تو نوکر پر برسنے لگتا اور پلاؤ پکانے کا آرڈر دے دیتا ۔

ہمارے دائیں طرف ایک کوارٹر میں مسٹر بیسی تھا جس پر چار سو بیس کے بیسیوں مقدمے تھے ۔ لیکن انگریز تھا ۔ اس لئے بی کلاس ملی ہوئی تھی ۔ بنگلے کا

سگریٹ پیتا اور پھٹی پرانی پتلون پہن کر ایک ایک کمرے میں جاتا اپنے افسری کے زمانے کی جھوٹی داستانیں بیان کرتا' جیل والوں کو صلواتیں سناتا اور اپنے ہائی کمشنر سے شکایت کرنے کی دھمکی دیتا' وہ اپنے راشن کا غالب حصہ فروخت کر دیتا اور اس طرح اس نے سابقہ پانچ برس کے زمانہ اسیری میں کافی کچھ جمع کرلیا تھا - وہ کافی بوڑھا شخص تھا - لیکن صحت قابل رشک تھی - مسکراہٹ اس کے جھریوں بھرے چہرے کا ایک لازمی جزو بن چکی تھی -

صوبیدار اس کا ہانڈی وال تھا - وہ بہت بعد میں آیا - عمر رسیدہ شخص تھا - پنجاب کا رہنے والا تھا' تمام عمر ملٹری میں گزاری' جنگ کے دوران دور دور تک گھوم آیا تھا - کچھ رقم خورد برد کرنے کے الزام میں تین سال کی سزا ہوئی سارا دن حقہ پیتا' سپرنٹنڈنٹ کے قصیدے پڑھتا اور موجودہ نظام حکومت کی مذمت کرتا - - - - اسے امن سے نفرت اور جنگ سے پیار تھا - رات دن دعائیں کرتا کہ کاش پاکستان کی ہندوستان سے ٹھن جائے' افغانستان سے جنگ چھڑ جائے' اسے ہار جیت کی پرواہ نہ تھی - ملک و قوم کی تباہی کی فکر نہ تھی - وہ تو بس جنگ چاہتا تھا - کیونکہ اس کے لئے اس کال کوٹھڑی سے نکلنے کا یہی ایک واحد راستہ تھا - لیفٹیننٹ سے اس کی پکی دوستی تھی - دونوں فوجی تھے - دونوں جیل کے احاطہ سے اڑ کر محاذ جنگ پر پہنچنے کے خواب دیکھ رہے تھے - وہ جب آپس میں جنگ کے متعلق گفتگو کرتے تو ان کی صورتیں بھیانک ہو جاتیں وہ موت کے خوفناک دیو معلوم ہوتے' جنہیں انسانی خون کی چاٹ پڑ چکی ہو انہیں اس انہماک اور اشتیاق سے جنگ کا منتظر دیکھ کر میرے ذہن میں انسانی لاشوں کے گلے سڑے ڈھانچوں پر منڈلانے والے گدھوں کا تصور ابھرنے لگتا -

اس بارک کا آخری کمرہ دو موٹے تازے بھائیوں کے قبضے میں تھا جو ٹھیکیدار تھے اور کسی جھگڑے فساد میں پانچ سال قید تھے - ان کا کھانے پینے کے

سوا لور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ ہر وقت باورچی خانے کے چکر کاٹتے رہتے اور کچھ نہ کچھ منہ میں ڈال کر چل دیتے۔ کھانے یا چائے کو ذرا دیر ہو جاتی تو چیخ چیخ کر سارے جیل کو سر پر اٹھا لیتے ---- ان کا باورچی درشم نامی پتلا دبلا شخص تھا جس کا دستانہ ہر وقت کھویا رہتا میں نے جب اسے دیکھا دستانے کی تلاش میں سرگرداں پایا' معلوم ہوتا تھا۔ وہ کوئی نفسیاتی کیس ہے۔

سامنے قصوریوں کی ایک چکی میں اکبر اعظم بند تھا' وہ بہت بڑے لینڈ لارڈ کا بیٹا تھا۔ قتل کے جرم میں عمر قید سزا ہوئی۔ اسی دوران میں ڈیرہ جیل سے پشاور آتے ہوئے راستے میں ایک سپاہی کو قتل کرکے مفرور ہونے کی کوشش کی لیکن گرفتار ہوگیا--- وہ با اثر اور متمول خاندان کا فرد تھا۔ اس لئے بڑا منہ زور اور بے لگام تھا۔ جیل والے اس سے تھر تھر کانپتے تھے بارہا جیل کے ملازمین کو پیٹ ڈالا لیکن جیل کے سخت حکام اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

شہزادہ برکت اللہ مجاہدین چمرکند کی تنہا یادگار ہیں۔ پختونستانی ہونے کے الزام میں گزشتہ چار برس سے سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بندی کے ایام گزار رہے ہیں۔ عالم فاضل شخص ہیں' بلاغ د بہار طبیعت پائی ہے' باہر بڑے ٹھاٹھ سے زندگی گزارتے رہے' رہائی کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کوئی صورت نہ بن سکی' نماز پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جہاں کہیں دو چار نمازی ہاتھ آئے' تو فوراً" رضاکارانہ طور پر امامت کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیتے۔ صبح کی نماز اپنے احاطے میں پڑھاتے' عصر کی ہسپتال میں' شام کی چکر میں---- نمازوں کے چکر سے جو وقت بچا رہتا۔ اس وقت میں جیل کے کونے کونے کا چکر کاٹتے رہتے یا جیل کے بڑے پھاٹک کے گول سوراخوں سے مسلسل باہر جھانکتے رہتے --- آئے دن دانت اکھڑوانا' نئے دانت لگوانا اور عینکوں کے نمبر بدلوانا ان کی ہابی تھی۔ اس بہانے پر مہینے میں دو تین دفعہ سول ہسپتال جانے کا

موقع مل جاتا اور باہر کی تازہ ہوا میں سانس لینا میسر آجاتا - نجانے یہ سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد انہیں خود فریبی کا کون سا نیا طریقہ ایجاد کرنا پڑے گا -

سیاسی قیدیوں میں ایک مولانا امام شاہ تھا - جسے تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں ایک سال سزا ہوئی تھی - جذباتی قسم کا نوجوان ملا تھا - تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوتا تو جو کچھ منہ میں آتا کہہ جاتا - اپنی افتاد طبع سے بیزار تھا لیکن اس پر کنٹرول کرنا اس کے بس میں نہ تھا - افضل کی طرح نئی نئی شادی کرکے آیا تھا - نئی بیوی اور ہونے والے بچے کے خیال سے مضطرب رہتا - سادہ لوح، سادہ نظر اور سادہ وضع شخص تھا - جیل میں مطالعے کا موقع ملا تو اس کے محدود مذہبی رجحانات میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی - وہ کاکا خوشحال کو دیکھتے ہی ان سے عربی میں گفتگو شروع کر دیتا اور میں سوچنے لگتا کہ آغا خان نے جو انگریزی میں خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے لئے قومی زبان تجویز کی تھی - اگر کہیں اس کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے - تو ہم ایسے نالائق لوگوں کے لئے یہاں سے ہجرت کرنے کے سوا کیا چارہ کار باقی رہ جاتا ہے -

ایک دن حوالات دیکھنے گئے - وہاں ایک پوری دنیا آباد تھی - چھ سو نفوس کو آٹھ کوٹھڑیوں میں بری طرح ٹھونسا گیا تھا - ساتھ ہی منڈا خانہ تھا - جس میں نابالغ لڑکوں کو رکھا جاتا تھا - اس میں قوم کے نونہال بند تھے - جن کی تربیت اور اصلاح کی طرف توجہ دینے کے بجائے انہیں متعفن اور گندے ماحول میں چھوڑ دیا گیا تھا - ان میں غالب اکثریت ایسے بچوں کی تھی جن کا کوئی والی وارث نہ تھا - بچپن ہی سے آوارگی میں پڑ کر جرائم پیشہ بن گئے - ان کا مستقبل سنوارنے کے لئے ضروری تھا کہ مناسب طور پر ان کی تعلیم و تربیت کی جاتی - تاکہ وہ آگے ایک اچھا شہری بننے کے قابل ہوسکتے - لیکن اس کی بجائے وہاں ایک اچھا مجرم بننے کی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع زیادہ تھے -

منڈا خانہ جیل میں بدمعاشی کا اچھا خاصہ اڈہ ہے جہاں تمام قیدی دن بھر کی مشقت کے بعد جی بہلانے کے لئے جمع ہو جاتے ۔ لڑکے طوائفوں کی طرح بن سنور کر بیٹھتے جیل کے ملازم دلال بن کر سودا چکاتے اور وہاں چکلوں کی طرح چہل پہل اور گہما گہمی نظر آتی۔

وہاں صفائی کا انتظام بڑا ناقص تھا۔ ہر طرف غلاظت کے ڈھیر لگے رہتے' تعفن اور بدبو ناقابل برداشت تھی۔ جس سے اکثر حوالاتیوں کی صحت برباد ہو رہی تھی۔ اکثر حوالاتی آوارہ گردی کا شکار تھے۔ ایسے حوالاتی بھی تھے جو سالہا سال سے پڑے تھے۔ ایک شخص کے متعلق سنا کہ اسے غیر ملکی ایجنٹ ہونے کے شبہ میں گرفتار کیا گیا۔ اسے پورے چھ برس حوالات میں گزر گئے۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا تنگ آکر خود کشی کی کوشش کی' لیکن بچا لیا گیا آخر ایک دن اس تالاب میں کود پڑا جس میں دھونے کے لئے کاسٹک ملا پانی ابل رہا تھا' نکا گیا' نہایت بری حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا۔ تین ماہ تک علاج ہوتا رہا۔ بچنے کی کوئی صورت نہ رہی تو سٹریچر پر باہر لے جا کر رہا کردیا گیا۔ جہاں دوسرے ہی دن قید حیات سے رہا ہوگیا۔

ایک شخص نے بتایا۔ وہ بیٹے کی شادی کے لئے سامان خریدنے شہر آیا پولیس نے آوارہ گردی میں دھر لیا۔ پندرہ دن سے اندر پڑا تھا۔ نہ کوئی ضمانت دینے والا تھا نہ گھر والوں کو اطلاع تھی۔ شادی کی تاریخ گزر چکی تھی۔ و پریشان تھا کہ کرے تو کیا کرے ہم نے اس کے بیٹے کو خط لکھا۔ چند دنوں بعد گاؤں سے لوگ آئے اور ضمانت دے کر لے گئے۔ ایک شخص نے بتایا اس کو اپنے ایک ہم نام کے دھوکے میں گرفتار کیا گیا۔ اب اصلی ملزم پکڑا جا چکا تھا لیکن پولیس یہ اطمینان کرنے کے بعد اسے چھوڑنا چاہتی تھی کہ اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اور مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آگیا۔

پچھلے سال مجھے بھی پولیس اس مغالطے میں لے گئی ان دنوں ملک میں سیاسی کارکنوں کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں' اس لئے کوئی تعجب نہ ہوا - لیکن تھانے پہنچ کر سب انسپکٹر کی زبانی جب انکشاف ہوا کہ سیفٹی ایکٹ کے بجائے 302 کا مجرم ہوں تو پسینے چھوٹ پڑے لیکن خوش قسمتی سے جلد ہی یہ غلط فہمی دور ہو گئی اور میں پھانسی کے پھندے سے بال بال بچ گیا -

حوالات میں کئی ایک شناسا مل گئے - ایک مسکر دکاندار ملا جو بلیک مارکیٹ میں آیا تھا - اسے تیسرا دن تھا - اگلے روز ضمانت ہوئی تھی - لیکن وہ نہ ہو سکی' بے چارہ خود کشی پر آمادہ تھا - کہنے لگا تمام رات روتا رہتا ہوں' ذرا آنکھ لگتی ہے تو بچے سامنے آجاتے ہیں اور ہچکی بندھ جاتی ہے - - - - ایک نوجوان کو دیکھا جس کے خلاف دھوکہ بازی کے 120 مقدمات رجسٹرڈ ہو چکے تھے اور یہاں بھی اس کا شغل جاری تھا -

ایک کشمیری نوجوان اسی قسم کے ایک مقدمہ میں ماخوذ تھا وہ اتنا نیک اور معصوم نظر آتا کہ ہر ملنے والے کو اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی - - - - ہر وقت خدا اور رسول کی باتیں' قرآن و حدیث کا ذکر - - - - مجھے تو اس سے مل کر احساس کمتری پیدا ہونے لگا - لیکن جب کھلنے کا موقع ملا تو اس نے بتایا کہ میں نے راولپنڈی کے چکلے میں ایک داشتہ رکھی ہوئی تھی' شراب بلا ناغہ پیتا تھا - گانا سنے بغیر روٹی ہضم نہیں ہوتی تھی - - - - لیکن جیل میں آکر میں نے سب برے کاموں سے توبہ کرلی ہے' شراب کے معاملے میں اس کا ارادہ ڈگمگا رہا تھا - اسے اپنی رہائی کی قوی امید تھی - کیونکہ بقول اس کے کوئی قانونی ثبوت اس کے خلاف موجود نہیں تھا - فیصلہ کی تاریخ قریب آنے لگی تو وہ گھبرا گیا اور آخر ایک دن گڑگڑا کر دعا کی - - - - یا اللہ مجھے رہا کردے - میں تمام برے کاموں سے ہمیشہ کے لئے توبہ کرلوں گا' حتیٰ کہ شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگاؤں گا - - -

ہیں تو مند وارڈر ایک نحیف و نزار جسم پر ڈنڈے برسا کر اپنی وحشت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ جب یہ سین ختم ہوا تو مضروب کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں وہ پورے دو مہینوں تک زیر علاج رہا۔

یوم آزادی پر جب کہ سارے ملک میں جشن استقلال منایا جا رہا تھا۔ جیل میں بھی سبز جھنڈیاں لگانے اور روشنی کرنے کا انتظام ہونے لگا۔ عام قیدیوں کو اس تقریب کی صرف اتنی خوشی تھی کہ ہر سال پندرہ بیس دن معافی مل جاتی تھی، لیکن اس دفعہ جب انہیں معلوم ہوا کہ اب یہ رسم ترک کردی گئی ہے تو ساری خوشی کافور ہو گئی۔

ارباب غفور کی علالت طویل ہوتی جا رہی تھی، ہم سب مشوش تھے، سول سرجن آیا اور معائنہ کرنے کے بعد پنسلین کے ٹیکے تجویز کئے، حالانکہ میعادی بخار کی واضح علامتیں نظر آرہی تھیں۔ لیکن چونکہ ارباب صاحب کی علالت کی خبر پریس میں آنے پر سول سرجن ایک سرکاری تردیدی اعلان کے ذریعے انہیں بد ہضمی اور گلے کا مریض ظاہر کر چکے تھے۔ اس لئے اب اپنی خفت کو چھپانا ضروری تھا۔ ایک مزے کی بات یہ ہے کہ خوراک میں جو چیزیں انہوں نے لکھیں، وہ جیل والے دینے سے انکاری تھے، ہم نے کہا کہ انہیں سول ہسپتال منتقل کردیا جائے۔ جہاں خاطر خواہ علاج ہو سکے۔ لیکن یہ درخواست نامنظور کردی گئی۔ البتہ دوسرے دن جیل ہسپتال میں ان کے لئے ایک کمرہ خالی کردیا گیا اور ہم رات کی تاریکی میں انہیں وہاں پہنچا آئے۔ رات دن پنسلین کے ٹیکے لگائے جا رہے تھے۔ لیکن مریض کو کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ارباب صاحب پرہیز کے معاملہ میں بڑے محتاط تھے۔ شاید اس لئے معالجوں کی گوناگوں بدعنوانیوں کے باوجود ان کا بخار معتدل رفتار سے جا رہا تھا آخر میں نے ایک ڈاکٹر سے کہا۔ معلوم ہوتا ہے، آپ لوگ مریض کی جان لینے پر تلے

ہوئے ہیں - آج پندرہ دن سے بخار ٹوٹا نہیں، نبض کی رفتار مدہم ہے - دوسرے تمام آثار میعادی بخار کے ہیں لیکن علاج کچھ اور ہو رہا ہے ---- وہ بڑی سادگی سے بولے ---- جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے کہ ہو نہ ہو یہ ٹائیفائیڈ ہی ہے ---- تو پھر پنسلین کے ٹیکے کیوں لگ رہے ہیں - میں نے ذرا ترشی سے کہا ---- آپ کہیں تو بند کر دیتے ہیں ---- وہ بڑی نرمی سے بولے ---- ہم کہیں بڑی عجیب بات ہے - ڈاکٹر آپ ہیں اور آرڈر ہم سے لے رہے ہیں - اگلے دن خون لے کر لیبارٹری بھیجا گیا اور جب ٹائیفائیڈ کا ڈاکٹر صاحب کو یقین ہوگیا تو کلورو مائی سین منگوانے کے لئے سپرنٹنڈنٹ سے اجازت لی - پھر دوا فروشوں سے ٹینڈر مانگے ---- دن گزر رہے تھے، ارباب صاحب بغیر دوائی کے پڑے تھے - ہم نے اپنے خرچ پر دوا منگوانا چاہی لیکن انہوں نے روک دیا اور کہا جیل میں رہ کر اپنے خرچ سے دوا ہرگز نہیں منگواؤں گا - یہ میرا اصول ہے - مجھے مرنا منظور ہے لیکن یہ بے اصولی منظور نہیں ---- نتیجہ یہ کہ دس دن بعد جب دفتری مراحل سے گزر کر دوا آئی تو اس وقت تک ارباب صاحب کا ٹمپریچر گر چکا تھا ----

انہی دنوں داروغہ کے بیٹے پر ٹائیفائیڈ کا حملہ ہوا اسے ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا اس لئے وثوق سے کہنا مشکل تھا کہ اسے ٹائیفائیڈ ہی ہے - لیکن ڈاکٹر صاحب نے کلورو مائی سین کی جو بوتلیں ارباب صاحب کے لئے منگوائی تھیں، داروغہ کے لڑکے کو استعمال کرانا شروع کردیں اور جلد ہی اس کا بخار ٹوٹ گیا - مجھے پتہ چلا تو میں نے داروغہ سے کہا ---- آپ نے اچھا ہی کیا جو وہ دوائی استعمال کرلی ورنہ مفت میں ضائع ہو جاتی ---- قیمتی دوائی سے فائدہ اٹھانے کے لئے بیماری مول بھی لینا پڑے تو سودا مہنگا نہیں رہتا -

ہسپتال کا نظم بڑا ناقص تھا' لیکن اتنا گندہ کہ اندر داخل ہوتے ہی بدبو سے دم گھٹنے لگتا' کمرے صاف تھے۔ لیکن چارپائیوں کے گدیلوں' تکیوں اور چادروں پر غلاظت کی تہیں جمی رہتی تھیں' ہسپتال کے دھوبی سے کپڑے ضرور دھلائے جاتے۔ لیکن وہ ہسپتال کے کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ ہسپتال کے لئے جو فینائل کے ٹین آتے' ان کا استعمال بھی ہسپتال سے زیادہ ضروری جگہوں میں کیا جاتا' یہی حال دوائیوں کا تھا ہسپتال کا دودھ یا تو صاحب استطاعت تندرست مریضوں کو ملتا یا ہسپتال کا عملہ مریضوں کی آسانی کے لئے بادل ناخواستہ اسے خود ہی استعمال کرلیا کرتا۔

مریضوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی' خصوصاً" ٹی بی وارڈ میں تو کتنے ہی مریض بغیر کسی معقول علاج کے پڑے سسک رہے تھے۔ ہر مہینے ایک دو مریض دم توڑ دیتے' آخری سٹیج تک انہیں کسی سینٹوریم میں بھیجنا تو درکنار' سول ہسپتال بھی نہ بھیجا جاتا۔ مریض موت کے منہ میں پہنچ جاتا اور اسے گھر جاکر مرنے کی اجازت بھی نہ دی جاتی حتیٰ کہ اس کی لاش ہی جیل سے نکلتی ----- دق سل کے مریض ہسپتال کی روشوں پر پوری آزادی سے تھوکتے پھرتے' خصوصاً" ٹی بی وارڈ کے مختصر سے کمرہ میں تو خون تھوک تھوک کر انہوں نے خوب گلکاری کر رکھی تھی۔ اس سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وارڈ کے اچھے مریض جلد ہی درمیانی فاصلہ طے کر کے آخری سٹیج کے حدود میں داخل ہو جاتے اور پھر ان حدود کو پھاندنے میں بھی زیادہ تکلیف کی ضرورت نہ پڑتی۔ آئی جی یا وزیر صحت نے تو کبھی بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ البتہ اے آئی جی مہینے میں ایک آدھ دورہ کر لیتے' ان کی آمد کا سن کر کسی قدر صفائی وغیرہ کر دی جاتی اور پھر وہی معمول -----۔ ہسپتال کا عملہ دو ڈاکٹروں اور چار کمپونڈروں پر مشتمل تھا۔ بڑے ڈاکٹر درد گردہ کے مریض تھے اور ایک عرصہ سے چھٹی پر

تھے' چھوٹے ڈاکٹر بڑے اچھے آدمی تھے - وہ اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لیتے' ہسپتال کا کام انہوں نے کمپونڈروں کو سونپ رکھا تھا - جو سارا دن مریضوں کو نمبر ایک سے لے کر نمبر سولہ تک پلاتے رہتے - - - - بڑا ڈاکٹر صحت یاب ہو کر آیا اور ہسپتال کا چارج سنبھال لیا - تو چھوٹا ڈاکٹر اداس رہنے لگا وہ بہت کم ہسپتال آتا - ڈاکٹر ہر وقت چھوٹے ڈاکٹر کے خلاف زہر اگلتا رہتا - یہ کم بخت سارا سٹور بیچ کھا گیا ہے' مریض سے پیسے لئے بغیر انہیں داخل نہیں کرتا' اس نے دلال چھوڑ رکھے ہیں' سو روپے ماہوار لے کر مریضوں کا دودھ لگایا جاتا ہے' بڑا نکما ہے نالائق ہے - - - - ادھر چھوٹا ڈاکٹر بھی یہی کہتا - - - - بڑا ڈاکٹر سخت لالچی ہے' بد اخلاق ہے - دوائیاں چرا کر بیچتا ہے - - - - ہم دونوں کی سنتے اور حیران تھے کہ سچا کون ہے - حالانکہ دونوں سچ کہتے تھے - - - - - پھر بڑے ڈاکٹر کا اچانک تبادلہ ہوگیا' چارج پھر چھوٹے ڈاکٹر نے سنبھال لیا اور حالات معمول پر آگئے - - - کچھ دنوں بعد ایک نیا نوجوان ڈاکٹر آیا - - - - اب چھوٹا ڈاکٹر بڑا ڈاکٹر اور نیا آنے والا چھوٹا - - - - نیا ڈاکٹر بڑا شریف اور بھلے مانس تھا - وہ محض تفریحاً" تھوڑی دیر کے لئے آتا اور گھوم پھر کر چلا جاتا - اسے ہسپتال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی - وہ گلو خلاصی حاصل کرکے اپنی پریکٹس کرنا چاہتا تھا - لیکن کچھ عرصہ کے لئے قانوناً" ملازمت کرنے پر مجبور تھا - اس لئے اس وقفے کو جوں توں گزارنا چاہتا تھا - دوسرا ڈاکٹر خوش تھا - اسے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی جو کچھ کرے یا نہ کرے لیکن اس کے کام میں دخل نہ دے -

ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا - ایک قیدی ہمارے پاس آیا - وہ بے تحاشا چیخ رہا تھا - ہمارے استفسار پر اس نے کہا گزشتہ دو روز سے دانت میں درد تھا - ہسپتال جا کر ڈاکٹر کو دکھایا - وہ زنبور اٹھا کر دانت اکھیڑنے لگا لیکن گھنٹہ بھر تک

زور آزمائی کرنے کے باوجود کامیاب نہ ہوسکا - اب درد کی شدت انتہا کو پہنچ چکی ہے' ڈاکٹر کہتا ہے دانت مضبوط ہیں اس کے لئے سول ہسپتال جانا پڑے گا۔ لیکن وہاں جانے کے لئے حکومت سے اجازت لینا ضروری ہے اور یہ اجازت مہینہ بھر سے پہلے ملنی دشوار ہے - درد کی شدت سے مرا جا رہا ہوں' خدا را میرے لئے کچھ کیجئے - - - - ہم نے ڈاکٹر سے جا کر کہا - - - دانت تم اکھیڑ نہیں سکتے تھے تو زور آزمائی کی کیا ضررت تھی اور جب تمہاری غلطی سے اس کا یہ حشر ہوا تو اپنے اختیارات سے کام لے کر اسے فوراً" سول ہسپتال بھجواؤ تاکہ یہ اس عذاب سے چھوٹے - - - - وہ کھسیانا ہو کر بولا یہ میں کیسے کرسکتا ہوں - غالباً" اسے اپنے اختیارات کا بھی علم نہیں تھا۔

ارباب غفور کی علالت کے ساتھ ہی ہم سب سیاسی قیدیوں کو بیماری کے دورے پڑنے لگے - صنوبر کاکا تو مستقل طور پر دمہ کے مریض تھے - وہ باہر ہی زیرِ علاج تھے یہاں آکر پھر دمہ کے شدید دورے شروع ہوئے دورے کے دوران میں ان پر نزع کا سا عالم طاری ہو جاتا - پسینے چھوٹنے لگتے' دل ڈوبنے لگتا' ڈاکٹر آتا اور نمبر سولہ مکسچر دے کر چلا جاتا وہ مسلسل درخواستیں دے رہے تھے کہ کسی سپیشلسٹ ڈاکٹر سے میرا معائنہ کرایا جائے - لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی - آخر انہوں نے باہر خط لکھ کر اپنا پرانا نسخہ منگوایا - لیکن وہ دوائیاں جیل ہسپتال میں نہیں تھیں - ڈاکٹر نے انڈنٹ بھجوایا لیکن آخر وقت تک نہ تو ان کے لئے دمہ کا معالج آسکا اور نہ ہی دوائیاں - - - وہ پرہیز پر جی رہے تھے - جب سے آئے صرف گوشت اور چائے ان کی خوراک تھی' اس کے سوا نہ تو وہ کچھ کھا سکتے نہ ہی ہضم کرسکتے

ارباب سکندر آئے تو اچھے بھلے تھے - ان کی پہلی پیشی جیل کے احاطے

میں سٹی مجسٹریٹ کے سامنے ہوئی - جب وہ تندرست تھے' دوسری پیشی پر سٹی مجسٹریٹ نے سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں آکر انہیں ایک سال سخت سزا کا حکم سنایا' تب بھی وہ ٹھیک ٹھاک تھے - پھر کچھ دنوں بعد انہیں وہم ہوگیا کہ وہ بیمار ہیں ہم نے بہت سمجھایا - لیکن وہ نہ مانے - پھر سچ مچ ان کا ہاضمہ خراب رہنے لگا - کچھ دوائیاں ساتھ لائے تھے' کچھ اور منگوائیں اور باقاعدگی سے استعمال کرنے لگے اگرچہ اس کے باوجود ان کا ہاضمہ ہمیشہ خراب رہا -

افضل کی پہلے آنکھیں خراب ہوئیں' شاہ جی کمپونڈر صبح شام آنکھیں دھونے آتا اس کے دیکھا دیکھی ہم سب کی آنکھیں خراب ہونے لگیں' پھر افضل کا گلا خراب ہوگیا - آہستہ آہستہ انکشاف ہوا کہ اسے ایک نہیں کئی بیماریوں نے گھیر لیا ہے چونکہ ہر بیماری کا علاج ضروری تھا - اس لئے صبح سے شام تک ہر دس منٹ کے بعد اسے کوئی نہ کوئی دوا لینا پڑتی تھی - بے چارے کی حالت قابل رحم تھی - بظاہر اچھا بھلا تھا - سب سے زیادہ کھاتا' سب سے زیادہ کھیلتا' سب سے زیادہ باتیں کرتا - - - - لیکن غریب بیمار تھا -

مجھے ناک کی پرانی بیماری عود کر آئی' چیف سیکرٹری کو تین چار دفعہ لکھا لیکن کوئی جواب نہ ملا - آخر چار مہینوں کے بعد ڈاکٹر نے آکر دیکھا پھر آپریشن کے لئے اجازت حاصل کرنے میں ایک مہینہ اور لگ گیا - آخر ایک دن مجھے ہتھکڑیوں میں جکڑ کر ہسپتال لے گئے اور آپریشن کے فوراً بعد واپس جیل پہنچا دیا گیا - یہاں کون پوچھنے والا تھا' دو چار دن بڑے عذاب میں کٹے اور خود ہی اپنا علاج کرتا رہا -

امام شاہ کا گلہ خراب تھا - اس کی صحت گرتی جا رہی تھی - انہی دنوں اسے بھی آپریشن کے لئے

ہتھکڑیوں میں جکڑ کر ہسپتال لے گئے جہاں سے
پورے ایک مہینے بعد وہ لوٹ کر آیا تو اس کی صحت بڑی امید افزاء تھی۔
ہم سب بیمار تھے تو خوشحال کاکا بھلا کیوں پیچھے رہتے' انہوں نے بھی نمبر
پندرہ پینا شروع کر دی۔
جیل میں ہر مہینے ایک دو سرکاری وزیٹر آجاتے۔ لیکن ان کا آنا محض
رسمی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ وہ قیدیوں کے لئے کچھ مفید ثابت نہیں ہو سکتے تھے'
ان میں سے بعض تو سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں چائے پی کر اور رپورٹ لکھ کر
چلے جاتے' جو اندر آتے انہیں جیل کے عملہ کی نگرانی میں گھما کر حسب منشا
رپورٹ لکھوا لی جاتی' زیادہ تر وزیٹروں کو بی کلاس کی سیر کرائی جاتی جیسے ہمارے
ہاں غیر ملکی مہمانوں کو " لالو کھیت " کے بجائے " کیماڑی' کلفٹن اور ہاکس
بے " کے پر کیف نظاروں سے لطف اندوز کرایا جاتا ہے اور وہ یہاں سے جنت
ارضی کا تصور لے کے لوٹتے ہیں۔ اسی طرح جیل کے حکام بھی وزیٹروں کو سی
کلاس کے قیدیوں کی عبرت ناک زندگی سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں
۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ وزیٹر سیاسی قیدیوں سے نہ ملنے پائیں۔ جو وزیٹر ہم
تک کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتے ان کے سروں پر بھی جیل کا عملہ بری طرح
مسلط رہتا' تاکہ کوئی بات کھل کر نہ کی جاسکے' اس کے باوجود ہم خوب کھری
کھری باتیں کرتے' انہیں جیل والوں کی نا انصافی' قیدیوں کی مشکلات اور دوسری
تمام خرابیوں سے آگاہ کرتے' لیکن عموماً یہ سب کچھ بے سود ثابت ہوتا۔
کیونکہ ان میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے جو سوجھ بوجھ بھی رکھتے ہوں اور
جرات بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ایک بھاری بھرکم تن و توش کے وزیٹر بڑے شریف اور
حساس انسان تھے وہ اکثر آتے اور ہماری شکایات بڑی توجہ اور ہمدردی سے سن

کر اپنی رپورٹ میں اس پر روشنی ڈالتے ان کی رپورٹوں کو ضائع کرنے کے لئے ان پر سیاہی گرا دی جاتی کبھی بدلنے کی کوشش کی جاتی ---- انہیں خود بھی اس کا پوری طرح علم تھا۔ انہوں نے بتایا' ایک دفعہ کسی قیدی نے مجھ سے بے انصافی کی شکایت کی' جس کے متعلق میں نے اپنی رپورٹ میں نہایت زور دار الفاظ میں لکھا ---- کچھ دنوں بعد مجھے ڈیرہ جیل جانے کا اتفاق ہوا تو وہی قیدی وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی قریب آکر کہا ---- خان مجھے اس شکایت کے جرم میں دوسرے ہی دن سزا کے طور پر یہاں بھیج دیا گیا۔

ایک دن پیر صاحب مانکی شریف (جو ان دنوں وزیٹر تھے) تشریف لائے' دیر تک باتیں ہوتی رہیں' وہ سارے جیل میں گھومے تمام قیدی انہیں بڑی عقیدت سے ملے' اپنی شکایات پیش کیں' جرگہ والوں نے اپنے مصائب بیان کئے' خوراک دیکھنے کے لئے لنگر خانہ گئے۔ جہاں حسب معمول فوراً چار روٹیاں اچھے آٹے کی پکا کر رکھ دی گئی تھیں' ان کا وزن جیل کی منظور شدہ روٹی سے بھی ایک چھٹانک زیادہ تھا۔ بعد میں ہم نے پیر صاحب کو جیل کی عام روٹی دکھائی تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔

پیر صاحب کے بعد ایک دن ضلع ہزارہ کی مشہور و معروف شخصیت فقیرا خان جدون مدیر "انکشاف" آگئے وہ بڑی محبت سے ملے اور جتنی دیر بیٹھے رہے اپنی بذلہ سنجی سے محظوظ کرتے رہے ---- پھر سرحد اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر ملک امیر عالم خان مدیر "ترجمان سرحد" تشریف لائے وہ دیر تک ملکی مسائل پر بات چیت کرتے رہے۔ آخر میں یہ انکشاف کیا کہ وہ 30ء میں اسی کمرے میں چھ مہینے قید گزار چکے ہیں' جہاں اس وقت ہم مقیم تھے۔

سگریٹ کئی دنوں سے ختم ہو چکے تھے' افضل چلم پر گزارا کر رہا تھا۔ میں نے چھوڑنے کو تو سگریٹ چھوڑ دیئے لیکن تخلیقی کام بھی ساتھ ہی ترک

کرنا پڑا' کچھ سوچنے بیٹھتا تو جواب ہی نہ ملتا' پھر اچانک چند ڈبیاں آگئیں' افضل
نے بسم اللہ کہہ کر خوش ہو کر پہلا سگریٹ سلگایا' میں نے سگریٹ کے پیکٹوں
پر قبضہ جماتے ہوئے اعلان کیا کہ صرف دو سگریٹ روزانہ کوٹا ملے گا۔ افضل
نے بادل ناخواستہ منظور کرلیا لیکن میں پینے بیٹھا تو اپنے ایک ہفتے کا کوٹا ایک د
میں پھونک گیا اور پھر قرض پر گزر کرنے لگا۔

خوشحال کاکا قرآن پڑھاتے وقت اسلام اور قرآن کو اشتراکیت کا سرچشمہ
ثابت کرنے کے لئے عجیب و غریب تاویلیں کرنے لگتے' صنوبر کاکا کو یہ بات پسن
نہیں تھی - ان کا کہنا تھا کہ قرآن ایک سیدھی سادھی مذہبی کتاب ہے جے
سائنٹیفک اصولوں پر پرکھنا زیادتی ہے ----- خوشحال کاکا کو بحث کرنے کا بہن
شوق تھا - لیکن سلیقہ نہیں وہ کج بحثی پر اتر آتے اور اصل موضوع چھوڑ کر
کہیں کے کہیں نکل جاتے جس سے بحث کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا وہ مذہب او
اشتراکیت دونوں کے مبلغ تھے اور دونوں چیزوں کو کچھ یوں غلط ملط کر دیتے' ک
ان میں سے کسی ایک کی صورت بھی نہ پہچانی جاتی -

میں مصوری خوب زور و شور سے سیکھ رہا تھا - ماسٹر فیروز بڑی محبت او
دلچسپی سے کام سکھاتے' چھوٹی موٹی تصویریں بھی بنانے لگا تھا' اس مشغلے میں
وقت بڑے مزے سے کٹ جاتا' لیکن یہ شوق زیادہ دن جاری نہ رہ سکا' پنسل
ڈرائنگ میں ذرا شد بد ہوگئی تو آئیل کلر اور واٹر کلر پینٹنگ سیکھنے کا شوق چرا
لیکن اس کے لئے سامان مہیا کرنا دشوار تھا' چنانچہ بادل ناخواستہ مجھے اپنے اس
شوق ناتمام کو ہمیشہ کے لئے ترک کردینا پڑا۔

باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ محض خط و کتابت کے ذریعہ قائم تھا' لیکن

ڈاک کی بد انتظامی نے اس رابطے کو بھی بہت حد تک ناپائیدار بنا دیا' اکثر مقامی خطوط ہمیں بیس بیس دن اور بعض اوقات مہینہ مہینہ بعد ملتے' اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہوا' پیر صاحب مانکی شریف اور دوسرے احباب نے عید الاضحیٰ کے موقع پر جو عید کارڈ ارسال فرمائے تھے وہ ہمیں اس وقت موصول ہوئے جب کہ محرم شروع ہو چکا تھا - یہی حالت خانگی خطوط کی تھی' یہ بے ضرر خطوط بھی سنسر والوں کے پاس ایک مہینے تک پڑے رہتے' ایک دفعہ میں نے گھر لکھا' معلوم ہوتا ہے بے چارے سنسر والوں کا خط بھیجنے والا کوئی نہیں اس لئے وہ ہمارے خطوط ہی سے جی بہلانے پر مجبور ہیں یا پھر انہیں ہدایت ہوگی کہ ان خطوط کو حفظ کرنے کے بعد ہم تک پہنچائیں - جہاں تک میں نے غور کیا ہے اور کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی' جس کی وجہ سے مقامی ڈاک کے ملنے میں محض سنسر کی وجہ سے ایک ایک مہینے کی تاخیر واقع ہو' گھر سے خط آیا تو اس میں سدرہ' عذرا اور ننھے ظفر کے پرچے تھے - سدرہ عذرا نے لکھا تھا -

" ابا جان! امی ہم سے بیکار چھپاتی ہیں کہ آپ کراچی گئے ہیں - ہم اتنی نادان نہیں' سب کچھ جانتی ہیں' ہمارے سامنے پولیس آپ کو لے گئی - آپ نے کہا تھا - میں ابھی آتا ہوں لیکن آج تک نہیں لوٹے' ہم نے ابھی تک زندگی کا ایک ہی رخ دیکھا تھا - حسین و جمیل رخ - - - - یہ اداس اور غم ناک رخ اب سامنے آیا ہے - - - - نانی اماں کہا کرتی تھیں' زندگی میں غم ہی غم ہیں اور ہم ہنستی تھیں اب معلوم ہوا وہ ٹھیک ہی کہتی تھیں - - - - ایک ایک دن پہاڑ سا گزرتا ہے خدا جانے یہ پورا ایک سال کیوں کر کٹے گا -

ظفر نے لکھا - - - - - -

" ابا جی آخر آپ آتے کیوں نہیں' امی کہتی ہیں آپ مجھ سے روٹھ کر کراچی چلے گئے ہیں - آخر میں نے ایسا کیا - قصور کیا ہے' بس اب آجایئے میرا

دل بڑا لواس ہے "

مجھے یاد آیا پچھلے سال صنوبر کاکا گرفتار ہوئے تو ظفر نے نہایت معصومیت سے پوچھا " صنوبر کاکا نے کیا شرارت کی ہے جو حکومت نے اسے جیل بھیج دیا " اس وقت میں اسے کوئی جواب نہ دے سکا اور اب جبکہ اس کی معصوم صورت مجسم سوال بن کر مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ " ابا جان تم نے کیا شرارت کی ہے جو جیل جانا پڑا " تو اس وقت بھی میں حیران تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔

میں بتا چکا ہوں کہ جیل کی مشرقی دیوار کے اس پار پاگل خانہ تھا جہاں سے رات کی خموشی میں عجیب و غریب آوازیں آتی رہتیں۔ ایک دن ایک پاگل پکار پکار کر کہہ رہا تھا " میں پاگل نہیں ہوں' دنیا پاگل ہے وہ ہر عقل مند شخص کو پاگل سمجھتی ہے "۔

ایک عورت ہمیشہ یہی ایک فقرہ دہراتی رہتی ---- " مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی "

ایک پاگل بہت شور مچا رہا تھا۔ دوسرے نے نہایت سنجیدگی سے کہا " مسٹر چپ بھی ہو جاؤ تم تو نرے پاگل معلوم ہوتے ہو "۔

ایک پاگل کسی طرح جیل کی دیوار پر چڑھ گیا' وارڈروں نے بمشکل قابو کیا اور پوچھا یہاں کیا کرنے آئے ہو بولا ذرا ان پاگلوں کو دیکھتا ہوں' انہیں علیحدہ کیوں بند کر رکھا ہے کیا یہ ہم سے زیادہ خطرناک ہیں؟

اب لطیفے کی بات چلی ہے تو جیل کے متعلق بھی چند ایک لطیفے سن لیجئے ۔ ایک صاحب جیل کی برائیاں بیان کر رہے تھے۔ دوسرے نے کہا اب مجھ سے فوائد سنو' ایک سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہے کہ یہاں گرفتاری کا دھڑکا نہیں رہتا۔

ایک سپرنٹنڈنٹ بڑے مذہبی قسم کے آدمی تھے - خود بھی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور داڑھی رکھنے والے کو خوب معافیاں بھی دیتے تھے - ایک قیدی نے آتے ہی یہ بات سنی تو مصنوعی داڑھی منگوا کر لگا لی - سپرنٹنڈنٹ صاحب اس سے بہت ہی خوش تھے آئے دن معافیاں دیتے رہتے ---- جب وہ رہا ہوئے تو جاتے ہی اپنی مصنوعی داڑھی سپرنٹنڈنٹ صاحب کو بھجوا دی -

ایک قیدی نے رہائی کے وقت سپرنٹنڈنٹ سے درخواست کی کہ اسے اس ساگ کا تھوڑا سا تخم عطا کیا جائے - جو جیل میں کھلایا جاتا ہے اور سارا سال ختم ہونے میں نہیں آتا -

ایک شخص کو کسی مقدمہ میں ایک مہینہ سزا ہوئی' عدالت میں اس کا باپ اور دو بھائی موجود تھے' جب رخصت ہونے لگا تو باپ سے رو کر کہا' ابا جان بس یہ سمجھ لینا کہ تمہارے دو ہی بیٹے تھے اور مجھے ماں نے جنم ہی نہیں دیا تھا -

ایک میجر اور چند سپاہی ایک مقدمے میں ماخوذ تھے - عدالت نے میجر کو ایک سال او رسپاہیوں کو دو دو سال سزا کا حکم سنایا - میجر یہ حکم سن کر بہت برا فروختہ ہوا اور عدالت سے کہا یہ میری توہین ہے کہ میرے معمولی سپاہی کو زیادہ سزا ملے اور مجھے کم -----

ایک قیدی سے ناراض ہو کر سپرنٹنڈنٹ نے اسے ہری پور جیل چالان کر دیا' اتفاق دیکھئے دوسرے ہی روز سپرنٹنڈنٹ کو اپنی فوری تبدیلی کا حکم ملا اور جب قیدی کا چالان ہو گیا' تو سپرنٹنڈنٹ صاحب اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے -

ایک سیاسی رہنما پروپیگنڈہ کے بہت شائق تھے' جس دن اخبارات میں ان کے متعلق کوئی خبر نہ ہوتی' بڑی بے نیازی سے کہتے آج تو اخبارات میں

کچھ بھی نہیں ہے۔

ایک قیدی نے دوسرے کو خوش خبری سنائی کہ اس کی اپیل منظور ہو گئی ہے قیدی خوش ہو کر بولا سچ ---- پہلے قیدی نے کہا " ہاں بالکل سچ ---- تمہاری قید اپیل میں پانچ سال بڑھا دی گئی ہے۔"

ایک بی کلاس کا سیاسی قیدی تاریخ پر باہر گیا تو احباب میں سے کسی نے ازراہ مذاق کہا ---- یار تم باہر تو سی کلاس میں تھے لیکن سنا ہے اندر تمہیں بی کلاس مل گئی ہے' مبارک ہو۔

آج پھر سیاسی قیدیوں سے جیل کے عملے کی بد سلوکی کی سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کی تو اس نے یہ کہا کہ جیل کے معاملات ہیں' ان میں آپ کی دخل اندازی ٹھیک نہیں آپ اپنے کام سے کام رکھیں "۔

میں نے کہا میں سیاسی آدمی ہوں' سیاسی قیدیوں پر بے جا زیادتی میں برداشت نہیں کر سکتا' اس نے شین پوشوں کو بلا کر کہا اسے بند کر دو' چنانچہ مجھے جیل کے سیل میں بند کر دیا گیا۔ پانچ دن گزر گئے۔ کسی نے پوچھا تک نہیں یوں لگتا جیسے میرے جیل کے سیاسی ساتھیوں تک یہ اطلاع اب تک نہیں پہنچی۔ لیکن یہ بات ناممکن تھی' جیل کا تو ہر چھوٹے سے چھوٹا واقعہ پلک جھپکنے میں نہ صرف پورے جیل بلکہ حوالات تک پہنچ جاتا ہے۔ میں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ میری بھوک ہڑتال کا تیسرا دن تھا۔ ارباب سکندر اور افضل بنگش آئے اور کہنے لگے کہ انہوں نے سپرنٹنڈنٹ کو نوٹس دے دیا ہے کہ اگر کل تک فارغ بخاری کے مطالبات نہ مانے گئے تو ہم بھی بھوک ہڑتال کر دیں گے جیل کے حکام نے کوئی نوٹس نہ لیا تو میرے ساتھیوں ارباب سکندر اور افضل بنگش نے بھی بھوک ہڑتال کر دی۔ یہ خبر پریس تک پہنچی سارے ملک کی پریس نے جلی سرخی سے یہ خبر چھاپی' اس وقت جیل والوں کو ہوش آیا اور آٹھویں

دن منت سماجت کر کے انہوں نے ہماری بھوک ہڑتال ختم کرا دی۔

ایک دن صبح ہی صبح مولانا نور الحق گھبرایا ہوا آیا اور بتایا اسے بنوں بھیجا جا رہا ہے ۔۔۔۔ یہ بڑی افسوس ناک خبر تھی۔ ہم سب پریشان ہو گئے' مولانا بظاہر مطمئن نظر آتے تھے' لیکن ان کا رنگ متغیر ہو چلا تھا' بنوں جیل کا تصور بڑا خوفناک تھا وہ نہایت مختصر اور محدود جیل ہے' ساتھیوں سے جدا ہونے کا غم اور اجنبی ماحول میں زندگی گزارنے کا تصور کافی تکلیف دہ تھا۔ ادھر ہمیں یہ غم کہ ایک پیارے ساتھی کے علاوہ ہم ایک اعلیٰ منتظم سے بھی محروم ہو رہے تھے' مولانا کی موجودگی میں ہم انتظامی معاملات سے بالکل ہی بے نیاز تھے۔ اب یہ فکر دامن گیر تھی کہ یہ انتظام کون سنبھالے گا' مولانا بڑا ہر دلعزیز تھا۔ ان کے جانے کی خبر سن کر سارا جیل الڈ پڑا تھوڑی دیر بعد جمعدار نے آکر چالان کی باقاعدہ اطلاع دی۔ کپڑا گودام کے منشی نے آکر کپڑے بستر اور دوسرا سامان واپس لے لیا اور گیارہ بجے ہم مولانا کو جیل کے پھاٹک پر جا کر رخصت کر آئے۔ باہر اسے ہتھکڑیاں پہنائی گئیں اور وہ پولیس اور سی آئی ڈی کے نرغے میں سٹیشن کو چل دیئے ان کے جانے کے بعد ہم سارا دن اداس رہے اور اسی کے متعلق سوچتے رہے۔

27 اگست کو مردان کے دو ضمنی انتخاب ہو رہے تھے' ان دونوں حلقوں میں مسلم لیگی امیدواروں کے مقابلہ میں عوامی لیگ کے رہنما غلام محمد خان لوند خوڑ حصہ لے رہے تھے۔ شام کے وقت بڑی تشویش ناک خبریں آنے لگیں' کسی نے کہا' انتخابی حلقوں میں شدید تصادم ہوا اور کئی افراد مارے گئے کوئی خبر لایا کہ لوند خوڑ شدید زخمی ہے۔ رات گئے تک صحیح حالات معلوم نہ ہو سکے اور ہماری پریشانی بڑھتی گئی۔

اگلی صبح ہم انتخابی حالات سننے کو بے قرار اور اخبارات کے انتظار میں

چشم براہ تھے' خدا خدا کرکے دس بجے کے قریب اخبارات آئے تو معلوم ہوا۔ معمولی جھڑپوں کے علاوہ کوئی خاص فساد نہیں ہوا۔ دونوں سیٹیں مسلم لیگ جیت گئی یہ بات متوقع تھی۔ تفصیلی حالات کا انتظار تھا کہ اچانک دوپہر کے وقت لوند خوڑ گرفتار ہو کر آگیا اس نے بتایا کہ اس کے خلاف آج سے تیرہ برس پہلے کا ایک مقدمہ تازہ کرکے اسے دفعہ 209 تعزیرات پاکستان کے تحت گرفتار کیا گیا ہے اور مقدمہ جرگہ کے سپرد کردیا گیا ہے' اس نے الیکشن میں حکومت کی دھاندلی کے متعلق عجیب و غریب انکشافات کئے' میں سوچنے لگا' یہی عالم رہا تو نہ جانے ہمارے ملک اور عوام کا کیا حشر ہوگا اور ہمارا حکمران طبقہ جو روایات قائم کر رہا ہے وہ آئندہ جاکر کتنی مہلک ثابت ہوں گی۔

لوند خوڑ پاکستان میں حزب اختلاف کے چند سرکردہ عوامی رہنماؤں میں سے ہے۔ وہ کئی بار جیل کاٹ چکا تھا۔ انگریزی عہد میں اسے ہمیشہ اے کلاس ملتی رہی لیکن آج اپنی قومی حکومت نے اسے پہلے تو ایک جھوٹے اخلاقی مقدمہ میں ماخوذ کیا۔ پھر سی کلاس میں رکھا۔ جہاں وہ ایک عام بارک میں زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ لوند خوڑ بڑا حوصلہ مند اور جری انسان ہے' وہ زمانے کے گرم و سرد سے آشنا ہے' اس لئے اس حادثے کا اس پر کوئی خاص اثر نہ ہوا' اس کی زندہ دلی اور ہنگامہ آرائی میں کوئی فرق نہ آیا۔

اس کے آتے ہی سارا جیل اسے دیکھنے کو ٹوٹ پڑا۔ وہ سارا دن لوگوں سے ملتا رہا اور الیکشن کے واقعات سناتا رہا۔ اسکے آنے سے جیل میں ایک عجیب گرمی اور چہل پہل شروع ہو گئی۔ چند دنوں بعد اخبارات کے احتجاج پر اسے بی کلاس مل گئی اور ہمارے ساتھ رہنے لگا۔

13 ستمبر کا دن بڑا منحوس تھا لوند خوڑ کی پیشی تھی اسے صبح ہی صبح باہر لے گئے کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ ارباب سکندر خان کو ہری پور جیل لے جا رہے ہیں' یہ

خبر ہمارے لئے حادثہ سے کم نہ تھی' 11 بجے اسے ہم نے با چشم تر رخصت کیا' جب اسے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا کر لے جانے لگے تو یہ منظر ہم سے نہ دیکھا گیا اور ہم غم و غصہ سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے واپس آ گئے

ہمارا ایک اور محبوب ساتھی چھن گیا' اس کا ہمیں بڑا شاق تھا۔ لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا افضل اور ارباب سکندر آپس میں ہر وقت بات بات پر الجھتے رہتے تھے لیکن اس وقت افضل کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے' وہ سارا دن خاموش اور کھویا کھویا رہا۔

ارباب سکندر کی جدائی کا صدمہ ابھی تازہ تھا' کہ ایک بجے لوند خوڑ نے آکر بتایا کہ اسے سات سال قید سخت اور ساڑھے پانچ ہزار روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید ڈیڑھ برس قید کی سزا ملی ہے' اس نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح پراسرار طور پر جہانگیرہ کی پولیس چوکی میں اسے ڈپٹی کمشنر مردان نے آکر یہ حکم سنایا۔

سزا نہایت وحشیانہ تھی جس نے سنا حیرت و استعجاب سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ انتقامی کاروائی تھی جس کا حکومت کے پاس کوئی جواز نہیں تھا الیکشن میں جو دھاندلی کی گئی وہ قیوم خانی دور سے بھی تجاوز کر گئی لوند خوڑ نے ایک سو پچیس جعلی ووٹوں کی پرچیاں ایک پولیس والے سے چھینی تھیں جو وہ مسلم لیگی امیدوار کے بکس میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا وہ یہ پرچیاں لیکر لاہور جا رہا تھا تاکہ وہاں پریس کانفرنس میں ان تمام بدعنوانیوں کو منظر عام پر لائے' حکومت کو بروقت اس کا پتہ چل گیا اور اس نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے ایک ایسا آمرانہ اقدام کیا جس کی مثال نہیں ملتی تھی حکومت سرحد کی اس منتقمانہ کاروائی کے خلاف پاکستان کے تمام پریس نے بلا امتیاز پر زور احتجاج کیا حتی کہ سول گزٹ اور نوائے وقت جیسے نیم سرکاری اخبار بھی خاموش نہ رہ سکے اور انہوں نے اسے

انتہائی مذموم فعل قرار دیا۔

لوند خوڑ کے لئے قید و بند کا یہ سانحہ کوئی نیا نہ تھا لیکن جو رویہ اختیار کیا گیا تھا اس کا اسے بے حد دکھ تھا اتنی لمبی اور بھیانک سزا کا تصور کافی ہولناک تھا لیکن اس کے باوجود لوند خوڑ کی خوش طبعی اور خوش مذاقی میں کوئی فرق نہ آیا وہ رات دن جیل میں بھی ایک ہنگامہ برپا رکھتا اخبار بینی کا اسے نشہ تھا صبح سے دوپہر تک وہ اخبار دیکھتا اور اس کے بعد رات گئے تک گھومتا رہتا ایک لمحہ کے لئے بھی وہ کہیں ٹک کر نہ بیٹھتا کھانے پینے سے بے حد رغبت تھی خصوصاً "پلاؤ اس کا من بھاتا کھاجا تھا' ہر دوسرے تیسرے خود بھی پلاؤ پکواتا اور ویسے بھی جہاں پلاؤ پکتا یہ وہاں ضرور موجود ہوتا' ہمارے باورچی نور الٰہی نے ایک دن کہا' خان پلاؤ کے زور سے قید گزار رہا ہے "رات کے وقت گھنٹوں صوبائی' ملکی اور عالمی سیاست پر بحث ہوتی۔

کچھ دن بعد گجر خان کو بھی مردان جیل سے پشاور منتقل کر دیا گیا وہ سرحد عوامی لیگ کا نائب صدر اور پرانا سیاسی کارکن ہے۔ اسے دفعہ چالیس سرحدی کے تحت تین سال قید سخت کی سزا دی گئی یہ سزا اسے لوند خوڑ کے ضمنی انتخاب میں سرگرمی دکھانے کے جرم میں ملی تھی گجر خان بنا بنایا ہنگامہ تھا۔ اس کے آنے سے جیل کی فضا میں زندگی اور حرارت کی لہر دوڑ گئی وہ سارے جیل میں چہکتا پھرتا' جیل کے عملے سے الجھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس نے آتے ہی بی کلاس کے کپڑے مانگے' جیل والے حسب عادت ٹال مٹول کرتے رہے اور آخر ایک دن اس نے داروغہ کو نوٹس دے دیا کہ شام تک کپڑے نہ ملے تو میں کلاس چھوڑ دوں گا۔ شام تک کپڑے نہ مل سکے اور وہ اپنا سامان بی کلاس کے کمرے سے نکال کر باہر آ بیٹھا' داروغہ سپرنٹنڈنٹ اس سے بہت بدکتے تھے' انہوں نے سنا تو چپکے سے گھروں کو چل دیئے اور چکر جمعدار سے کہہ دیا کہ جس طرح ممکن ہو اس مصیبت

کو آج ٹال دے اور کل سب کام چھوڑ کر اسے کپڑے دلواؤ۔ چکر جمعدار نے آکر منت سماجت شروع کی گجر خان کب ماننے والا تھا۔ آخر بہ ہزار وقت ہم نے سمجھا بجھا کر اسے راضی کیا چنانچہ دوسرے دن شام سے پہلے پہلے اسے حسب منشاء کپڑے مل چکے تھے۔ لیکن کپڑے ملنے سے تصادم کا یہ سلسلہ ختم نہ ہوا۔ ہمیں ہر جائز کام کو ناجائز طریقہ پر کرانے کے لئے مجبور کیا جاتا' جیل والے اس چیز کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ بغیر جھگڑے معرکے کے کوئی کام کرنے کو تیار نہ تھے۔ ہمیں چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کے لئے بھی جھگڑے مول لینے پڑتے' جو مراعات ہمیں قانونی حاصل تھیں انہیں وہ مراعات دینے میں بھی تامل تھا۔ جو چیز ختم ہو جاتی اس کا دوبارہ حصول ایک بہت بڑے جھگڑے کا پیش خیمہ ہوتا' ٹوتھ پیسٹ ختم ہوا تو وہ نہیں مل رہا۔ بیڈمنٹن کے کارک ملتے ملتے یکایک بند ہو گئے تقاضا کیا تو جواب ملا شاک میں نہیں ہیں۔ انڈنٹ کیا جائے گا اور آ گئے تو مل جائیں گے ہم کہتے ختم ہونے سے پہلے تمہیں انڈنٹ بھیجنا چاہیئے تھا۔ اتنے دن جو ناغہ ہو گا یہ کس کھاتے میں جائے گا اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا وہ معاملے کو ٹالنے کے لئے طرح طرح کے بہانے بناتے چھوٹے داروغے بڑے داروغہ پر اور بڑا داروغہ سپرنٹنڈنٹ پر ذمہ داری ڈال کر اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا۔

جیل مینول کا آئین ہے جس میں قیدیوں کے حقوق اور مراعات بھی درج ہیں۔ اس کتاب کو جیل کے حکام قیدیوں سے یوں چھپاتے پھرتے ہیں جیسے کسی قیدی کی نظر سے یہ کتاب گزری تو قیامت آ جائے گی۔ ہم نے بھی اسے حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ ہم تو خیر کوئی سخت قدم اٹھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن گجر خان بے حد جذباتی تھا۔ وہ ہر آزمائش میں پڑنے کو تیار تھا۔ اس نے اپنی قید کے مختصر ایام میں بعض' ایسے خطرناک مواقع مہیا کئے کہ اگر ہم سوجھ بوجھ سے کام لے کر معاملہ کو سنبھالنے کی کوشش نہ کرتے تو واقعات نہایت

خوفناک موڑ اختیار کر جاتے۔

سپرنٹنڈنٹ اور داروغہ کی تبدیلی کی افواہیں کئی دنوں سے گرم تھیں، موجودہ سپرنٹنڈنٹ ہری پور جا رہے تھے، ان کی جگہ وہاں سے دوسرا سپرنٹنڈنٹ آنے والا تھا، اسی طرح اس داروغہ کی جگہ ڈیرہ اسماعیل خان سے داروغہ نے آنا تھا۔ آنے والے داروغہ کی آمد پر قیدی خوش تھے، کیونکہ وہ موجودہ داروغہ سے بہتر افسر اور بہتر انسان تھے، یہاں کافی عرصہ گزار چکا تھا۔ اور قیدیوں سے اس کا سلوک چنداں برا نہیں تھا البتہ نئے سپرنٹنڈنٹ کے نازل ہونے کی خبر نے قیدیوں کو کافی ہراساں رکھا تھا جو قیدی ہری پور میں اس کے ساتھ رہ چکے تھے انہوں نے اس کی سخت گیری کے قصے سنا سنا کر قیدیوں کو اور زیادہ خوفزدہ کر دیا بہت سے قیدی تو اس کی آمد سے پہلے ہی اپنے تبادلہ کی کوشش کرنے لگے سارے جیل پر ایسی دہشت چھائی ہوئی تھی۔ جیسے ملک الموت آ رہا ہو، ہر شخص کی زبان پر نئے سپرنٹنڈنٹ ہی کی باتیں تھیں۔ سنا ہے وہ سخت مشقت لیتا ہے، معافیاں دینے میں ممسک ہے، بات بات پر پٹائی کراتا ہے، ایک قیدی کو دوسرے سے بات تک نہیں کرنے دیتا بارک میں اس کے مخبر ہوتے ہیں، جو اسے رپورٹیں دیتے رہتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کی بیسیوں افواہیں جیل میں پھیلی ہوئی تھیں۔

پرانے سپرنٹنڈنٹ اور داروغہ نے اپنا تبادلہ روکنے کے لئے بہتیرے پاؤں مارے اعلٰے حکام کے پاس سفارشیں بھیجیں، بچوں کی بیماری کے سرٹیفکیٹ پیش کئے اور دوسرے تمام ممکن ذرائع استعمال کر ڈالے لیکن یہ تبادلے نہ رک سکے اور آخر ایک دن ہری پور سے نئے سپرنٹنڈنٹ اور ڈیرہ سے نئے داروغہ نے آکر اپنا چارج سنبھال لیا۔

لوگوں کے خدشات درست نکلے، نئے سپرنٹنڈنٹ نے آتے ہی نہ صرف نظم و نسق میں تبدیلیاں کیں، بلکہ بے پناہ سختی شروع کر دی، اس نے اپنے مخبر

ی غلط غلط رپورٹوں پر سینکڑوں قیدیوں کو ڈیرہ اور ہری پور بھجوا دیا روزانہ سو
پاس قیدیوں کا چالان بھیجا جاتا۔ سب لوگ سہمے ہوئے تھے، کوئی نہیں جانتا تھا کہ
ب اچانک اس کی تبدیلی کا پروانہ آجائے اور بوریا بستر باندھ کر جانا پڑے جیل
یں قیدیوں کے گھومنے پھرنے پر پابندی لگا دی گئی، مشقت لینے میں سختی ہونے لگی
ی کلاس والوں کو اپنے احاطوں اور کمروں میں سر شام بند کرنے کے احکامات صادر
کر دیئے گئے۔ قیدی تو قیدی نئے سپرنٹنڈنٹ سے جیل عملہ بھی نالاں تھا، ان پر نہ
صرف کام بڑھ گیا تھا بلکہ جا و بے جا مداخلت کے باعث کام کرنے کا موقعہ ہی نہ ملتا،
وہ رات دن جیل کے چکر کاٹتا رہتا، ملازم ہر وقت سہمے رہتے، نہ جانے کس وقت
پرنٹنڈنٹ آجائے، اس خدشے سے وہ پر سکون طریقہ سے کھانا تک نہ کھا سکتے، ہر
ت خون شیشی میں رہتا اور تو اور اس بیچارے کی اپنی جان بھی عذاب میں تھی۔
کی طبیعت تھی کسی پر اعتماد نہ تھا، ہر بات پر ٹوکنا ہر کام میں ٹانگ اڑانا، ہر چیز کو
ک و شبہ کی نظر سے دیکھنا اسکی فطرت بن چکا تھا۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں نظم و
نسق کا بحال رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہوا بھی یہی وہ جتنی زیادہ احتیاط کرتا گیا
نظام اتنا ہی بگڑتا گیا اور پھر ایک رات ایک قیدی شندی گل اپنے ساتھی نصراللہ کے
ساتھ اپنی بارک سے لوہے کی سلاخیں کاٹ کر فرار ہو گیا۔ شندی گل عادی مجرم
تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک بار پشاور جیل کی حوالات سے اور دوسری دفعہ ڈیرے
جیل سے مفرور ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کے متعلق کوئی احتیاطی تدابیر اختیار
نہیں کی گئیں اور اسے تیسری بار بھی بھاگنے کا موقع مل گیا۔ یہ سپرنٹنڈنٹ جیل
کے لئے بڑی بدنامی کی بات تھی وہ بہت سٹپٹایا پہلے سے زیادہ سختی کرنے لگا لیکن
عنوانیاں بڑھتی گئیں، انہی دنوں ایک پھانسی والے نے افیون پھانک کر خودکشی کی
کوشش کی جو اگرچہ موت سے بچا لیا گیا تاہم نظم و نسق کی خرابی کا یہ ایک واضح
ثبوت تھا۔ اس واقعہ کے بعد سختی اور بڑھ گئی لیکن حادثات نہ رک سکے اور چند

دن بعد ہی حوالات کی ایک بارک کے جنگلے کی سلاخ کاٹی گئی جس کا بروقت پتہ چل گیا ورنہ وہاں سے درجنوں حوالاتیوں کے بھاگ نکلنے کا امکان تھا۔ تخفظات بڑھ رہے تھے، سختی روز بروز بڑھ رہی تھی، اور ساتھ ہی بدعنوانیاں بھی ترقی پذیر تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جیل کا سارا عملہ سپرنٹنڈنٹ کی سخت گیر پالیسی سے برافروختہ ہو کر اس سے انتقام لینے پر تل گیا ہے۔

اکتوبر کے وسط میں سورج کی حدت کم ہونے لگی، درختوں کے سائے ڈھلنے لگے، موسم خزاں کی ہوائیں چلنے لگیں ہرے بھرے درختوں کے سبز پتے پیلے پڑتے گئے پھر سوکھ کر گرنے لگے، ٹنڈ منڈ تنوں اور ننگی شاخوں کو دیکھ کر ہمیں اپنی خشک اور بے کیف زندگی کا خیال آجاتا لیکن جلد ہی بہار کے حسین و جمیل اور رنگین و دلکش دنوں کے تصور سے ساری اداسیاں دھل جاتیں، بجھتی ہوئی آنکھیں چمک اٹھتیں، اور ڈوبتے ہوئے دل لہرانے لگتے۔

سردیاں شروع ہو گئی تھیں۔ یوں تو ہم نے ستمبر کے مہینے سے ہی کمرے کے اندر سونا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اب تو اندر کمبل اور لحاف اوڑھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ سردیوں کی لمبی راتیں بڑی بے کیف گزر رہی تھیں۔ مجھے رات بارہ ایک بجے تک مطالعہ کی عادت تھی، لیکن اپنے ساتھیوں میں صنوبر کاکا اور افضل کے سوا میرا کوئی ہمنوا نہ تھا۔ طبیعتوں کا یہ تضاد ہمارے لئے عذاب بن گیا۔ انہوں نے بمشکل تمام ہمیں نو بجے تک بتی جلانے کی اجازت دی، ادھر نو بجے ڈیوٹی جمعدار آکر ہمارے کمرے کو قفل چڑھا دیتا ادھر خوشحال کاکا جھٹ سے بتی گل کر دیتے، مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اندھیری قبر میں پڑا ہوں میں جو نیند کے لئے ترس جاتا تھا بے خوابی کا مریض بن چکا تھا۔ خیالات کے تانے بانے میں کچھ یوں محصور ہوتا کہ کئی رات تک نیند نہ پڑتی، کروٹیں بدل بدل کر پسلیاں دکھنے لگتیں اور سر میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو جاتا۔ یہ حال صرف میرا ہی نہ تھا۔

دوسرے ساتھیوں کو بھی یہی شکایت تھی لیکن مرض لاعلاج تھا۔

16 اکتوبر کو اچانک اخبارات میں ارباب عبدالغفور خان' ماسٹر خان گل اور ارباب سکندر خان کی رہائی کی خبر دیکھ کر ہم خوشی سے اچھل پڑے۔ ارباب غفور کو جا کر اطلاع دی۔ تو معلوم ہوا انہیں ایک دن پہلے ہی اس بات کا علم ہو چکا تھا۔ اور وہ بستر بوریا باندھ کر تیار ہو بیٹھے تھے۔ عصر کے وقت ارباب صاحب کی رہائی کا پروانہ آگیا ہم نے انہیں غم و خوشی کے ملے جلے جذبات سے الوداع کیا۔

ماسٹر خان گل اور ارباب سکندر خان کو ہری پور جیل سے رہا کر دیا گیا' ہم ان کی اچانک رہائیوں کی نوعیت پر دیر تک سوچتے رہے' یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ اگر صرف عوامی لیگ والوں کی رہائی کا فیصلہ ہوا ہے تو گجر خان اور لوند خوڑ کو کیوں نظر انداز کیا گیا۔ اور اگر دفعہ چالیس سرحدی کے قیدی رہا کرنے تھے تو گجر خان' غلام محمد گاما' مولانا نور الحق اور مولانا امام شاہ کی رہائی کیوں عمل میں نہ آئی۔ صرف تین آدمیوں کی رہائی میں کیا تک تھی' معاملہ بڑا ٹیڑھا تھا۔ جتنا سوچتے' اتنا ہی الجھتا جاتا۔

انہی دنوں سی کلاس کے چند سیاسی قیدیوں نے (جو غیر ملکی ایجنٹ ہونے کے الزام میں گزشتہ دو برس سے نظر بند تھے) بھوک ہڑتال شروع کر دی ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ ورنہ انہیں رہا کر دیا جائے بھوک ہڑتال کے اٹھویں روز انہیں ہسپتال بھیج دیا گیا پھر جبری خوراک دی جانے لگی انہوں نے مزاحمت کی تو سبز پوش وارڈروں کے ذریعے پٹائی کرائی گئی' چوٹیں تو سب کو آئیں لیکن دو ایک کی حالت تو بڑی خراب ہو گئی ان کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی ہم نے کوشش کی جن کی حالت زیادہ خراب ہے وہ بھوک ہڑتال توڑ دیں وہ کسی قیمت پر ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار نہ تھے۔ دن گزرتے گئے' ان میں سے ایک شخص میاں صاحب کی حالت بہت نازک ہو گئی جیل والوں

کو بھی سخت تشویش تھی، کیونکہ اس طرح کسی سیاسی قیدی کی زندگی کا ضائع ہونا حکومت کے لئے بدنامی کا باعث تھا۔ آخر خدا خدا کر کے بہزار جتن بیس روز کے بعد اس وعدے پر ان سے بھوک ہڑتال ختم کرائی گئی کہ ہائی کورٹ میں ان کی حبس بے جا کی درخواستوں کی سماعت ہو گی۔ لیکن بھوک ہڑتال ختم ہونے کے فوراً" بعد ہی انہیں سزا کے طور پر صوبہ کے مختلف جیلوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

اب ہم نے اپنی زندگی منظم کر لی تھی۔ افضل کئی دنوں سے ستار سیکھ رہا تھا۔ اور اس نے کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔ لوند خوڑ اور گجر خان تاش کے رسیا تھے انہیں اس شغل سے کم ہی فرصت ہوتی تھی۔ خوشحال کاکا یوں تو ہر فن مولا تھے لیکن بحثوں سے انہیں خاص رغبت تھی۔ کوئی بھی گفتگو کر رہا ہو۔ اس میں حصہ لینا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ صنوبر کاکا دیوان حافظ کا پشتو میں منظوم ترجمہ کرنے میں مگن تھے مجھے مصوری اور شاعری سے جتنا وقت ملتا اسے مطالعے میں صرف کرتا۔ ہم نے اپنی مصروفیت اتنی بڑھا رکھی تھی کہ سوچنے کا کم ہی موقع ملتا رات کو کھانا کھانے کے بعد افضل ستار بجانے لگتا، شاہین ہلکے ہلکے سروں میں نغمے الاپتا، اور میں شعر لکھنے میں منہمک ہو جاتا۔ اس وقت ہمارے کمرے کا سماں دیکھنے کے لائق ہوتا، شعر و نغمہ کی اس پرسکون فضا میں تیرتے ہوئے ہم کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔

ایک دن داروغہ نے خوشخبری سنائی کہ ہمارے کمرے کے لئے چھت کے بجلی کے پنکھے کی منظوری آ گئی ہے، ہم بے اختیار ہنسنے لگے، عجب ستم ظریفی تھی گرمی کا تمام موسم جل بھن کر پنکھے کے بغیر گزارا اور اب جب کہ اکتوبر کا مہینہ ختم ہو رہا تھا اور کڑاکے کی سردی پڑنے والی تھی، پنکھے کی منظوری آ گئی۔ ادھر گرم کپڑے ہمیں وسط ستمبر میں ملنے چاہیئے تھے، بار بار مطالبہ کر کے تھک گئے، جھگڑے معرکے تک نوبت جا پہنچی لیکن نتیجہ صفر۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کہتے کپڑوں کے لئے

انڈنٹ بھیجا ہے۔ ابھی منظوری نہیں آئی، ہم نے داروغہ سے کہا، بس ٹھیک ہے۔ پنکھا لگا دیجئے، سردیوں میں ہم اس سے محظوظ ہوتے رہیں گے۔ خدا نے چاہا تو گرمیوں تک کپڑوں کی منظوری بھی آ جائے گی، اس وقت ان کا لطف اٹھائیں گے اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ پنکھے کی ہوا گرمیوں میں کھائی جائے اور گرم کپڑے سردیوں میں پہنے جائیں، اس ترقی یافتہ زمانے میں روایتی باتیں بالکل فضول معلوم ہوتی ہیں۔ لکیر کا فقیر بننا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ ہر بات میں کوئی تنوع اور نیا پن ہونا چاہیئے۔ داروغہ صاحب کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا اور بولے اس میں ہمارا کیا قصور ہے، یہ تو منظوری دینے والے حکام کی سستی ہے۔ میں نے کہا قصور نہ آپ کا ہے نہ ان کا قصور ہے قصور تو ہمارا ہے کہ آپ کو خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں، ہر چیز مانگتے ہیں پھر اس کے لئے تقاضا کرتے ہیں آخر اور قیدی بھی تو ہیں، کسی بے چارے نے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی، اپنی مراعات کا انہیں علم تک نہیں اور سچ پوچھیئے تو یہ سب مراعات جو کتابوں میں درج ہیں وہ دینے کے لئے تھوڑی ہوتی ہیں۔ حکام منظوری دینے میں دیر لگاتے ہیں، آپ انڈنٹ بھیجنے میں لیکن اتنا اب ہمیں یقین ہو چلا ہے کہ آپ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ صحت یاب ہونے کے بعد دوائی دی جاتی ہے امتحان گزر جانے پر امتحان میں بیٹھنے کی اجازت مل جاتی ہے، عید کارڈ محرم تک ضرور پہنچ جاتے ہیں، سردیوں میں بجلی کے پنکھے اور گرمیوں میں گرم کپڑوں کی منظوری آجاتی ہے۔ ہوتا سب کچھ ہے بس ذرا وقت پر نہیں ہوتا۔

داروغہ چلا گیا تو گجر خان آیا اور جب ہم نے اسے یہ مژدہ سنایا کہ ہمارے کمرے کے لئے بجلی کے پنکھے کی منظوری آ گئی۔ اور دسمبر کے زمہریری دنوں تک مستقل طور پر پنکھا لگ جائے گا۔ تو وہ خوشی سے ناچنے لگا پھر اس نے سارے جیل میں گھوم کر ایک ایک دوست کو یہ مژدہ جانفزا سنایا۔ سب احباب ہمیں مبارک باد دینے کے لئے آنے لگے، عصر تک ہمارے ہاں کافی ہجوم ہو چکا تھا۔ وہاں ہم نے

ایک رزولوشن پاس کیا' جس میں حکام جیل کی جدت طبع کی داد دی گئی انہوں نے ہمیں سردیوں میں گرم کپڑوں کی بجائے بجلی کا پنکھا عطا کیا اور وہ گرمیوں میں گرم کپڑے دینے کا نیک اور احسن ارادہ رکھتے ہیں۔

جیل میں آنے کے بعد دو تین دوستوں کے سوا کسی نے بھی مجھے خط لکھنے کی جرات نہیں کی' وہ بھی ایک آدھ خط لکھ کر چپ ہو رہے' دنیا کتنی خود غرض ہے سکھی لمحوں میں کتنے دوست ہوتے ہیں لیکن دکھ کے وقت کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ لیکن خود غرض کون نہیں؟ ہم جو دوستوں سے آڑے وقت میں کام آنے کی توقع رکھتے ہیں' یہ بھی تو ایک قسم کی خود غرضی ہے' ہم کسی سے توقعات وابستہ نہ کریں تو مایوس ہونے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے تو اس صورت میں تعلقات کتنے خوشگوار کتنے سدا بہار ہوں۔

جیل میں نوے فیصدی لوگ نشہ پانی کرتے ہیں۔ شراب' افیون' گانجا' چرس' بھنگ' چنڈو غرض پیسہ ہو تو ہر چیز مل سکتی ہے۔ یوں تو تمام نشے چلتے ہیں' لیکن زیادہ تر چرس پی جاتی ہے' رات کے وقت جس بارک کے قریب سے گزرو' چرس کے مرغولے دماغ کو معطل کر دیتے ہیں۔ چرس کی بر سر عام خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جیل دراصل غریب اور بے سہارا لوگوں کے لئے نہایت سخت جگہ ہے' سرمایہ داروں اور با اثر لوگوں کے لئے اس کے آہنی قوانین میں لچک پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے آرام و آسائش کے تمام اسباب مہیا کر لیتے ہیں۔

خوانین بڑی بڑی دعوتیں کرتے ہیں' جن میں بیسیوں آدمی مدعو کئے جاتے ہیں' علاج کے بہانے باہر جا کر اپنے گاؤں سے ہو آتے ہیں۔ چاہیں تو روزانہ بال بچوں سے ملاقات کر سکتے ہیں' اور پھر مختلف ذرائع سے بڑی بڑی معافیاں حاصل کر کے نصف سے بھی کم قید گزار کر رہا ہو جاتے ہیں۔

سرمایہ داروں کے علاوہ غنڈہ قسم کے لوگ بھی جیل میں عجیب شان سے رہتے ہیں ان سے حکام بھی ڈرتے ہیں ملازم بھی اورقیدی بھی۔ پشاور جیل میں بڑے بڑے نامی گرامی غنڈے گزرے ہیں جن میں سے رحیم خان' مچلے وال' دلا' عبدو' کپوکاں' نھو' دوستے' کریموجٹ' فتو گنجا' دادو' سرمست اور اعظمو بہت مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے ایسے غنڈے بھی گزرے ہیں جن کی بہادری اور رعب و دبدبہ کے افسانے آج بھی قیدیوں کی زبانوں پر ہیں' رحیم خان کا جیل والوں سے جھگڑا ہوا تو اس نے اپنی بیڑیاں کانچ کی چوڑیوں کی طرح توڑ ڈالیں اور دو گھنٹوں تک تن تنہا جیل کے ملازمین اور پولیس کا مقابلہ کرتا رہا انتہائی اذیت رسانی کے باوجود جیل والے اس سے کبھی مشقت نہ کرا سکے جیل کے حکام کو وہ ہروقت گالیاں بکتا رہتا' جس سے تنگ آکر انہیں آخر اس کے سامنے جھکنا پڑا اور وہ جیل کا خودمختار بادشاہ بن کر قید کاٹتا رہا۔ مچلے وال پشاور کا مشہور تاریخی غنڈہ آج بھی پاگل خانے میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہے وہ بڑا سر تیز شخص تھا بڑے بڑے غنڈے اس کے نام سے لرزتے وہ لمبا چوڑا قوی ہیکل انسان ہے تمام عمر جیل میں گزری جیل کے اندر اس نے کئی معرکے سر کئے ایک سکھ داروغہ کی ناک کاٹ ڈالی ایک غنڈے کی ٹانگ توڑ دی' جیل کے عام لوہے کے جنگلے کی سلاخیں وہ تیلیوں کی طرح توڑ دیتا اس کے لئے خاص موٹی سلاخوں کے جنگلے بنائے گئے اور مخصوص بھاری بیڑیاں پہنائی گئیں۔ کریمو جٹ نے ایک اسسٹنٹ جیلر کو مکا مار کر ہلاک کر دیا تھا جس کی پاداش میں اسے پھانسی دے دی گئی' اسی طرح دوسرے غنڈوں کے کارنامے بھی کچھ کم دلچسپ نہیں اگرچہ اب بھی یہاں ایسے غنڈوں کی کمی نہیں لیکن ان کے پہلے سے ٹھاٹھ عنقا ہیں۔ البتہ یہ آپس کی دشمنیوں اور لڑائی جھگڑوں میں خوب طاق ہیں' ایک پٹھان غنڈے نے جو اس وقت پشاور جیل میں تھا۔ اس نے ڈیرے جیل میں رات کے وقت دو کوٹھڑیوں کی دیواریں توڑ

کر پہرے دار پر حملہ کیا اور اسے بری طرح زخمی کر دیا۔ ایک شخص جو قتل کے مقدمہ میں عمر قید گزار رہا تھا پچھلے سال ایک قیدی کو چاقو سے ہلاک کر دیا اور پھانسی کی سزا پائی۔

جیل کی زندگی نہایت پست اور ناقابل بیان ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک کے عوام کے معیار زندگی کی پستی کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ بعض قیدی باہر جانا پسند نہیں کرتے اس لئے کہ پیٹ بھرنے اور سر چھپانے کا سہارا جو انہیں جیل میں میسر ہے' باہر کی دنیا میں وہ اس سے محروم ہیں ان میں ایسے ایسے لوگ بھی ہیں جن کی تمام عمر ہی جیل میں کٹ گئی۔ آٹھ آٹھ اور دس دس بار جیل آنے والے تو اکثر ملتے ہیں۔ مجھے ایک ایسا شخص دکھایا گیا جو بیسویں بار جیل آیا تھا اس نے بتایا کہ میرا جی باہر نہیں لگتا سب یار دوست یہاں ہیں۔ باہر کوئی جاننے والا ہی نہیں رہا کہنے لگا ایک دفعہ سردیوں میں رہا ہوا' رلت بھوکا پیاسا فٹ پاتھ پر سونا پڑا نتیجے کے طور پر نمونیہ ہو گیا۔ ہسپتال پہنچایا گیا ایک مہینے کے بعد صحت یاب ہو کر نکلا تو ہسپتال کے دروازے سے باہر پاؤں دھرتے ہی ایک شخص سے بائیسکل چھین کر بھاگا اور پھر گرفتار ہو کر عدالت میں اقرار جرم کرتے ہوئے ایک سال کے لئے جیل آ گیا۔ مجھے وہ ضعیف العمر شخص کبھی نہیں بھول سکتا جسے عید سے ایک دن پہلے رہا کیا گیا تو وہ داروغہ کی منتیں کرنے لگا کہ اسے عید کا دن جیل میں گزارنے کی اجازت دے دی جائے کیونکہ باہر اس کا کوئی سہارا نہیں ہے اور جب اسے یہ اجازت نہ مل سکی تو وہ زار و قطار رونے لگا اور وارڈروں نے اسے زبردستی دھکے مار مار کر جیل کی ڈیوڑھی سے باہر نکال دیا۔

انسان یاس و قنوطیت کی انتہائی ظلمتوں میں بھی امید کی کرن تلاش کر لیتا ہے' ہر چند یہ اس کی خود فریبی سہی' لیکن یہ خود فریبی ہے بڑے کام کی چیز یہ خود فریبی ہی تو ہے۔ جو موت کے منہ میں بھی چکمہ دے کر زندگی کا سہارا بنی رہتی

ہے' پھانسی کی سزا پانے والوں کو یہ خود فریبی سہارا نہ دے تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ نہ رہ سکیں' لیکن ہوتا یہ ہے کہ تختہ دار پر لٹکنے سے چند لمحے پہلے بھی انہیں یہ آس رہتی ہے کہ شائد بچنے کی کوئی صورت نکل آئے لمبی میعاد کے قیدی جنہیں مستقبل کی بھیانک سپاٹ زندگی کا تصور بے برگ و گیاہ صحرا میں بھٹکنے کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ جنہیں صدیوں کی ڈسنے والی تنہائی اور گھٹی ہوئی زندگی کا تصور موت سے ہمکنار کرنے کو کافی ہوتا ہے۔ خود فریبی کا یہی طلسمی چراغ روشنی کا مینار بن کر آخر وقت تک ان کے جی کو لبھاتا رہتا ہے۔

ایسا بارہا ہوا ہے۔ ہمارے جیل کے دنوں میں ایک نوجوان قاتل کا قانونی عمل ختم ہو چکا تھا۔ اور اگلی صبح پھانسی ہونے والا تھا۔ کہ اچانک اس کی سزائے موت کو عدالت عالیہ نے اس کی رحم درخواست پر عمر قید میں بدل دیا اور وہ پھانسی سے بچ گیا اور ایسا بھی ہوا کہ عمر قید قیدی کی رحم درخواست کو عدالت نے پھانسی کی سزا میں بدل دیا اور وہ اگلے روز پھانسی کی کوٹھڑی میں پہنچ گیا۔

غلام محمد لوند خوڑ اور ہمیش گل کے مقدمات کی طرف قیدیوں کی آنکھیں لگی تھیں۔ ان کے مقدمہ کی پیروی ڈاکٹر عبدالرحیم اور محمود علی قصوری کر رہے تھے جرگہ کو غیر قانونی ثابت کرنے کے لئے ان کی جدوجہد جاری تھی' اس لئے قدرتی طور پر قیدیوں کی توقعات ان مقدمات سے وابستہ تھیں' قصوری پاکستان کی وہ واحد شخصیت ہیں جو جمہوری روایات اور عدلیہ کے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے گزشتہ کئی برس سے بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں' ڈاکٹر عبدالرحیم کو سرحد کا قصوری کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ جو جری' حوصلہ مند اور بے باک انسان ہیں' شہری آزادی کے تحفظ اور جمہوری اقدار کو بچانے کے لئے انہوں نے حزب مخالف کے رہنماؤں کے مقدمات کی بے غرض اور مخلصانہ پیروی کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اور اس سلسلہ میں انہیں بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔

ایف سی آر کے منسوخ ہونے کے انتظار میں بیشتر قیدی زندگی کے دن گزار رہے ہیں' وہ روزانہ آکر نہایت رازدارانہ طور پر پوچھتے' سنا ہے' ایف سی آر منسوخ ہو جائے گا۔ پھر وہ لوند خوڑ اور ہمیش گل کے مقدمات کی تفصیل دریافت کرتے' ڈاکٹر عبدالرحیم اور قصوری کا ایک ایک نقطہ انہیں یاد تھا اور وہ ہر وقت ان کی جرات مندی کے قصیدے گاتے رہتے۔

کچھ قیدی جو قتل کے مقدمات میں عمر قید بھگت رہے تھے ملنے آئے اور بولے خدا اس ظالم حکومت سے جلد نجات دلائے' اور آپ لوگوں کا عہد آئے تا کہ ہم بھی اس جہنم سے نکلیں۔ میں نے مسکرا کر کہا' بھئی یہ دعا نہ مانگو ہمارا عہد آجائے تو قانون کے لئے تختہ دار کے سوا اور کہیں بھی کوئی جگہ نہ ہو گی۔

میاں محمد شاہ خیال جنہیں پچھلے دنوں غیر ملکی ایجنٹ ہونے کے الزام میں گرفتار کیا گیا' اور اب تک سی کلاس میں تھے' اب ان کے لئے بی کلاس کی منظوری آگئی اور ہمارے کمرے میں منتقل کر دیئے گئے۔ میاں صاحب افغانستان کے شہری ہیں یہاں عارضی طور پر مقیم تھے' انہیں پاکستان کی شہریت قبول کرنے میں تامل تھا۔ تند و تیز باتیں کرتے۔ اور ہمیشہ گفتگو کے شروع میں کہتے' میں افغانستان کا شہری تھا' شہری ہوں اور شہری رہوں گا" میاں صاحب پشتو کے ادیب و شاعر ہیں مشہور کاکا خیل قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں' بڑے خوش مذاق اور زندہ دل انسان ہیں' انگریزی' جرمنی' فرانسیسی کے دلدادہ ہیں اور اس بات کے شاکی ہیں۔ کہ خدا نے انہیں مغرب کی بجائے مشرق میں کیوں پیدا کیا' پشتو زبان اور پشتون قوم کے فدائی ہیں لیکن کبھی کبھی اس کی مذمت بھی کرنے لگتے ہیں غرض یہ کہ کسی معاملہ میں سنجیدہ نہیں معلوم ہوتے۔

24 اکتوبر کی رات کو اطلاع آئی کہ مجلس دستور ساز اور پارلیمنٹ توڑ دی گئی ہیں۔ جس انتشار کی خبریں مرکز سے آ رہی تھیں - اس کے پیش نظر یہ کوئی

غیر متوقع بات نہیں تھی صبح معلوم ہوا۔ کہ 55 منٹ بعد نئی وزارت بنالی گئی جس میں میجر جنرل سکندر مرزا بھی شامل ہیں۔ ہم سارا دن تازہ واقعات پر تبصرہ کرتے رہے لیکن انتہائی سوچ وچار کے بعد بھی کوئی روشن پہلو نظر نہ آیا۔

26اکتوبر کو لوند خوڑ اور افضل کی تاریخ تھی' دونوں کوایک ہتھکڑی لگاکر ہائیکورٹ لے گئے تھوڑی دیر بعد' افضل نے آکر بتایا کہ لوند خوڑ کی سات برس قید معاف ہو گئی ہے اور ساڑھے پانچ ہزار روپے جرمانہ وصول کرکے اسے رہاکر دیا گیا ہے' لوند خوڑ کی رہائی کی خبر بڑی دل خوش کن تھی' لیکن اس کے جانے سے سب اداس ہو گئے اس کے دم سے یہاں بڑی رونق اور چہل پہل تھی ادھر ہمیش گل کو بھی عدالت نے رہاکر دیا' میں نے کہا معاملہ خطرناک معلوم ہوتا ہے یہی عالم رہاتو یہ کم بخت ہم سب کونکال باہر کریں گے۔

چند دنوں بعد ڈاکٹر خان صاحب کو مرکزی کابینہ میں لے لیا گیا۔ پھر سہروردی بھی وزیر قانون مقرر ہو گئے۔ اس خوشگوار تبدیلی سے سیاسی قیدیوں کے بجھے بجھے چہرے چمک اٹھے۔ اوروہ پھر سے امیدوں کے سنہرے روپہلے محل تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔

جب سے عوامی لیگ کے رہنما رہا ہوئے۔ گجر خان کو روزانہ اطلاع آتی کہ کل اس کی رہائی عمل میں آجائے گی۔ لیکن وہ کل نہیں آتی تھی۔ غریب چشم براہ بیٹھا تھا قید سے گھبرانے والا نہ تھا لیکن امید بیم کے اس ماحول نے اسے سخت چڑچڑا بنا دیا تھا۔

ایک شخص بولا عوامی لیگ والے سب کے سب چلے گئے لیکن معلوم ہوتا ہے آپ لوگوں کا دانا پانی ابھی تک جیل میں باقی ہے۔ افضل بولا ان جیل والوں سے کہنا چاہیئے ہمارے حصے کا سارا دانا پانی ایک ساتھ ہی دے ڈالیں تاکہ ہم اسے ختم کرنے کی کوشش کریں' میں نے کہا دوست یہ امریکی غلہ ہے اتنی آسانی سے

ایف سی آر کے منسوخ ہونے کے انتظار میں بیشتر قیدی زندگی کے دن گزار رہے ہیں' وہ روزانہ آکر نہایت رازدارانہ طور پر پوچھتے' سنا ہے' ایف سی آر منسوخ ہو جائے گا۔ پھر وہ لوند خوڑ اور ہمیش گل کے مقدمات کی تفصیل دریافت کرتے' ڈاکٹر عبدالرحیم اور قصوری کا ایک ایک نقطہ انہیں یاد تھا اور وہ ہر وقت ان کی جرات مندی کے قصیدے گاتے رہتے۔

کچھ قیدی جو قتل کے مقدمات میں عمر قید بھگت رہے تھے ملنے آئے اور بولے خدا اس ظالم حکومت سے جلد نجات دلائے' اور آپ لوگوں کا عہد آئے تا کہ ہم بھی اس جہنم سے نکلیں۔ میں نے مسکرا کر کہا' بھئی یہ دعا نہ مانگو ہمارا عہد آجائے تو قانون کے لئے تختہ دار کے سوا اور کہیں بھی کوئی جگہ نہ ہو گی۔

میاں محمد شاہ خیال جنہیں پچھلے دنوں غیر ملکی ایجنٹ ہونے کے الزام میں گرفتار کیا گیا' اور اب تک سی کلاس میں تھے' اب ان کے لئے بی کلاس کی منظوری آگئی اور ہمارے کمرے میں منتقل کر دیئے گئے۔ میاں صاحب افغانستان کے شہری ہیں یہاں عارضی طور پر مقیم تھے' انہیں پاکستان کی شہریت قبول کرنے میں تامل تھا۔ تند و تیز باتیں کرتے۔ اور ہمیشہ گفتگو کے شروع میں کہتے' میں افغانستان کا شہری تھا' شہری ہوں اور شہری رہوں گا" میاں صاحب پشتو کے ادیب و شاعر ہیں مشہور کاکا خیل قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں' بڑے خوش مذاق اور زندہ دل انسان ہیں' انگریزی' جرمنی' فرانسیسی کے دلدادہ ہیں اور اس بات کے شاکی ہیں۔ کہ خدا نے انہیں مغرب کی بجائے مشرق میں کیوں پیدا کیا' پشتو زبان اور پشتون قوم کے فدائی ہیں لیکن کبھی کبھی اس کی مذمت بھی کرنے لگتے ہیں غرض یہ کہ کسی معاملہ میں سنجیدہ نہیں معلوم ہوتے۔

24 اکتوبر کی رات کو اطلاع آئی کہ مجلس دستور ساز اور پارلیمنٹ توڑ دی گئی ہیں۔ جس انتشار کی خبریں مرکز سے آ رہی تھیں - اس کے پیش نظر یہ کوئی

غیر متوقع بات نہیں تھی صبح معلوم ہوا۔ کہ 55 منٹ بعد نئی وزارت بنالی گئی جس میں میجر جنرل سکندر مرزا بھی شامل ہیں۔ ہم سارا دن تازہ واقعات پر تبصرہ کرتے رہے لیکن انتہائی سوچ وچار کے بعد بھی کوئی روشن پہلو نظر نہ آیا۔

26اکتوبر کو لوند خوڑ اور افضل کی تاریخ تھی' دونوں کوایک ہتھکڑی لگا کر ہائیکورٹ لے گئے تھوڑی دیر بعد' افضل نے آکر بتایا کہ لوند خوڑ کی سات برس قید معاف ہو گئی ہے اور ساڑھے پانچ ہزار روپے جرمانہ وصول کر کے اسے رہا کر دیا گیا ہے' لوند خوڑ کی رہائی کی خبر بڑی دل خوش کن تھی' لیکن اس کے جانے سے سب اداس ہو گئے اس کے دم سے یہاں بڑی رونق اور چہل پہل تھی ادھر ہمیش گل کو بھی عدالت نے رہا کر دیا' میں نے کہا معاملہ خطرناک معلوم ہوتا ہے یہی عالم رہا تو یہ کم بخت ہم سب کو نکال باہر کریں گے۔

چند دنوں بعد ڈاکٹر خان صاحب کو مرکزی کابینہ میں لے لیا گیا۔ پھر سہروردی بھی وزیر قانون مقرر ہو گئے۔ اس خوشگوار تبدیلی سے سیاسی قیدیوں کے بجھے بجھے چہرے چمک اٹھے۔ اور وہ پھر سے امیدوں کے سنہرے روپہلے محل تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔

جب سے عوامی لیگ کے رہنما رہا ہوئے۔ گجر خان کو روزانہ اطلاع آتی کہ کل اس کی رہائی عمل میں آجائے گی۔ لیکن وہ کل نہیں آتی تھی۔ غریب چشم براہ بیٹھا تھا قید سے گھبرانے والا نہ تھا لیکن امید بیم کے اس ماحول نے اسے سخت چڑچڑا بنا دیا تھا۔

ایک شخص بولا عوامی لیگ والے سب کے سب چلے گئے لیکن معلوم ہوتا ہے آپ لوگوں کا دانا پانی ابھی تک جیل میں باقی ہے۔ افضل بولا ان جیل والوں سے کہنا چاہیے ہمارے حصے کا سارا دانا پانی ایک ساتھ ہی دے ڈالیں تاکہ ہم اسے ختم کرنے کی کوشش کریں' میں نے کہا دوست یہ امریکی غلہ ہے اتنی آسانی سے

بھی ختم نہیں ہونے کا اور ہضم بھی نہیں ہونے کا

25 نومبر میری حبس بے جا کارپس کی پہلی تاریخ تھی' جیل کی آہنی پھاٹک جو صرف رہٹ کے بھینسے یا جیل کے ملازمین کے لئے کھلتا ہے آج پہلی دفعہ مجھے اس پھاٹک سے باہر نکلنے کا اتفاق ہوا نو بجے ہتھکڑی لگا کر عدالت لے گئے' ساڑھے چار مہینے بعد باہر کی دنیا دیکھی ہر چیز اجنبی معلوم ہو رہی تھی' یوں معلوم ہوتا جیسے جنگل سے شہر میں آ گیا ہوں ایک عرصہ کے بعد رضا بھائی کی صورت دیکھی' خوب بچھڑ بچھڑ کر ملے ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے بھائی بھتیجے یار دوست موجود تھے' ایک بجے تک اگلی پچھلی باتیں ہوتی رہیں' ڈیڑھ بجے جوڈیشنل کمشنر کے سامنے پیشی ہوئی' ڈاکٹر عبدالرحیم ارباب سکندر خان میری پیروی کر رہے تھے۔ تاریخ پکی ہو گئی۔ باہر نکلے تو سب مبارکباد دینے لگے رضا بھائی اور دوسرے دوست جیل کے دروازے تک آ کر چلے گئے اندر آیا تو سب گرد ہو گئے۔ دیر تک باہر کی دنیا کے حالات سناتا رہا وہ مزے لے لے کر سنتے رہے۔

ہمیں جو قیدی خدمت کے لئے ملے تھے ان میں لالی بڑا اچھا لڑکا تھا وہ افیون کے مقدمہ میں ایک سال قید کاٹ رہا تھا افیون اس کے مالک کی تھی وہ ملازم تھا اس سے پہلے اس اس نے کئی پھیرے کئے جس میں مالک نے ہزاروں روپے کمائے لالی کو بیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی رہی' اس دفعہ مال پکڑا گیا۔ یہ بیچارا قید ہو گیا مالک کو کسی نے پوچھا تک نہیں اس نے بیس روپے ماہوار پر ایک اور لالی ملازم رکھ لیا' چرس افیون کے چالان اسی طرح جاری تھے دھن برس رہا تھا۔ یہ لالی بھی پکڑا جائے گا تو وہ دوسرا لالی رکھ لے گا۔ چالان جاتے رہیں گے۔ پیسہ آتا رہے گا' تجوریاں بھرتی رہیں گی۔ خان بڑا زمیندار اور بہت بڑا زمیندار بنتا جائے گا۔ خان کے پاس پیسے کی کمی نہیں' ملک میں بیس روپے ماہوار کے لالیوں کی کمی نہیں۔ ہمارا باورچی نورا بھی چوری کے الزام میں ماخوذ تھا وہ چرسی تھا اور چرچرا افیون چرس

دونوں شغل کرتا تھا' بڑا چاق و چوبند مگر فتنہ پرداز زرین اپنی قید کا ڈیڑھ برس گزار چکا تھا' چند دنوں تک رہائی ہونے والی تھی' وہ لڑائی جھگڑے میں آیا' لمبا اونچا سیاہ فام پختون تھا وہ یہاں بھی لڑائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔

ہم پہلے پہل آئے تو ایک کابلی بلی کبھی کبھی ہمارے کمرے میں آتی' پھر افضل سے اس کی دوستی پکی ہو گئی۔ اس کا پیٹ پھولا ہوا تھا۔ اور وہ بڑی مشکل سے چلتی پھرتی تھی۔ افضل کو اس سے بڑی ہمدردی تھی۔ وہ اس کی خوراک اور آرام کا بڑا خیال رکھتا۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ تھا۔ جسے خاص دوست ہی سمجھ سکتے تھے' پھر وہ بلی غائب ہو گئی۔ اور چند دنوں بعد آئی تو ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔ معلوم ہوا اس نے چار بچے دیئے ہیں۔ انہی دنوں افضل کے گھر سے اطلاع آئی کہ اسکے ہاں بچی ہوئی ہے۔ وہ خوش تھا بہت خوش اس کے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر چکا تھا' دن گزرتے گئے بلی سے اس کی رغبت کم ہوتی گئی' پھر ایک دن وہ بلی کے ایک بچے کو پکڑ لایا' وہ بڑا پیارا بچہ تھا۔ جیل کے سب قیدی اس سے والہانہ پیار کرتے تھے' افضل سے وہ بہت جلد مانوس ہو گیا' ہر وقت اس کے ساتھ چپکا رہتا یہاں تک کہ رات کو اس کے پاس ہی سوتا۔ اسے سب بڈھا کہہ کر پکارتے نام بڑا بے ڈھب تھا۔ ہم نے بدلنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی' بی کلاس میں رہ کر بڈھا کی عادتیں بڑی خراب ہو گئیں۔ وہ کرسیوں پر بیٹھتا' بستر میں سوتا اور دودھ کے سوا اور کچھ نہ کھاتا ہم نے سوچا ایک درخواست دیں کہ ہمیں بڈھے کا راشن بھی ملنا چاہیئے پھر فیصلہ کیا' اسکی ہابیا کارپس درخواست دی جائے' اور وہ درخواست میں نے لکھی بھی لیکن سپرنٹنڈنٹ آگے بھیجنے کو تیار نہ تھے۔

میاں محمد شاہ صاحب بلیوں کے بڑے رسیا نکلے ان کے آتے ہی ہمارے کمرے میں بلیوں کا ہجوم رہنے لگا۔ کھانے کے وقت تو سارے جیل کی بلیاں وہاں جمع ہو جاتیں' ان میں بعض بڑی خوب صورت بلیاں تھیں' بعض بدصورت ایک

بلی کے رنگ مور کی طرح جاذب نظر تھے لیکن اس کی آواز بڑی بھدی اور باریک تھی ایک جوڑا کابلی بلیوں کا تھا زرد دھاریوں والی موٹی تازی ایک بلی یک چشم بھورے رنگ کی بڑی کریہہ المنظر تھی' اس بلی سے مجھے بڑی نفرت تھی وہ بڑی ڈھیٹ واقع ہوئی تھی بار بار مار کر نکالو پھر دیکھو تو حاضر آخر میں تو اس نے کاکاجی کی چارپائی کے نیچے مستقل طور پر ڈیرے ڈال دیئے ایک اور سیاہ رنگ کی بلی بھی مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ دو بھورے رنگ کی دھاریوں والی بلیاں جو ماں بیٹی معلوم ہوتی تھیں کچھ دنوں سے آنے لگیں' ان میں سے چھوٹی بلی یعنی بیٹی ہمارے بڈھا سے ایسی مانوس ہوئی کہ دونوں ایک ساتھ رہنے سہنے لگے' وہ سارا دن کھیلتے کودتے اور رات کو میاں صاحب کے بستر میں گھس جاتے' آخر میں وہیں رومان لڑانے لگے۔

میں نے اپنے خطوط میں بچوں کو بڈھے کے حالات لکھنے شروع کئے بچے ان حالات کو بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ وہ مصر تھے کہ گھر آتے وقت بڈھے کو ساتھ لاؤں میرا بھی یہی ارادہ تھا۔ لیکن رہائی کے وقت مجھے بڈھا بالکل ہی بھول گیا' انسان بھی کتنا ہی خود غرض ہوتا ہے۔

2 ستمبر کو افضل کی پیشی تھی۔ وہ گیا واپس نہ آیا بعد میں خبر آئی کہ رہا ہو گیا' ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ دن بڑا عجیب تھا۔ عصر کے وقت اچانک میاں محمد شاہ خیال کو سی آئی ڈی والے آکر تفتیش کی غرض سے لے گئے' ہمارے کمرے سے دو آدمی کم ہو گئے ادھر نگار اینڈ برادرز کے مقدمے کا آج فیصلہ ہونا تھا' اس کے لئے ہم بڑی تشویش میں تھے ۔ آخر معلوم ہوا کہ ان کا مقدمہ جرگہ کے سپرد کر دیا گیا ہے اور وہ بھی ضمانت پر رہا ہو گئے ہیں گویا ہم بالکل لنڈورے رہ گئے کمرہ کاٹے کھاتا تھا افضل کا سامان باندھ رکھا۔ لیکن ایک ہفتے تک کوئی لینے نہ

آیا دراصل اسے اپنی دوبارہ گرفتاری کا کھٹکا لگا تھا۔

انہی دنوں ارباب نوراکبر خان کی رہائی کا پروانہ آگیا وہ قتل کے مقدمہ میں چودہ سال قید تھا۔ ارباب صاحب کی رہائی نہایت پراسرار طور سے میڈیکل گراؤنڈ پر عمل میں آئی ان کا کہنا تھا کہ انہیں ایک سال کی پیرول پر چھوڑا گیا ہے' لیکن لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے چچا زاد بھائی ارباب آصف خان ایم ایل اے نے سیاسی قیدیوں کو رہا کرانے کی بجائے حکومت سے سودا بازی کر کے اپنے رشتہ دار کو رہا کرا لیا ہے۔

پھر ایک دن مولانا فضل معبود سیفٹی ایکٹ میں ایک سال کی نظر بندی لے کر آگئے وہ جماعت اسلامی کے رہنما ہیں انہیں سی کلاس میں رکھا گیا خوشحال کاکا ان سے گھنٹوں بحثتے' مولانا بڑے سنجیدہ اور معقول انسان ہیں لیکن اپنی جماعت کے متعلق ان کے خیالات سن کر یوں محسوس ہوا جیسے جماعت اسلامی کوئی تحریک نہیں بلکہ ایک نیا اسلامی فرقہ ہے اخبارات کا مطالعہ کرتے وقت جماعت اسلامی کی خبروں پر نمایاں نشان لگا دیتے بعض اوقات لوگوں کو ان کی یہ حرکت ناگوار گزرتی تھی مجھے ان نشانات کے پردے میں یہ سرخی نظر آتی' ان خبروں کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔

غلام محمد گاما ایک عرصہ کے بعد ڈیرہ جیل سے پشاور آیا' اس کی حبس بے جا کی 20 دسمبر تاریخ تھی' اس لئے اسے یہاں لایا گیا اسکے آتے ہی جیل والوں کے دلوں کی دھڑکنیں رکنے لگیں' وہ حسب سابق چکر میں لائبریری کے پاس کھڑا ہو جاتا اور جیل کے سٹاف میں سے ہر آنے جانے والے پر آوازے کستا' سب اس سے ڈرتے تھے حتیٰ کہ سپرنٹنڈنٹ بہادر اور داروغہ بہادر بھی اس کی خوشامد کرتے تا کہ اس کی تنقید سے بچے رہیں لیکن وہ کسی کو بھی معاف نہیں کرتا تھا۔ وہ صوبہ سرحد کے مختلف جیلوں میں عمر کا ایک بہت بڑا حصہ گزار چکا تھا۔ اس لئے اندرون

خانہ کی تمام باتوں کا اسے علم تھا۔ اس نے بتایا کہ جیل کے بڑے بڑے افسروں کے گھر کے لئے فرنیچر جیل سے تیار ہو کر جاتا ہے۔ کپڑے یہاں دھلتے ہیں۔ بچوں سے لے کر بڑوں تک کا لباس یہاں سلتا ہے لکڑی' کوئلہ' دانا پانی' سب یہاں سے جاتا ہے۔ غلہ باہر سے آتا ہے تو ان کے حصے کی بوریاں باہر ہی اتار دی جاتی ہیں' اور ان کی جگہ خالی بوریاں رکھ دی جاتی ہیں اس کمی کو آٹے میں پیسے ہوئے پتھر ملا کر پورا کیا جاتا ہے' اس نے بتایا کہ فیکٹری اور غلہ گودام سے حکام جیل کو ہزاروں کی آمدنی ہے جو خورد برد جیل کے محکمہ میں ہوتی ہے حکومت کے اور کسی محکمہ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

گما پیشی پر عدالت جانے لگا تو عجیب کارٹون بنا ہوا تھا' اس نے جیل کے کپڑے پہن رکھے تھے گھٹنوں تک پاجامہ اور قمیض اتنی چھوٹی جیسے بچوں کی ہو' جیل کے کپڑے ایک ہی سائز کے سلے ہوئے ہوتے ہیں جو پستہ قد قیدیوں کو تو پورے آجاتے ہیں۔ لیکن ذرا لمبے قد کا شخص یہ کپڑے پہن لے تو اس کی صورت عجیب مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ گامے نے اپنے پاؤں میں بیڑیاں خود ہی لگوا دی تھیں ڈیوڑھی میں ہتھکڑیاں پہنانے لگے' تو وہ جھگڑنے لگا کہ مجھے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی لگاؤ سپرنٹنڈنٹ اور داروغہ اسکی بیڑیاں کٹوانا چاہتے تھے۔ اسنے کہا جب مجھے ڈیرے جیل لایا جا رہا تھا اس وقت بیماری کے باوجود مجھے بیڑیاں لگائی گئیں اور سیاسی قیدیوں کے احتجاج کی پرواہ نہ کی گئی' کیونکہ بقول آپ کے آپ جیل کے قوانین سے مجبور تھے تو کیا اب یہ قوانین بدل گئے ہیں۔ اس وقت عجیب منظر تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اور داروغہ گامے کی منتیں کر رہے تھے۔ آخر بڑی مشکل سے اس نے بیڑیاں کٹوائیں' عدالت میں جا کر پیش ہوا اس کا کوئی وکیل نہ تھا خود ہی اپنا مقدمہ پیش کیا۔ اور خود ہی بحث کرنے لگا ایڈووکیٹ جنرل نے عدالت کو یقین دلایا کہ

حکومت ہفتہ عشرہ تک اسے رہا کر رہی ہے۔ اس لئے ہیبس کارپس کی کاروائی روک دی جائے عدالت نے درخواست فائل کر دی اور گامے کو بتایا' کہ حکومت اس کا مقدمہ واپس لے رہی ہے گامے نے کہا حکومت نے رہا کرنا ہوتا تو گرفتار ہی کیوں کرتی' مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ ایسا کرے گی عدالت نے کہا کہ اگر حکومت نے ایسا نہ کیا تو تم دوسری درخواست دے دینا' عدالت اس پر کاروائی کرے گی گامے کی درخواست فائل کر دی گئی اور واپس جیل بھیج دیا گیا۔ ہفتہ پندرہ دن' بیس دن' مہینہ گزر گیا لیکن حکومت نے مقدمہ واپس نہ لیا اور اس کی رہائی کا پروانہ نہ آیا اور جب 15 فروری کو گجر خان کی رہائی کی خبر آئی اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ سہروردی نے کابینہ میں شامل ہوتے ہی ٹیلی فون پر اس کی رہائی کی اطلاع بھجوائی ہے تو گامے کو بڑا شاق ہوا۔ اس کا خیال تھا ڈاکٹر خان صاحب کے مرکزی کابینہ میں شامل ہوتے ہی اس کی رہائی یقینی ہے اور وہ کئی دنوں تک اس کا انتظار کرتا رہا لیکن اس کا خیال غلط نکلا اور آخر پھر اس کا چالان ڈیرہ جیل بھیج دیا گیا۔

6 جنوری میری دوسری تاریخ تھی باہر نکلا تو رضا کو منتظر پایا اسکی صحت اتنی گر چکی تھی کہ پہچانا نہ گیا۔ معلوم ہوا کہ اس پر دو دفعہ درد قولنج کے شدید دورے پڑ چکے ہیں' یہ چیز میرے لئے بڑی تکلیف دہ تھی' لیکن کر بھی کیا سکتا تھا رضا کا روگ مجھے معلوم تھا۔ میری قید و بند کا غم ہی اسکی بیماری کا حقیقی باعث تھا اور اس کا مداوا ہم دونوں کے بس میں نہیں تھا۔ عدالت میں پیر صاحب مانکی شریف غلام محمد خان لوند خوڑ' ماسٹر خان گل' تاتاری' عبدالودود خان قمر' ضیا جعفری' اور مجید شاہد کے علاوہ اور بہت سے احباب موجود تھے' مقدمہ بغیر کسی کاروائی کے آئندہ پیشی پر ملتوی ہو گیا۔

سردی کی اب وہ پہلی سی شدت نہ رہی لیکن بارش نہ ہونے سے موسم خشک اور غیر صحت مند تھا کھانسی زکام میں ہم سب مبتلا تھے۔ زندگی بے معنی سی

کٹ رہی تھی جی ایسا اچاٹ ہوا کہ کسی کام میں دل نہ لگتا ایک دن دو پھانسی والوں کی رہائی کا حکم آیا ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا دوسرے قیدی انہیں حسرت سے دیکھ رہے تھے 17 جنوری کو منٹو کے مرنے کی خبر پڑھ کر بڑا شاق ہوا میں نے اس کی بیوی کو تعزیت کا خط لکھا۔ اور کئی دنوں تک ادب کے اس جیالے افسانہ نگار کے غم میں مبتلا رہا۔

3 فروری میری آخری پیشی تھی' ڈاکٹر عبدالرحیم' ارباب سکندر خان اور محمد افضل خان وکیل پیروی کر رہے تھے۔ ایڈووکیٹ جنرل نے کہا' حکومت نے محمد افضل خان کی رہائی کے خلاف فیڈرل کورٹ میں اپیل کر رکھی ہے چونکہ یہ مقدمہ بھی اسی نوعیت کا ہے اس لئے فیڈرل کورٹ کے فیصلہ تک اس کی کاروائی ملتوی کر دی جائے' عدالت نے منظور کر لیا اور میرے وکیل کی درخواست پر مجھے دس ہزار روپے کی ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا' سرکاری وکیل نے اعتراض کیا کہ یہ ملزم خطرناک ہے۔ اس کا باہر رہنا خطرے سے خالی نہیں' عدالت نے اس خطرے سے بچنے کے لئے مجھے میونسپل حدود میں پابند کر دیا۔ تاریخ پر لاہور سے ملک مبارک علی اور شیخ عبدالسلام صاحب مالکان گوشہ ادب آئے ہوئے تھے۔ مقامی دوستوں میں سے تقریباً" سبھی دوست تھے - ضمانت کے متعلق معلوم ہوا دو تین دن سے پہلے نہ ہو سکے گی میں واپس جیل چلا گیا۔ وہاں جا کر خبر سنائی' سب خوش بھی ہوئے اور اداس بھی' نگار نے کہا بھئی میں منافقت نہیں کرتا' مجھے دکھ ہوا ہے۔ تمہارے ساتھ وقت اچھا گزر رہا تھا۔ اب قید کاٹنا عذاب ہو جائے گا۔ یہ خبر آناً" فاناً" ساری جیل میں پھیل گئی تمام قیدی ملنے کے لئے آئے اچانک تین بجے اطلاع آئی کہ ضمانت ہو گئی ہے' ملنے ملانے میں پانچ بج گئے' ڈیوڑھی سے نکلا باہر احباب کا جمگھٹا لگا تھا۔ تانگے میں بیٹھ کر گھر پہنچا اور ساڑھے آٹھ ماہ بعد بچوں کو دیکھا۔

جیل سے آنے کے بعد پابندی کا سلسلہ قید سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔

قیام لندن

ویسے تو اختصار کی خاطر میں اپنی سوانح عمری میں اپنے بیرون ملک سفر نہیں لکھتا - لیکن سیاحت کے اس جنون میں انڈیا، روس، لندن، ڈنمارک، جرمنی، سوئٹزر لینڈ، فرانس، سویڈن، بنگال، امریکہ، برما تھائی لینڈ کے سفر کر چکا ہوں - میں شہر شہر پھرا - ہر ملک کی ثقافت دیکھی - دوستوں سے ملا - وہاں کے کلچر کا مشاہدہ کیا - زبانوں کی تاریخیں سنیں - لوگ گیت سنے - تاریخی مقامات دیکھے - ہر شہر میں دوستوں نے تقریبات منعقد کیں - مشاعرے ہوئے - غرض اس طرح میں نے معلومات سے اپنا ذہن بھرا کہ اس پر کئی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں - ایک آفاقی نظریہ رکھتے ہوئے ویسے بھی میرا ایمان ہے کہ

ہر ملک ملک ماست   کہ ملک خدا ماست

لیکن جو بات مجھے لندن میں دکھائی دی وہ کہیں نظر نہ آسکی - لندن سے مجھے محبت ہو گئی - اس لئے جلا وطنی کے دن میں نے وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا

لندن میں میرا قیام "شیفرڈ بش" میں رہا - جب میں نے دوستوں کو جتایا کہ مجھے کچھ عرصہ یہاں رہنا ہے تو انہوں نے یہ جگہ تجویز کی اس لئے کہ زیادہ تر پاکستانی دوست اسی علاقے میں رہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کے قریب رہوں تاکہ وہ میری دیکھ بھال کر سکیں - ویسے مجھے شیفرڈ بش نام بھی بہت اچھا لگا کہ اس سے بھی ایک پر سکون جگہ کا تصور آتا تھا - حالانکہ ایسا نہ تھا یہ ایک ہندوستانی لینڈ لارڈ کی بلڈنگ تھی - جس میں ایک فلیٹ (جو ایک ڈرائنگ روم، بیڈ روم، کچن اور باتھ روم) پر مشتمل تھا - جو میری ضروریات

کے لئے کافی تھا - دوسرے کرایہ دار بھی ہندوستانی' پاکستانی تھے - لیکن وہاں یہ بات بہت اچھی ہے کہ کوئی کسی سے غرض نہیں رکھتا - انگریزوں سے ایک بات ہمارے لوگوں نے سیکھی ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو - بہت دنوں کے بعد پتہ چلا کہ نیچے ایک پاکستانی بیوہ ریحانہ رہتی ہے - جو دن کو ایک پاکستانی سٹور میں کام کرتی ہے اور رات کو سینما میں گیٹ کیپر کی جاب کرتی ہے - پھر وہ ایک شام کو خط لکھوانے اوپر آگئی مجھے حیرت ہوئی کہ میرے متعلق وہ سب کچھ جانتی تھی - غالباً" اسے مالک مکان مسٹر ملہوترا نے بتایا ہوگا - کچھ دنوں بعد میں بھی مالک مکان کی وساطت سے ریحانہ کے متعلق سب کچھ جان گیا - اس کی تین چھوٹی چھوٹی بچیاں تھیں - پاکستان میں جن کے لئے صبح سے شام تک وہ تگ و دو کرکے پیسے بھیجتی تھی - مہینے میں دو بار خطوط کی وساطت سے وہ آتی اور دکھ سکھ کرکے چلی جاتی یا کبھی اس کے مہمان آتے تو برتن لینے آجاتی - کبھی مجھے مہمانوں کی دعوت کرنی ہوتی تو اسے سودا سلف لا دیتا اور وہ بیچاری پکا دیتی - وہ بڑی اچھی لگ رہی تھی - میرا بڑا احترام کرتی اور جب تک وہاں رہا اس نے میری بہت خدمت کی -

اب لندن آکر مجھے ترقی پسند شاعروں' ادیبوں کی جستجو ہوئی تو دو افراد کی نشاندہی کی گئی - بخش لائل پوری اور عاشور کاظمی - دونوں سے ملا اور یوں لگا جیسے جنم جنم کا ساتھ رہا ہو - یعنی پہلی ملاقات ہی میں کوئی اجنبیت کوئی غیریت ندارو - جیسے قربت بڑھی اور انہیں سمجھنے کا موقع ملا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دونوں حضرات کے مزاج عادات اور چال چلن میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے - بخش تیغ برہنہ' رند مشرب منہ پھٹ جبکہ عاشور کاظمی نہایت حلیم' خوش باش اور بظاہر بالکل اللہ میاں کی گائے - شراب کو کبھی منہ نہ لگایا ہاں کبھی کبھی دوستوں کو پلانے کے بہانے پب لے جاتے تو وہاں کی فضا میں رچی بسی ام الخبائث کی

خوشبو سے سرشار ہو کر آ جاتے - اسی طرح دوستوں کی ناؤ و نوش کی محفلوں میں پہلے کوک یا جوس کا گلاس سامنے رکھ کر بیٹھے ہوئے بالکل یتیموں کی طرح قابل رحم لگتے لیکن جلد ہی بوئے مئے اپنا معجزہ دکھاتی اور وہ ہم سے زیادہ چہکنے لگتے - منکسر المزاج اور خلیق ایسے کہ سر کے دشمن سے بھی آمنا سامنا ہو جائے تو تعریف کرنے لگتے - بچھے جائیں اور یوں ہاتھوں ہاتھ لے رہے ہوتے کہ جب تک اس کم بخت کی سات پشتیں ان کی ممنون احسان نہ ہو جائیں اس کی خلاصی نہ ہوتی - حسن اخلاق کا یہ عالم کہ بعض مخالفین تو ان سے انہیں کے خلاف تباہ کن منصوبے بنانے میں مشورے لینے آتے اور یہ کار ثواب جان کر اتنی دیانت داری اور خلوص سے اتنی رہنمائی کرتے کہ وہ عش عش بلکہ غش غش ہو جاتے -

عاشور نے مذہبی اور ادبی جھمیلوں میں عمر گزار دی جن کا ذکر بڑے ارمانوں سے کرتے - لندن میں انیس گھنٹوں کا روزہ رکھتے - میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھ کر پیاس بجھاتے اور چٹکیوں میں رمضان کا مہینہ گزارتے ہیں - بزنس بھی بڑے خضوع و خشوع سے کرتے - خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ان کی آدھی زندگی تو ٹیلی فون پر کبھی جاپان، کبھی بھارت، کبھی افریقہ، کبھی فرانس باتیں کرتے گزر گئی - ان کی بیگم یعنی بھابھی ایک علیحدہ شخصیت تھی - بس ایک سیب کے دو ٹکڑے وہ پیار سے انہیں "جانان کہتیں - اس جوڑے کے ملاپ سے اس گھر کو جو سب سے قیمتی چیز میسر آئی وہ میاں بیوی کے ہنستے چہرے ہیں جو کسی باقاعدہ مینو میں اندراج کے بغیر مہمانوں کی ضیافت کا سہاگ بنے رہتے تھے -

عاشور کاظمی ادبی کارکن اور غضب کا منتظم تھا - بڑی بڑی ادبی اور مذہبی تقریبات کی کامیابی کے لئے ان کے نام کی ضمانت ہی کافی تھی - نظم و نثر میں اپنا

ثانی نہیں رکھتا۔ چودہ سو سالہ جشن امام حسین علیہ السلام کے سلسلے میں مولانا شبیہہ الحسن صاحب لکھنؤ سے تشریف لائے۔ عاشور کے گھر ان سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک باتیں ہوئیں۔ سبحان اللہ کیا باغ و بہار شخصیت تھے حسن بیان ایسا کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

انہی دنوں ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر قمر رئیس لندن وارد ہوئے ہم نے ان کے اعزاز میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے ایک استقبالیے کا اہتمام کیا جس کی صدارت کے لئے عاشور نے مولانا شبیہہ الحسن کا نام تجویز کیا۔ ہم نے اعتراض تو نہ کیا لیکن یہی دھڑکا رہا کہ مولانا اپنی فیلڈ کے مرد میدان تو ہیں لیکن "شعر و ادب قند دیگر است" نہ جانے کیا گل کھلائیں گے اور آپ سے کیا پردہ۔ یہ بھی خدشہ تھا کہ موصوف کہیں ادب پر بات کرتے کرتے مجلس پڑھنا نہ شروع کر دیں۔ لیکن جب مولانا صدارتی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو سبحان اللہ ساری محفل کو جیسے مسحور کر دیا۔ ایسی ٹکسالی زبان اور موقع محل کے مطابق اساتذہ کے بہترین اشعار سے سجی سجائی تقریر کی کہ حاضرین دنگ رہ گئے اور شعراء سے زیادہ مولانا صاحب اس ادبی محفل کو لوٹ کر لے گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ مولانا صاحب صرف مولانا ہی نہیں بلکہ لکھنؤ میں یونیورسٹی میں ہیڈ آف اردو ڈیپارٹمنٹ بھی ہیں اور کبھی ادبی جلسے کے لئے ان کی صدارت اس تقریب کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے۔

عاشور کے گھر اگر کوئی مہمان آجائے تو میاں بیوی نہال ہو جاتے۔ یوں اس کی آؤ بھگت میں ہلکان ہوتے نظر آتے۔ جیسے زندگی میں پہلی دفعہ کسی مہمان کی شکل دیکھی ہو۔ ایک دوسرے کو سرگوشی میں کہتے خیال رکھنا اسے

کوئی تکلیف نہ ہو ۔ جس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ " خیال رکھنا کہیں بھاگ نہ جائے " ۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ پٹھانوں کی ایک فرضی روایت کے مطابق گھر میں اس کا مقبرہ بنا لیں ۔ عاشور کا گھر ہمیشہ پاکستان اور بھارت سے آنے والے مہمانوں کی آخری آرام گاہ سمجھی جاتی ۔ یعنی جسے لندن وارد ہو کر اپنے دوستوں میں سے کسی کا سراغ نہ ملے وہ بے جھجک عاشور کے ہاں پناہ لے سکتا ۔

لندن میں ایک ادارہ " اردو مرکز " بھی تھا یہ ادارہ دو کمروں پر مشتمل تھا ۔ ایک میں مختصر سی لائبریری اور ریڈنگ روم اور دوسرے میں آفس تھا ۔ جس کا انچارج پاکستان ٹی وی کے کوئز پروگرام کا شہرت یافتہ افتخار عارف تھا ۔ یہ ادارہ الطاف گوہر کا تھا اور لندن میں اس ادارے کا دم اس لئے غنیمت تھا کہ پاکستان ہندوستان سے آنے والے نو وارد حضرات کو یہاں پہنچا کر جہاں کہیں جانا ہوتا وہ وہاں سے اس کے متعلق معلومات حاصل کر لیتا ۔ کہیں لوکل فون کرنی ہو تو وہ بھی ہو جاتی اور وقت گزاری کے لئے وہاں کتابیں اور اخبارات بھی میسر آجاتے ۔ اس ادارے کا محل وقوع بھی کچھ ایسا تھا کہ پکاڈلی میں واقع تھا جو لندن کا سنٹرل مقام تھا ۔

انڈیا آفس لائبریری

انڈیا آفس لائبریری کی روداد ایک دلچسپ کہانی ہے - انگریزوں میں علم و ادب سے شغف رکھنے والے حکام بھی تھے - جنہوں نے اس سرمائے کو تلف ہونے سے بچا کر محفوظ کیا اور ایسے ادب دشمن بھی جنہوں نے پیسہ بٹورنے کی خاطر ان گنجہائے گرانمایہ کو نیلامی پر چڑھا دیا - ادب و فن کی تاریخ میں ان حریص انگریز حکام کا یہ کارنامہ سیاہ حروف سے لکھا جائے گا - جن کے ہاتھوں انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ ادبی جواہر پاروں کو سرعام نیلامی کر کے ان کی بولی لگائی گئی یہ ایسا توہین آمیز کام تھا جس کی کالک انگریز قوم کے چہرے سے کبھی نہیں دھل سکے گی -

دہلی کے شاہی کتب خانے کے مخطوطات 1857ء میں دہلی کی فتح کے بعد انگریزی فوج کے قبضے میں آگئے - ایسٹ انڈیا کمپنی کو جب ان مخطوطات کی اطلاع ملی تو انہوں نے مال غنیمت کے محکمے کو احکام جاری کیے کہ مخطوطات کو نیلامی کے ذریعے فروخت کر دیا جائے چنانچہ مخطوطات کی نیلامی کا یہ سلسلہ اگست 1860ء تک جاری رہا بعد میں گورنر جنرل کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر ایڈین سٹون نے مال غنیمت کے محکمے کو نیلامی کا یہ سلسلہ ملتوی کرنے کا حکم دیا - ان مخطوطات میں سے نایاب قیمتی نسخوں کو حکومت برطانیہ کے لے چن لیا گیا اور باقی کو ایک گودام میں ڈال دیا گیا - جہاں بارش سے سو مخطوطات بالکل تباہ ہو گئے اور دو سو پچیس نسخوں کو خاصا نقصان پہنچا - 1867ء کے اوائل میں ان کو

اکتالیس بکسوں میں بند کر کے کلکتہ منتقل کر دیا گیا۔ تاکہ ان کو وہاں نیلام کر دیا جائے۔

فروری اور مارچ 1867ء کے گزٹ آف انڈیا میں ان مخطوطات کی نیلامی کے اشتہارلت چھپے۔ مثلاً" تیرہ مارچ کو جو نیلامی کی گئی اس میں گیارہ سو بیس مخطوطات فروخت کر دیئے گئے۔ یہ اشتہار انڈیا آفس لائبریری لندن کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔

انڈیا آفس لائبریری جب لندن میں بنائی گئی تو اس کو پہلا تحفہ جو ملا وہ مشہور انگریزی تاریخ دان " اورم " کا ذاتی کتب خانہ تھا۔ جسے وہ اپنی وصیت کے مطابق اس لائبریری کے لئے وقف کر گیا تھا۔ 1799ء میں جب سرنگا پٹم پر انگرزیوں کا قبضہ ہوا تو ٹیپو سلطان کا ذاتی کتب خانہ بھی انگریزوں کے ہاتھ آیا۔ جس میں ہزاروں مخطوطات تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دو ہزار قیمتی مخطوطات فورٹ ولیم کالج کلکتہ کو منتقل کر دیئے اس کتب خانے کے کچھ نادر مخطوطات انگلستان کے شاہی خاندان کی نذر کر دیئے گئے اور باقی انڈیا آفس لائبریری اور آکسفورڈ، کیمرج اور ڈبلن یونیورسٹیوں کے کتب خانوں کو پیش کر دیئے گئے۔

1806ء میں لارڈ ولزلے نے ٹیپو سلطان کے کتب خانے کے 197 مخطوطات انڈیا آفس لائبریری کو منتقل کر دیئے۔ آج دنیا بھر کے دانشور اس عظیم کتب خانے سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ میں لندن پہنچا تو دل چاہا اڑ کر پہلے اس لائبریری کا دیدار کروں۔ جیسے عاشق بٹالوی جو تیس سال سے لندن میں رہائش پذیر ہے اور انڈیا آفس لائبریری میں اپنے سبجیکٹ تاریخ ادب اور سیاست کی ساری کتابیں چاٹ چکا تھا اب تو یوں لگتا ہے گویا وہ بھی آثار قدیمہ کی کوئی پرانی کتاب ہے۔

انڈیا آفس لائبریری کے علاوہ یہاں قدم قدم پر لائبریریوں کا جال بچھا ہوا ہے - جیسے برٹش لائبریری، کیمرج لائبریری، آکسفورڈ لائبریری جنہیں ہم وہاں خوابوں میں دیکھا کرتے یا کتابوں میں پڑھا کرتے - سہولت ایسی کہ صرف پتہ لکھ کر بغیر فیس کے اور ضمانت کے کتاب لے آئیں - ان لائبریریوں میں آ کے ایسے دیوانوں سے ملا جن کے متعلق غالب نے کہا -

بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

جو ان لائبریریوں کے مجاور بن کر رہ گئے ہیں بلا مبالغہ صبح آکر لائبریری کھلوانا اور شام کو بند کرنا ان کا وظیفہ حیات تھا -

انڈیا آفس لائبریری کا تذکرہ شاید نامکمل رہے گا - جب تک اس کے اور ینٹ سیکشن کے منتظم سلیم صدیقی کا ذکر نہ کیا جائے جو اس تاریخی لائبریری کا صرف لائبریرین ہی نہیں - اچھا خاصا حافظ بھی تھا بلکہ وہ تو ان مسودات اور نادر مخطوطات پر کچھ اس اعتماد اور یقین سے بات کرتا ہے جیسے اس تاریخ و جغرافیہ کا چشم دید گواہ ہو - وہ نہ صرف اس لائبریری کی تاریخ کا بذات خود مصنف لگتا ہے بلکہ اس کے عظیم کتب خانے کے ایک ایک قلمی نسخے، اہم مسودے، قدیم نادر کتب اور نایاب قیمتی مخطوطات کے تمام تر حوالوں کا امین بھی تھا - اسے اس لائبریری سے لندن منتقل ہونے کے سال، مہینے اور تاریخ کا سارا حساب کتاب یاد تھا - بلکہ وہ اس ہلچل مچانے والے کرب سے بھی پوری طرح آگاہ تھا - جو اپنی جنم بھومی سے جدائی پر ایک ایک کتاب کے اندر طوفان کی طرح موجزن ہے -

سلیم صدیقی کو قدرت نے علم و فضل اور بے بہا تجربے کے ساتھ ساتھ ایسی صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے جن کے سبب وہ ہر نئے ملاقاتی کو اپنی غیر -

معمولی ذہانت اور ہمہ گیر معلومات کے ساتھ ساتھ اپنی محبوب شخصیت سے بھی مسحور کر دیتا - جو شخص بھی ایک دفعہ اس سے ملتا وہ اس کے حسن سلوک اور شرافت کو زندگی بھر نہ بھلا سکتا - مسکراہٹ تو جیسے اس کے ہونٹوں سے ایسی چپکی ہوئی تھی کہ اسے ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہیں کیا جا سکتا -

میرے وہاں پہنچتے ہی اس نے مجھے لائبریری کا ممبر بنا دیا جو میرے لئے ایک ایسا اعزاز تھا جس نے مجھے سرشار کر دیا اور پھر کوئے دلدار کی طرح ہم وہاں روز پھیرا لگانے لگے - سلیم بھائی کی رہنمائی بھی بڑے کام آئی کسی کتاب سے بعض طویل اقتباسات کا فوٹو سٹیٹ کرانے میں بعض نایاب کتب مطالعے کے ساتھ لے جانے اور بعض دوسرے معاملات میں بھی یعنی موضوع پر تحقیق کے سلسلے میں بھی ایک ایک کتاب تلاش کرنے کی بجائے جب بھی اس سے رجوع کیا اس نے فوراً" کتابوں کی پوری فہرست لکھوا دی صرف یہی نہیں بلکہ کتابیں بھی نکال کر حوالے کر دیں در حقیقت اس لائبریری کے اوور سینٹ سیکشن میں سلیم جیسے رہنما منتظم کا دم غنیمت تھا -

لندن کے قیام کے دوران محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی بھی جلا وطنی کے دن وہاں گزار رہی تھیں جبکہ بھٹو مرحوم کی بیوہ نصرت بھٹو صاحبہ بھی ان دنوں وہیں پر تھیں - میں وہاں ان سے کئی دفعہ ملا اور پاکستان کی صورت حال پر تبادلہ خیال کیا وہ ان دنوں لندن میں بیٹھ کر مارشل لاء کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھیں - میں ایک دفعہ ان کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا تو انہوں نے پوچھا کہ اگر ہم مارشل لاء ہٹانے کے بعد اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہمیں فوری طور پر کیا اقدام کرنے چاہئیں - میں نے

کہا کہ پہلی بات مارشل لاء ہٹانے کی ہے - اس کے لئے آپ کو مکمل طور پر مزدوروں، کسانوں اور نچلے طبقے کی جدوجہد پر یقین رکھنا چاہئے - دوسری بات یہ کہ اقتدار میں آنے کے بعد آپ اپنے والد کی تمام اچھی سکیموں کو رواج دیں اور ان کی غلطیوں سے سبق حاصل کریں - میں نے کہا کہ آپ کو پوری توجہ کسانوں اور مزدوروں کو ان کے حقوق دینے کی طرف دینی ہوگی - بڑے طبقے کے جاگیردار اور سرمایہ داروں کو اپنی پارٹی میں اقتدار کے بعد نقب لگا کر داخل ہونے سے بچانا ہوگا - پارٹی کو ایک ہجوم سے تنظیم میں تبدیل کرنا ہوگا اور ملک میں ایسے اقدامات کرنے ہوں گے جو لوگوں کو ایک تبدیلی کا احساس دلائیں - میں وقتاً" فوقتاً" ان سے ملتا اور وہ بڑی عزت کرتیں - قمر عباس کے متعلق انہوں نے مجھے ایک دفعہ کہا کہ وہ عوام کا ایسا سپاہی ہے جس پر ہماری پارٹی کو فخر ہے اور میں اسے اپنا بھائی سمجھتی ہوں -

پھر ایک دن شاہنواز مرحوم (بھٹو صاحب کے چھوٹے صاحبزادے جنہیں فرانس میں ضیاء الحق نے زہر دلوا کر شہید کروادیا تھا) کے مرنے کی خبر آئی - ہم وہاں پہنچے تو وہ اپنے جوان مرگ بھائی کی لاش لے کر پاکستان جا چکی تھیں - ہم وہاں سوچتے رہ گئے کہ کب تک اس خاندان کو یہ زخم کھانے ہوں گے - پاکستان سے اطلاع ملی کہ بے نظیر کے بھائی کے جنازے پر لاکھوں کا اژدہام تھا - عوام کے ہجوم کو دیکھ کر فوجی حکومت بوکھلا گئی تھی اور اس لئے بے نظیر کی نظر بندی کا آرڈر کردیا حالانکہ اس سے پہلے ضیاء الحق بار بار یہ یقین دلاتا رہا تھا کہ بے نظیر کے آنے پر اسے گرفتار نہیں کیا جائے گا - یہ شاید پہلا موقع تھا کہ برطانوی پریس نے بے نظیر بھٹو کو پاکستان کی واحد سیاسی رہنما تسلیم کیا جس کے

پیچھے عوام کی بھاری اکثریت تھی جبکہ فوجی آمریت' مارشل لاء کی چھتری تلے گولیوں' کوڑوں اور قید و بند کے ظلم وجبر سے عوام پر مسلط تھی لیکن فوجی جنتا یہ جانتی تھی کہ ایک دن یہ ظلم ضرور ٹوٹے گا۔

شب پرستوں سے کہو جتنی بھی طوفانی ہوں
ان ہواؤں میں مگر ہم نے دیا رکھنا ہے
مہر و الفت کا علم لے کے چلے ہیں فارغ
امن عالم کا یہ دروازہ کھلا رکھنا ہے

یہ 1935ء کا واقعہ ہے کہ اسی لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا سنگ بنیاد رکھا گیا یہ چار ہندوستانی دانشور نوجوانوں کا کارنامہ تھا جو آکسفورڈ میں طالب علم تھے ۔ سجاد ظہیر ۔ ملک راج آنند ۔ ڈاکٹر تاثیر ۔ ڈاکٹر گھوش ان کا لیڈر سجاد ظہیر تھا ۔ یہ فریضہ نہایت خاموشی سے بڑے بے سروسامانی کے عالم میں ۔ ۔ ۔ ایک چینی ریستوران کے ایک مختصر سے کمرے میں مستقبل کے ان معماروں نے ادا کیا ۔ شاید اس وقت انہیں یہ خیال نہ ہوگا کہ ان کا یہ اقدام اتنا انقلابی اور دور رس نتائج کا حامل ہوگا کہ اردو ادب کی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دے گا ۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں سجاد ظہیر کو اپنے اس کارنامے کا ضرور احساس تھا ۔

کیونکہ وہ شروع سے یورپ کی انقلابی تحریکوں سے وابستہ تھا ۔ انگریزی زبان کے مشہور مصنف " رائف فاکس " سے اس کا گہرا تعلق تھا ۔ جس سے اس نے بہت کچھ سیکھا ۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے سلسلے میں سجاد ظہیر کی خدمات ناقابل

فراموش ہیں - اسے اور برصغیر میں نہ صرف اردو زبان میں بلکہ تمام علاقائی زبانوں میں ترقی پسند تحریک کا اولین رہنما ہونے کا فخر حاصل ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ تاریخی اعتبار سے تھرڈ ورلڈ میں ترقی پسند تحریک برصغیر کے شعر و ادب کے تراجم کے ذریعے ہی پھیلی اور پروان چڑھی ویسے بھی برطانیہ متحدہ ہندوستان اور تقسیم ملک کے بعد پاکستان میں بھی اس کا قیام عمل میں لانے والا سجاد ظہیر ہی تھا۔

دراصل فرانس میں فاشزم کے خلاف محاذ کی تحریک 1933ء سے شروع ہو چکی تھی - مشہور فرانسیسی ادیب " ہنری باربس " کی مسلسل تگ و دو کے نتیجے میں جولائی 1935ء میں پیرس میں ایک " ورلڈ کانگریس آف رائٹرز فار دی ڈیفنس آف کلچر " یا " بین الاقوامی مصنفین کانفرنس برائے تحفظ کلچر " کے انعقاد کا ڈول ڈالا گیا - اس کانفرنس کے داعی میکسم گورکی، رومین رولان، آندرے مالرو، ٹامس مان اور والڈو فرینک جیسی شہرہ آفاق بین الاقوامی شخصیتیں تھیں - یہ انٹرنیشنل ادبی اجتماع پیرس کے ایک مشہور ہال " بال یولیے " میں ہوا جو دنیائے ادب میں سب سے پہلا تاریخی اجتماع تھا - یہ پہلا موقع تھا جب قریب قریب دنیا کی ہر مہذب قوم کے ادیب باہم صلاح و مشورہ کے لئے ایک مقام پر جمع ہوئے تھے - انہوں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ تہذیب و تمدن کو رجعت پسندی اور تنزل کی اٹھتی ہوئی لہر سے بچانے کے لئے اپنی انفرادیت کو خیرباد کہہ کر خود اپنی جماعت کو منظم کرنا ضروری ہے - صرف یہی ایک موثر طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ ترقی اور فلاح کی قوتوں کی مدد کر سکتے ہیں - اپنی تخلیقی صلاحیت کی افزائش کے لئے ماحول پیدا کر سکتے ہیں اور اس طرح جماعتی حیثیت سے اپنی ہستی کو ایک انقلاب انگیز عہد میں فنا ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اتنی بڑی کانفرنس میں مختلف خیال اور عقائد کے ادیب جمع تھے - لیکن ایک چیز کے بارے میں سب متفق تھے وہ یہ تھی کہ ادیبوں کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ آزادی خیال و آزادی رائے کے حق کے تحفظ کی کوشش کرنی چاہئے - فاشزم یا سامراجی قوتیں جہاں بھی ادیبوں پر جابرانہ پابندیاں عائد کریں یا ان کے خیالات کی بناء پر ان پر مظالم کریں اس کے خلاف پر زور احتجاج کرنا چاہئے - دوسری چیز جو اس کانفرنس میں سب نے محسوس کی یہ تھی کہ ادیب اپنے حق کا بہترین تحفظ اسی حالت میں کرسکتے ہیں جب وہ عوام کی آزادی کے متحدہ محاذ کا جزو بن کر محنت کش طبقے کی پشت پناہی حاصل کریں

اس بین الاقوامی کانفرنس کے اجلاس اور اس کی کمیٹیوں کی میٹنگیں پیرس میں کئی دن تک منعقد ہوئیں - کھلے اجلاس میں ہزاروں انسانوں کا مجمع ہوتا تھا اور ہال جس میں داخلہ ٹکٹ سے تھا - کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا - سب سے اچھی بات یہ تھی کہ مزدور جماعت کے لوگ کثرت سے آتے تھے - وہ گویا اپنی موجودگی سے ادیبوں اور عوام الناس کو اس نئے سرے سے قائم رشتے کا بین ثبوت دے رہے تھے جس کے لئے خاص کر یہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی -

لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ نے اپنا پہلا منشور پیش کیا - انجمن کا یہ اولین منشور سجاد ظہیر اور ڈاکٹر ملک راج آنند کی ذہنی کاوش کا نتیجہ تھا جس پر ان چاروں بانیوں کے دستخط تھے - منشور یہ تھا -

ا:- ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا - ان انجمنوں کے درمیان اجتماع اور پمفلٹوں کے ذریعے رابطہ رکھنا - صوبوں

کے مرکز کی اور لندن کی انجمن کے درمیان قریبی تعلق پیدا کرنا۔

2:- ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہو۔

3:- ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ کرنا جو صحت مند اور توانا ہو اور جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

4:- ہندوستانی قومی زبان کے لئے انڈو رومن رسم الخط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

5:- فکر و نظر اور اظہار خیال کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا۔

6:- ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا۔ عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے لئے امداد چاہتے ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد سجاد ظہیر پاکستان آگیا اور برطانیہ اور بھارت کے بعد پاکستان میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں لا کر اپنا تاریخی رول مکمل کیا۔ وہاں جلد ہی اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوگئے۔ لیکن اس نے گرفتاری نہیں دی اور انڈر گراؤنڈ رہ کر بڑی کڑی زندگی گزارتا رہا یہاں تک کہ پنڈی سازش کیس میں میجر جنرل اکبر خان۔ میجر اسحاق۔ فیض احمد فیض۔ کرنل ارباب نیاز وغیرہ کے ہمراہ سجاد ظہیر بھی گرفتار کرلیا گیا اور پانچ سال قید گزارنے کے بعد حکومت پاکستان نے اسے انڈیا بھیج دیا۔

انجمن کے سیکرٹری جنرل پاکستان میں شروع ہی سے احمد ندیم قاسمی صاحب تھے۔ اور انجمن کے بین ہونے تک نہایت مستعدی اور دلیری سے

پورے پاکستان میں انجمن کی آرگنائزیشن کی خدمات انجام دیتے رہے - سندھ میں مختار حسین اور شوکت صدیقی - بلوچستان میں نصیر احمد نصیر انجمن کے سیکرٹری تھے - پنجاب کی سیکرٹری خدیجہ مستور مرحومہ تھیں اور سرحد میں سیکرٹری کے فرائض میرے ذمے تھے -

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی نہ صرف انجمن کی شاخیں قائم ہوگئیں بلکہ تنقیدی اجلاس بھی ہونے لگے - باوجود اس کے کہ حکومت کی طرف سے بڑی سختی تھی - گرفتاریاں بھی ہوئیں - پیشیاں بھی بھگتتے - پولیس بھی تنگ کرتی - سی آئی ڈی نہ صرف ترقی پسندوں بلکہ جلسوں میں شامل ہونے والوں کے پیچھے بھی لگ جاتی اور آخر کار 1954ء میں یکایک انجمن کو بالکل ہی خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور انجمن کے ہم سب عہدیداروں کو سیفٹی ایکٹ کے تحت ایک ایک سال کے لئے پابند سلاسل کر دیا گیا - سال کے بعد رہائی ہوئی تو چھ ماہ کے لئے شہر میں نظر بند کر دیئے گئے -

اب پچاس سال بعد لندن میں فارغ بخاری - بخش لائل پوری - عاشور کاظمی اور حکیم جاوید قریشی یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ اس انجمن کی پچاس سالہ گولڈن جوبلی منا کر سجاد ظہیر - ملک راج آنند - ڈاکٹر گھوش اور تاثیر کو خراج تحسین پیش کیا جائے - ہم نے پہلا اجلاس عاشور کے گھر کیا اور کمر کس لی - پہلے میں ان تینوں ترقی پسند مجاہدوں کا تعارف کرواتا ہوں - جنہوں نے اس عظیم کانفرنس کے لئے دن رات ایک کرکے اس کو عالمی کانفرنس کا روپ دیا - انجمن کا صدر فارغ بخاری کو چنا گیا - بخش لائل پوری انجمن ترقی پسند مصنفین (برطانیہ) لندن کا نائب صدر تھا - اس کی پچاس سالہ گولڈن جوبلی کی دو روزہ انٹرنیشنل کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں انہوں نے نہ صرف خود بلکہ ان کی

بیگم نے بھی اور بچوں نے بھی حتی الامکان بڑی حد تک مدد کی۔ بخش نے چندے کی فراہمی میں بھی دوڑ دھوپ کی اور کانفرنس کے لئے انڈیا۔ پاکستان اور روس سے آنے والے معزز مندوبین کا استقبال کرنے اور انہیں منزل مقصود تک پہنچانے کی ذمہ داری لی۔ جسے انہوں نے بڑے احسن طریقے سے پورا کیا۔

عاشور کاظمی انجمن کے لندن کے سیکرٹری جنرل تھے۔ انجمن کا انعقاد بہت حد تک ان کی محنت شاقہ۔ دوڑ دھوپ اور معاملہ فہمی کا رہین منت تھا۔ سارا دفتری کام، خط و کتابت، ٹائپنگ، شاپنگ اور دیگر تمام انتظامات کچھ اس حیرت انگیز مستعدی اور سلیقے سے سرانجام دیئے کہ ان کی جگہ پانچ افراد کا سٹاف بھی ہوتا تو شاید یہ کام اتنے احسن طریقے سے انجام نہ پا سکتا۔ پھر کانفرنس کے دوران بھی سٹیج کو نہایت خوش سلیقگی اور ہنرمندی سے سنبھالے رکھا۔

حکیم جاوید قریشی پاکستان کے مایہ ناز سیاست دان، شاعر، ادیب، صحافی، بے مثال مقرر، لاجواب منتظم اور قابل اعتماد دوست۔ انجمن کا نشرو اشاعت ان کے سپرد تھا۔ اگر چہ وہ اپنی ملازمت کی پابندی اور نہایت کٹھن ذمہ داری کے باعث زیادہ وقت تو نہیں دے سکتے تھے لیکن ان کی صلابت رائے ان کے قیمتی مشوروں اور انکی دانش مندانہ رہنمائی ہی درحقیقت اس بین الاقوامی کانفرنس کی کامیابی کا باعث تھی۔ کانفرنس سے ایک عرصہ پہلے ہی ان کے گھر ہر ہفتے ایگزیکٹو کمیٹی کی میٹنگ ہوتی جس میں سارے مسائل زیر بحث آتے۔

کانفرنس کی راہ میں بڑے روڑے اٹکانے کی کوشش کی گئی لیکن ملی مشکلات سے نمٹنے سے لے کر مندوبین کے آنے اور کانفرنس کے منعقد ہونے سے لے کر مندوبین کو رخصت کرنے تک کے مراحل ہم نے بڑی مشکلات لیکن بڑے احسن طریقے سے انجام دیئے۔ جن کا ذکر میں اپنی اس سلسلے میں لکھی جانے والی کتاب "لوح غیر محفوظ" میں کرچکا ہوں۔

کانفرنس میں پوری دنیا سے سکالر آئے جن کی تفصیل یہ ہے۔

پاکستان ۔ سبط حسن ۔ صفدر میر ۔ عبداللہ ملک ۔ امین مغل ۔ رضا ہمدانی ۔ بیگم ایلس فیض ۔ حمید اختر ۔ احمد ہمدانی ۔ فخر زمان ۔ سعیدہ گزدر ۔ اعتزاز احسن ۔

انڈیا ۔ ڈاکٹر ملک راج آنند ۔ علی سردار جعفری ۔ پروفیسر قمر رئیس ۔ ڈاکٹر محمد حسن ۔ ڈاکٹر عقیل رضوی ۔ پروفیسر کرتار سنگھ دگل ۔ ڈاکٹر فضل امام ۔ ڈاکٹر نامور سنگھ ۔ ڈاکٹر لطف الرحمان ۔ ڈاکٹر شفیقہ فرحت ۔ ڈاکٹر کاظمی ۔ ڈاکٹر نریش ۔ ڈاکٹر شمین اختر ۔ ڈاکٹر محمود الحسن رضوی ۔ ڈاکٹر نسیم بھابیہ ۔ پروفیسر زاہدہ زیدی ۔ پروفیسر ساجدہ زیدی ۔ پروفیسر ایس آر قدوائی ۔ پروفیسر لسان الارشد ۔ پروفیسر وہاب اشرفی ۔ پروفیسر شکیل الرحمان اور ڈاکٹر علی اعجاز ارشد ۔

کینیڈا ۔ اشفاق حسین ۔ سٹیا اسیڈ لز ۔ عرفانہ عزیز

امریکہ ۔ ڈاکٹر فیروز الدین ۔ انور خواجہ ۔ جوہر میر

فرانس ۔ ڈاکٹر فشر

ناروے ۔ مسعود منور ۔ سعید انجم ۔ اندر جیت پال

ہالینڈ ۔ وہاب صدیقی ۔ اسد مفتی ۔ رشید انجم

ایسٹ جرمنی ۔ اسد اللہ

جرمنی ۔ مظفر شیخ ۔ طفیل خلش

روس ۔ ڈاکٹر محاچوف ۔ ڈاکٹر آنا سوادو وا ۔ اے سی چوف

برطانیہ ۔ شانہ نیون (ممبر یورپین پارلیمنٹ) سیسھار الرٹس ۔ پروفیسر رالف رسل ۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز

کشمیر ۔ ڈاکٹر شکیل الرحمان

سویڈن ۔ احمد تقیمہ ۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر اقبال سنگھ - ڈاکٹر فاخر حسین - ڈاکٹر حسن عسکری - ڈاکٹر مصطفیٰ کریم - جاوید بیدی -

یہ تاریخی کانفرنس جی ایم سی ہال میں منعقد ہوئی اور پانچ سے چھ سو حضرات سے ہال کھچا کھچ بھرا تھا - صبح نو بجے سے رات گیارہ بجے تک دنیا بھر کے ترقی پسند سکالروں کو لوگ سنتے رہے - اس کانفرنس کے لئے ساتھیوں نے ' کھول کر چندہ دیا اور چندے اکٹھے کرنے کی مشکلات کا ذکر بھی لوح غیر محفوظ میں کر چکا ہوں - بہر حال اخراجات کا تخمینہ بہت زیادہ تھا آخر کار جی ایل سی - گریٹر لندن کارپوریشن) کی انتظامیہ نے نہ صرف کرائے کے دو بڑے ہال مہیا کئے بلکہ معقول چندہ بھی دیا اور دوسرے روز جی ایل سی کے چیئرمین نے مہمانوں کے اعزاز میں نہایت معقول استقبالیہ بھی دیا - انڈیا سے آنے والے مہمانوں کے اخراجات ان کے اداروں' یونیورسٹیوں نے برداشت کئے - باقی مہمان اپنے خرچ پر تشریف لائے اور لندن میں تمام دوستوں نے مل کر اپنے گھروں میں باہر سے آنے والے مہمانوں کی رہائش بانٹ لی - پہلا سیشن دس بجے سے بارہ بجے تک تھا - دوسرا سوا بارہ بجے سے سوا دو بجے تک رہا - تیسرا سیشن تین بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک آخری سیشن ختم ہونے کے بعد مسٹر ہیری وائس چیئرمین جی ایل سی نے استقبالیہ دیا اور خود شرکت کی -

چوتھا سیشن، ساڑھے چھ بجے سے ساڑھے دس بجے شام تک مشاعرے کی صورت میں تھا ۔ لندن کی تاریخ میں پہلی بار اتنے بڑے بڑے شاعروں کا اجتماع کہا جاسکتا ہے -

پھر ملک راج آنند (بانی انجمن ترقی پسند مصنفین لندن) نے دو انعامات تجویز کئے -

آخر میں اعلان نامہ منظور کیا گیا جو من و عن میری کتاب لوح غیر محفوظ میں درج ہے۔ اس طرح اس تاریخی عالمی کانفرنس کا اختتام ہوا۔

لندن میں قیام کے دوران اطلاع ملی کہ پاکستان میں مارشل لاء کی چھتری تلے غیر جماعتی انتخابات کرائے جا رہے ہیں اس وقت یہ بھی اچھا شگون تھا۔ بہر حال غیر جماعتی انتخابات کروا دیئے گئے اور ضیاء الحق نے اپنی غیر سیاسی ٹیم کو محمد خان جونیجو کی سرکردگی میں میدان میں اتارا۔ اب جلا وطن رہنماؤں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے پتہ چلا کہ بے نظیر نے واپس پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ قمر عباس نے امریکہ سے فون کیا کہ وہ بھی بے نظیر کے کہنے پر پاکستان جا رہا ہے۔ میں بھی اس عرصے میں وطن کی جدائی بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ بیگم نے فون کیا کہ اب واپس آجائیں آخری عمر میں تو کم از کم میرے ساتھ رہیں۔ میں نے کہا بیگم واپس تو میں آجاؤں گا لیکن یہ آخری عمر کی بات نہ کرنا ابھی تو میرے دودھ کے دانت بھی نہیں جھڑے۔

بہر حال تمام دوستوں سے اجازت چاہی۔ ہر گھر میں الوداعی تقریبات ہوئیں ایک لورا کے سوا سب سے اجازت لینے کے بعد میں واپس پاکستان پہنچا۔ پاکستان میں بے نظیر کے تاریخی استقبال ہو رہے تھے۔ قائداعظم کے بعد ایسے مناظر اور استقبالیوں کی مثال ملنا مشکل ہے۔ لاہور میں بیس لاکھ افراد اُمڈ پڑے پشاور میں ہر سڑک لوگوں کے ہجوم سے بند ہوگئی اور کئی کئی میل تک لوگوں کے سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ قمر عباس ایک دفعہ پھر مصروف ہو چکا تھا۔ لوگ تبدیلی چاہتے تھے۔ یہ مارشل لاء کے خلاف عوامی ریفرنڈم تھا لوگوں نے فوجی جنتا کو مسترد کر دیا تھا۔ ضیاء الحق نفرت کی علامت بن چکا تھا اور پھر وہی ہوا کہ اپنے احتساب کے ڈر سے ضیاء الحق نے اس لنگڑی لولی جمہوریت کو بھی ختم کر

دیا۔ اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔ محمد خان جونیجو پر اسی کی بنوائی ہوئی اٹھاون دو بی کی تلوار چلا دی گئی۔

اب امریکہ کے لئے ضیاء الحق کی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ بے نظیر کے استقبال دیکھ کر اسے عوام کے موڈ کا پتہ چل گیا تھا۔ اوجڑی کیمپ کے واقعے سے اسے فوجی جنتا کی بد اعمالیوں کا اندازہ ہو چکا تھا۔

ایک دن ایک دھماکہ ہوا۔ ضیاء الحق اپنے حواریوں کے ساتھ جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ پوری قوم کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ان کے ذہنوں پر سوار پراسرار جن مرچکا ہو۔ یقین نہ آتا تھا لوگ ایک دوسرے سے بار بار پوچھتے کیا واقعی ایسا ہو چکا تھا۔ خبروں کا انتظار تھا آخر کار ریڈیو اور ٹی وی نے اس خوشگوار حادثے کی اطلاع دی تو دلوں کا یہ بوجھ ختم ہوا۔

غلام اسحاق کو صدر بنا دیا گیا اور جرنیلوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بہت ہو چکی اب عوام کو اقتدار سونپ دینا چاہئے کیونکہ اب عوام میں پھیلی ہوئی نفرت کے اتارنے کا یہ ہی ایک ذریعہ تھا۔

انتخابات کرا دیئے گئے اور پیپلز پارٹی برسر اقتدار آگئی۔ قمر عباس صوبائی حلقہ دو پشاور سے ایم پی اے منتخب ہوا اور صوبہ سرحد میں اے این پی کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت بنا لی گئی جس میں قمر عباس کو قانون و پارلیمانی امور اور ہاؤسنگ و فزیکل پلاننگ کا وزیر بنا دیا گیا۔

مدتوں بعد گھر میں سیاست کا روشن پہلو دیکھنے کو ملا تھا۔ تمام شہری جنہوں نے قمر عباس کو بھاری تعداد میں ووٹوں سے نوازا تھا' خوش تھے۔ میں نے اپنا کام شروع کیا اور لوح غیر محفوظ لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ اس کے بعد پیاسے ہاتھ مکمل کیا۔ مجھے اس دوران وہ زمانہ یاد آرہا تھا جب اس گھرانے پر بھوتوں کا بسیرا تھا۔ قمر عباس کی زندگی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ممتاز علی آخونزادہ کی

جولن لاش پر ماتم ہو رہا تھا - طاہرہ بغیر بھائی کی شرکت کے الوداع ہو رہی تھی - میرے دوسرے داماد محاصل خان (جو یونائیٹڈ بنک میں اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ تھے) کو فضل حق کے کہنے پر بنک سے نکال دیا گیا تھا - میرا پریس جو احباب پرنٹرز کے نام سے چلایا جا رہا تھا - ڈپٹی کمشنر کے حکم پر سیل کر دیا گیا تھا - مشینوں کو زنگ لگ چکا تھا اور بے کاری منہ کھولے میرے سامنے کھڑی ہنس رہی تھی -

میں نے سر کو جھٹکا اور سوچا چلو زندگی ویسے کون سی پھولوں کی سیج لے کر آئی تھی - اب رضا ہمدانی تھا اور میں صبح میں گھر سے نکلتا رضا کے گھر محلہ محمد داد آسیہ گیٹ چلا جاتا - دونوں دوست بیٹھے گپیں لگاتے وہیں شاعر جمع ہوتے یا شام کو میرے گھر ساتھی آجاتے - مشاعرے ہونے لگے کتابوں کی رونمائیاں ہونے لگیں اور زندگی پرسکون رواں دواں ہو گئی -

لندن میں ۔ بے نظیر بھٹو کے ہمراہ

لندن ۔ اہل قلم کانفرنس میں شریک مندوبین کے ہمراہ ۔ (۱۹۸۵ء)

بریڈ فورڈ، لندن میں اپنے اعزاز میں منعقدہ ایک شام میں۔

لندن ۔ ایک ضیافت میں محو گفتگو ۔

ناصر بلوچ کی شہادت کے خلاف لندن کے مظاہرہ میں شریک ۔

لندن 'ٹیوب میں سفر کرتے ہوئے۔

لندن۔ ہرے راما' ہرے کرشنا عبادت گاہ میں۔

لندن۔ وِیر میرا کموڑی چھیا۔ یہ ملکہ کے باڈی گارڈ کا عام سپاہی ہے۔

لندن۔ فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ کے پاس۔

لندن ۔ ٹریفلگر سکوائر میں ۔ (۱۹۸۳ء)
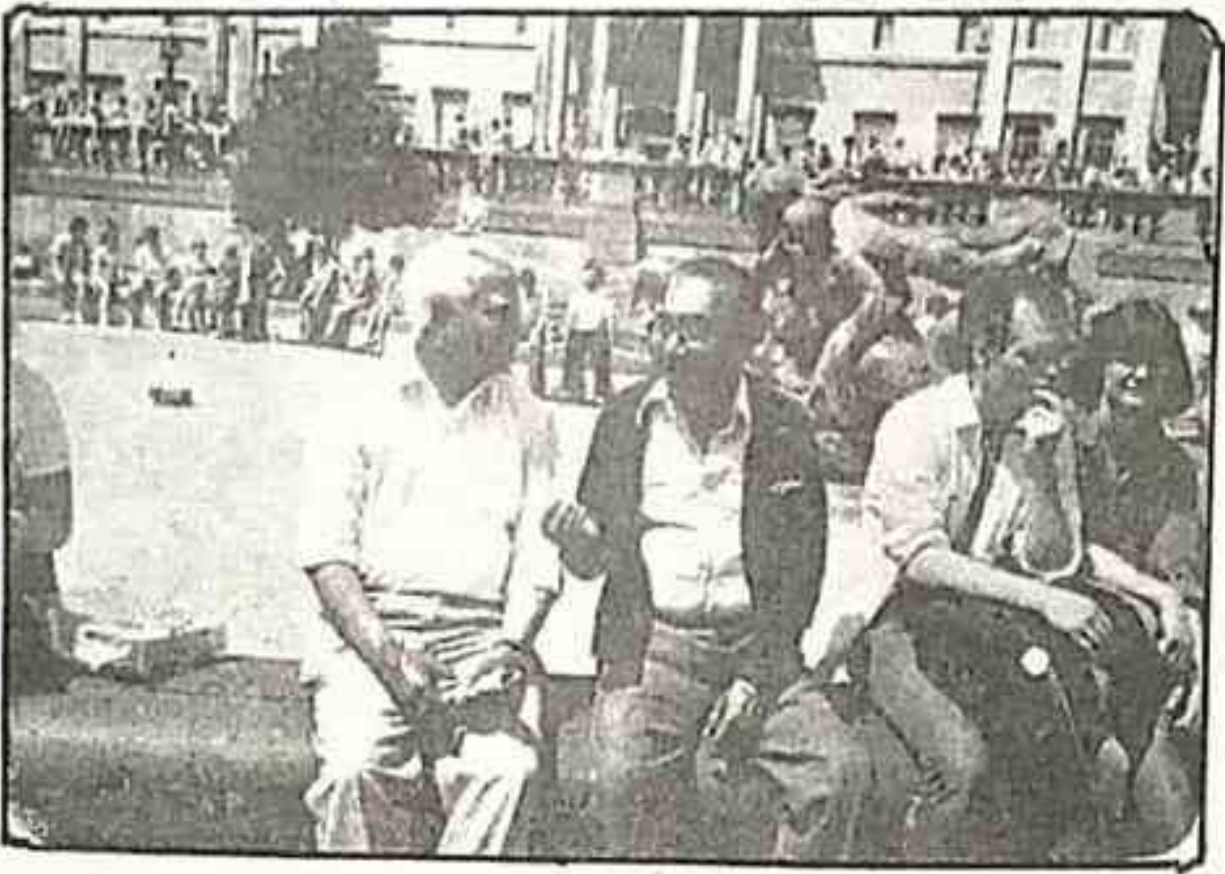
لندن ۔ سپیکر کارنر ' ہائیڈ پارک ' جہاں ہر شخص کو بولنے کی اجازت ہے ۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے سالانہ اجلاس میں خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے

ادبی خدمات

میں سالہا سال تک پاکستان رائٹرز گلڈ کا معتمد رہا - 1935ء سے 1971ء کے دوران میں نے جن اخبارات و رسائل کی ادارت کی ان میں " کیسر کیاری " پشاور " نغمۂ حیات پشاور " " المشرق پشاور "،" ابلاغ پشاور "،" شباب پشاور لاہور " ماہنامہ " سنگ میل "، " فوک لور جنرل ماہنامہ " بطور خاص قابل ذکر ہیں - بحیثیت سب ایڈیٹر اور کالم نگار میں روزنامہ " انجام پشاور "، " روزنامہ شہباز "، " روزنامہ امروز لاہور "، " روزنامہ جنگ راولپنڈی " اور ہفت روزہ لیل و نہار کراچی سے وابستہ رہا -

میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین صوبہ سرحد اور عالمی امن کمیٹی کے سیکرٹری کے علاوہ پاکستان رائٹرز گلڈ کی مرکزی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے بھی فرائض سر انجام دیئے - 1954ء اور 1970ء میں دو بار سیفٹی ایکٹ کے تحت قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد جب مجھے پاسپورٹ ملا تو میں نے یورپ امریکہ، انڈیا، ملائیشیاء، تھائی لینڈ، ڈنمارک کی وقتاً" فوقتاً" خاک چھانی اور اپنے پرانے مشغلے آوارہ گردی کو جاری و ساری رکھا - لندن میں میں نے اردو پشتو اور ہندکو کے مخطوطات پر تحقیق کی - میری تصانیف و تالیف میں عورت کا گناہ افسانہ 1936ء '1949ء میں آیات زندگی 1951ء اور 61ء میں دو ایڈیشن پشتو لوک گیت' معہ اردو ترجمہ 1952ء میں زیر و بم پہلا شعری مجموعہ 1955ء میں ادبیات سرحد 1957ء میں باچا خان 1971ء میں شعری مجموعہ شیشے کے پیراہن 1974ء' سرحد کے لوک گیت بمع اردو ترجمہ' 1978ء خوشبو کا سفر مجموعہ کلام 1978ء میں البم (خاکے) پھر دوسرا البم (خاکے) 1981ء میں شائع ہوئے - (یہ دونوں ایم اے اردو کے نصاب میں شامل کر لئے گئے)

" لوح غیر محفوظ " (مضمون میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کی رودلو) 1979ء میں " غزلیہ " (غزلوں میں نیا تجربہ) شعری مجموعہ " آئینے صداوں کے " " شعری مجموعہ " " بے چہرہ سوال " شعری مجموعہ " پیاسے ہاتھ " " نویاں رلواں " ہندکو کے شعراء کا منتخب کلام (ہندکو کی پہلی شعری کتاب)

" محبتوں کے نگار خانے " شعری مجموعہ آکس ڈور (یہ میں نے اور میرے بہنوئی محمود شاہ رضوی نے مل کر لکھی ۔

اس کے علاوہ رضا کے ساتھ مشترکہ تصانیف و تالیف میں " اٹک کے اس پار " " خوشحال خان کے افکار " " رحمان بابا کے افکار " " پشتو شاعری " " پٹھانوں کے رومان " " خوشحال خان خٹک " " رحمان بابا " 1949ء کا منتخب لوب " شامل ہیں ۔

میں نے طویل تنقیدی اور تحقیقی مقالوں میں " اقبال پر خوشحال کا اثر " ۔ " پشتو ڈرامہ " " پشتو نثر " "ہندکو زبان کا ارتقاء " اور " سابق مشرقی پاکستان کا رپورتاژ " برلت عاشقان بھی لکھے جو بہت مقبول ہوئے ۔

میں نے اور رضا نے بچوں کے لوب پر بھی بہت کام کیا اور میں نے غازی صلاح الدین' ایک مشاعرہ اور اس طرح کی چھوٹی چھوٹی بچوں کے لئے کم از کم دس بارہ کتابیں لکھیں جس کے نام اب یاد نہیں رہتے مجھے اپنی کتابوں پر پاکستان رائٹرز گلڈ' اباسین آرٹس کونسل' انجمن ترقی اردو' جاناںہ آرٹس کونسل' آدم جی ایوارڈ حسب ذیل کتابوں پر ملے ۔

خوشبو کا سفر ۔ ۔ ۔ ۔ سرحد کے لوک گیت' خوشحال خان خٹک' پشتو شاعری' شیشے کے پیرہن' رحمان بابا' دوسرا البم ۔ یہ ایوارڈ بعض دو دو دفعہ مجھے ملے اور آخر میں میری خدمات کے صلے میں مجھے گورنمنٹ آف پاکستان کی

طرف سے پرائڈ آف پرفارمنس بھی ملا جو میں نے ضیاء الحق کے وقت میں ایک دفعہ لینے سے انکار کر دیا تھا - آخری ایوارڈ حبیب جالب ایوارڈ تھا -

میری شاعری کا انگریزی ترجمہ یونس احمر نے Farigh'S Poems کے عنوان سے کیا جبکہ باچا خان کا ترجمہ انگلش' ہندی اور روسی زبان میں کیا گیا - میں نے دو فلموں کی کہانیاں لکھیں جن میں پشتو فلم " غازی کاکا " خاصی مقبول ہوئی جبکہ قتیل شفائی کی ہندکو زبان کی پہلی اور آخری فلم قصہ خوانی کامیاب نہ ہو سکی۔

سیاسی جدوجہد

میں دوستوں سے کہتا ہوں کہ " میں نے ذہنی اور نظریاتی معاشقے کئے ہیں - سفید ریش بزرگوں کو ایک محبوبہ کی طرح چاہا ہے ان سے پیار کیا ہے ان پر جان چھڑکی ہے " - تو وہ میری باتوں کو احمقانہ جان کر ہنستے ہیں - میرا مذاق اڑاتے ہیں لیکن انہیں کون سمجھائے کہ یہ مذاق نہیں حقیقت ہے - میں نے مولانا ابوالکلام آزاد' بھگت سنگھ' ہوچی منہ' ماؤزے تنگ' مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اور صنوبر کاکا جی سے عشق کئے - دل ہی دل میں ان کی پرستش کی ہے - وہ اپنے قومی کردار' اپنے آدرش کے لئے عظیم قربانیوں اور انسانیت کے محسن ہونے کے باعث ایسے مثالی انسان تھے جن کی تعلیمات کی میرے فکر و نظر پر بڑی گہری چھاپ ہے - ان کے انقلابی کردار نے مجھے عزم و حوصلہ' جرات مندی اور استقامت سکھائی - انسان دوستی کی تعلیم دی اور عوامی قوتوں کے درخشاں مستقبل پر اعتماد و یقین پیدا کرنے کا درس دیا - ان کی حریت پسندی نے مجھے باطل کی طاغوتی طاقتوں سے بے جھجک ٹکر لینے کا حوصلہ دیا - اظہار حق

کلورس دیا اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر سچائی کی راہ پر گامزن ہونے کا عزم عطا کیا۔

کاکا جی سے میری پہلی ملاقات جس ڈرامائی انداز سے ہوئی اس واقعے سے آپ اندازہ لگالیں گے کہ اگر یہ عشق نہیں تو کیا ہے۔ کاکا جیؒ کے متعلق مجھے اتنا علم تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف مشہور سوشلسٹ پارٹی جماعت بھارت سبھا کے بانی مبانی اور جنرل سیکرٹری تھے۔ لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے انگریز سول سرجن کی ایک قومی لیڈر کی بے عزتی کرنے پر انہی کی کی ہوئی میٹنگ کے بعد عبدالرشید نامی نوجوان نے اس کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ کاکا جی اس کے بعد علاقہ غیر میں انگریزوں کے خلاف لڑتے رہے اور تمام عمر انگریزی دور میں قید و بند میں گزاری۔ شادی تک نہ کی اور آزادی کے لئے وقف رہے۔

میں پہلی ملاقات کی بات کر رہا تھا ایک دن مجھے پشاور ان کی آمد کا پتہ چلا اور یہ معلوم ہوا کہ چوک ناصر خان پشاور میں انہوں نے ماہنامہ "اسلم" کے دفتر کے لئے ایک بالا خانہ کرائے پر لیا ہے۔ تو میں بڑی بے چینی سے بھاگم بھاگ وہاں پہنچا لیکن دفتر بند تھا۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی ایسا ہی ہوا۔ میں جب تیسرے دن بھانہ ماڑی میں اپنی دکان پر پہنچا (جہاں ان دنوں میرا مطب ہوا کرتا تھا) تو کاکا جی کو اپنا منتظر پایا۔ ہم دونوں بغیر کسی تعارف کے یوں تپاک سے ملے جیسے دو بچھڑی ہوئی روحیں آملی ہوں ہم نے اس سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ تھا۔ جب میں نے ان سے کہا کہ تین دن سے دفتر کا طواف کر رہا ہوں تو انہوں نے بتایا کہ وہ بھی تین دن سے میری دکان کے چکر لگا رہے ہیں۔

کاکا جی نے یہاں آتے ہی ادھر پشتو ادبی مجلہ "اسلم" کا اجراء کیا اور ادھر "اولسی ادبی جرگہ" پشتو کے عوامی ادبی ادارے کی تشکیل کی جس کے ہفتہ

وار تنقیدی اجلاس بڑی با قاعدگی سے ہونے لگے - کاکا جی کی شخصیت کی کشش نے اس ادارے میں تمام قدیم و جدید پشتو قلم کاروں اور چند ایک اردو اہل قلم کو بھی جمع کر دیا - امیر حمزہ شنواری' دوست محمد خان کامل' افضل بنگش' اجمل خٹک' قلندر مومند' ہمیش گل' سردار خان فنا' اشراف حسین' میر مہدی شاہ' لطیف وہمی' عبدالخالق خلیق' فضل حق شیدا' مرزا گل ممند' فیضی' رضا ہمدانی اور راقم الحروف اور بہت سے دوسرے دانشور ان محفلوں میں باقاعدہ شرکت کرنے والوں میں سے تھے - اس ادارے کے تنقیدی جلسوں نے پشتون ادیبوں اور شاعروں میں تنقیدی شعور پیدا کیا اور انہیں روایتی ادب کی دلدل سے نکال کر مقصدی ادب کی راہ پر ڈالا - انہیں حقیقت نگاری سے آشنا کرایا اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا -

کاکا جی کے انقلابی شعور نے بہت سے انقلابیوں کو جنم دیا - افضل بنگش اور میں ان کے نظریاتی فرزند ہونے کے ناطے اس کے بعد اپنی سیاسی راہ متعین کرتے رہے -

1952ء میں میں جب امن کمیٹی کا جنرل سیکرٹری اور پیر صاحب مانکی شریف صدر تھے - میرے لئے پیر صاحب مانکی شریف کا خط ان کا سیکرٹری عبدالقادر افضل بنگش کے پاس لایا جس میں لکھا تھا کہ

"ہم چین جا رہے ہیں تم اور فارغ بخاری ہمارے ساتھ جاؤ گے"

اس دعوت میں تیس افراد کو مدعو کیا گیا تھا - میاں افتخار الدین نے ہمارے نام کاٹ دیئے لیکن پیر صاحب نے جانے سے انکار کر دیا -

میں اور افضل بنگش عوامی لیگ کے رکن تھے - سہروردی وزیر اعظم ہوا تو عثمانی اور سی آر اسلم نے سہروردی کو عوامی لیگ سے نکال کر اپنی عوامی لیگ بنا لی - مولانا بھاشانی بھی سہروردی سے تنگ تھا یہاں میاں افتخار الدین' حیدر

بخش جتوئی' خان عبدالغفار خان' عبدالولی خان' عبدالصمد اچکزئی اور ہاشم خان نے
لاہور میں نیشنل پارٹی کی بنیاد ڈالی - شہزادہ عبدالکریم نے " استھان گل " اور
پشتون " عبدالصمد اچکزئی کی پارٹی جی ایم سید کا سندھ عوامی محاذ' حیدر بخش جتوئی
کی سندھ ہاری کمیٹی' پنجاب میں آزاد پاکستان پارٹی میاں افتخار الدین کی اور
سرحد میں خدائی خدمتگار تھی - ان سب نے مل کر اجلاس بلایا اور نیشنل پارٹی
کی تشکیل عمل میں آئی -

پھر مولانا بھاشانی نے خان عبدالغفار خان کو بنگال کے دورے کی دعوت
دی - جبکہ غلام محمد لوند خوڑ کو مکھی ڈالنے کے لئے سہروردی ساتھ لے گیا -
ماسٹر خان گل بھی سہروردی کے ساتھ گیا - باقی مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان
میں دو پارٹیاں بن گئیں - "گوانا تری دل " پروگریسو پارٹی تھی - انہوں نے مل
کر ڈھاکہ میں کنونشن کیا - جس میں کل پاکستان نیشنل عوامی پارٹی بنائی گئی - جس
کا صدر مولانا بھاشانی اور سیکرٹری جنرل محمود الحق چنے گئے -

مغربی پاکستان کا صدر خان عبدالغفار خان مقرر ہوا - اس کا مرکزی دستور
افضل بنگش نے بنایا - جس پر سب نے دستخط کئے اور متفقہ طور پر منظور کیا گیا -

1954ء میں 23 اور 24 جولائی کی درمیانی شب کو کاکا جی صنوبر حسین'
کاکا خوشحال خان' افضل بنگش اور مجھے صوبہ سرحد اور احمد ندیم قاسمی' عبداللہ
ملک' حمید اختر' صفدر میر' ظہیر کاشمیری کو پنجاب سے اور ممتاز حسین' شوکت
صدیقی کو کراچی سے گرفتار کرکے سیفٹی ایکٹ کے تحت ایک ایک سال کے لئے
جیل بھیج دیا گیا اور رہائی کے بعد چھ ماہ کے لئے اپنے شہروں میں نظربند کر دیا
گیا -

اکتوبر 1951ء میں ہم نے جیل میں پڑھا کہ ون یونٹ بنا دیا گیا ہے -
یونٹ بننے سے پہلے خدائی خدمتگار اور عوامی لیگ کی میٹنگ ہوئی - خان

عبدالغفار خان اور پیر مانکی شریف کراچی گئے اس وقت ڈاکٹر خان صاحب وزیر بن چکے تھے - باچا خان بھائی کے پاس ہی ٹھہرے ان کی واپسی پر ٹرین میں ون یونٹ کا اعلان ہوا تو باچا خان نے کہا ہم سے غلطی ہوئی اگر ہم صحیح لائن پر تحریک چلاتے اور کچھ لوگ قربانی دے دیتے تو ون یونٹ نہ بنتا - باچا خان نے شاید پہلی مرتبہ اپنی عدم تشدد کی پالیسی کے خلاف زبان کھولی تھی - بہر حال یونٹ بن گیا اور اس کے خلاف جدوجہد جاری رہی -

جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں ہم پشاور جیل میں تھے - افضل بنگش، کاکاجی صنوبر حسین، خوشحال کاکا کے علاوہ ارباب سکندر، ارباب عبدالغفور خان، غلام محمد لوند خوڑ بھی ہمارے ساتھ ہی تھے - خدائی خدمت گاروں اور عوامی لیگ کی میٹنگ ہوئی - میں اور بنگش عوامی لیگ میں تھے - ہم نے اس مشترکہ اجلاس میں شرکت کی اور وہاں اینٹی ون یونٹ محاذ بنایا - اس تنظیم کے تمام رہنماؤں نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا (جن میں میں اور بنگش بھی شامل تھے) اور ون یونٹ کے خلاف رائے عامہ ہموار کی -

پھر خان عبدالغفار خان اور پیر صاحب مانکی شریف کراچی چلے گئے (اس وقت ڈاکٹر خان صاحب وزیراعلیٰ ون یونٹ بن چکے تھے) اور وہاں سے ون یونٹ کے خلاف تحریک کا آغاز ہوا - مغربی پاکستان کا وزیر قانون شیخ خورشید احمد بنگش کا دوست تھا - بنگش، ارباب سیف الرحمٰن اور امیر زادہ خان کے ساتھ لاہور گئے اور قصوری صاحب کے ہاں ٹھہرے بنگش اور اس کے ساتھی پنجاب اسمبلی گئے اور شیخ خورشید احمد سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ فارغ اور بنگش کے خلاف بہت سے کیس آئے جو اس نے مسترد کر دیئے -

1956ء میں سہروردی وزیراعظم بنا تو اس نے مصر پر فرانسیسی، اسرائیلی حملے کی حمایت کی اور ون یونٹ کی پشت پناہی کے لئے اس کے حق میں نہایت

زہریلا بیان دیا ہم نے اسے بری طرح محسوس کیا اور لاہور ہوٹل میں عوامی لیگ کی پارٹی کی میٹنگ ہوئی - جسمیں ہم نے سہروردی کو پارٹی سے نکال دیا اور متوازی عوامی لیگ بنالی -

مولانا بھاشانی بھی سہروردی سے ناراض تھے ہم نے مولانا بھاشانی، غفار خان، میاں افتخار الدین سب کو اعتماد میں لے کر یہ کارروائی کی تھی - خان عبدالغفار خان جیل سے رہا ہوئے تو ہم نے پارٹی کی طرف سے ان کا شاندار استقبال کیا - پچیس جولائی 1957ء میں مولانا بھاشانی نے ڈیمو کریٹیک کانفرنس بلائی جس میں مغربی پاکستان سے میں افضل بنگش، خان عبدالغفار خان، ارباب سکندر اور پیر مانکی شریف ڈھاکہ گئے - جہاں شاندار کنونشن ہوا اور اس کے بعد پلٹن میدان میں عظیم الشان جلسہ عام ہوا - عطاء الرحمٰن اور شیخ مجیب الرحمٰن وزیر تھے - انہوں نے جلسے میں گڑ بڑ کرانے کی پوری تیاری کی ہوئی تھی - پلٹن میدان کے سامنے گلستان سینما تھا وہاں شیخ مجیب الرحمٰن بیٹھا ہوا جلسہ گاہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور وائرلیس سیٹ اس کے پاس تھا - مولانا بھاشانی کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا - ارباب غفور تلاوت کر رہا تھا کہ ڈنڈے برسنے لگے - سٹیج کے نیچے جلسہ گاہ کے کارکنوں نے بھی ڈنڈے رکھے ہوئے تھے چنانچہ رضا کاروں نے ان کا مقابلہ کیا اوراس طرح شیخ مجیب کے غنڈوں کو بھاگنا پڑا -

ہم واپس آئے تو نیشنل پارٹی کے کام میں لگ گئے - اس کا دستور بنایا گیا منظوری لی گئی اور الیکشن کرایا گیا - کوہاٹ کے الیکشن کا انچارج میں، افضل بنگش اور ماسٹر خان گل تھے - ارباب غفور نے بنگش کو صوبائی کونسل سے ہٹا کر سیکرٹری جنرل بنا دیا - بنگش نے دورے کئے اور بڑے کامیاب جلسوں سے خطاب کیا - کوہاٹ سے واپسی پر آٹھ اکتوبر کو ایوب خان نے سول حکومت کا تختہ الٹ کر مارشل لاء لگا دیا اور ہماری سرگرمیاں انڈر گراؤنڈ جاری رہیں -

جب ایوب خان نے الیکشن کا اعلان کیا - بھاشانی نے ایوب خان کے خلاف فاطمہ جناح کا نام پیش کیا - سرحد میں ہم نے میٹنگ کی اور افضل بنگش کے ذریعے بھاشانی کو اپنی پر زور تائید بھجوائی - چوہدری محمد علی نے جنرل اعظم خان کا نام پیش کیا - جماعت اسلامی نے سخت مخالفت کی کہ عورت کسی جماعت یا ملک کی سربراہ نہیں ہوسکتی - لیکن فاطمہ جناح کے الیکشن لڑنے اور صدارتی انتخاب کے مقابلے کا قوم نے فیصلہ کرلیا تھا - ایوب خان کی ساری حکومتی مشینری حرکت میں آگئی اور ایسی دھاندلی کی گئی کہ جس کی مثال نہیں ملتی - الیکشن کے دوران محترمہ فاطمہ جناح پشاور بھی آئیں - جناح پارک میں دھڑلے کا جلسہ ہوا اس جلسے کا انتظام و انصرام ہمارے اور حفاظتی انتظام افضل بنگش کی زیر نگرانی ہوئے اور ان کے الیکشن میں بھی سب کچھ بنگش نے ہی کیا - اس جلسے کی تاریخی تقریر کا برجستہ ترجمہ افضل بنگش نے کیا -

فاطمہ جناح کو ناکام بنانے کے لئے صدر ایوب نے ابلیسانہ حربے استعمال کئے

- وہ بانی پاکستان کی ہمشیرہ تھی - ووٹوں کے باکس توڑے گئے - ہر پولنگ سٹیشن پر جہاں جہاں بھی پورے پاکستان میں لوگ پرچی لے کر ووٹ ڈالنے جاتے انہیں مایوس لوٹنا پڑتا - کیونکہ ان سے پہلے ہی ان کے ووٹ پول ہو جاتے تھے اور پھر ان سفاک لوگوں نے الیکشن جیتنے کے نشے میں' شرابوں کے نشے میں دھت ہوکر کراچی میں ایک کتیا کو جیپ کے پیچھے باندھ کر پورے شہر میں گھمایا اور اس کی پشت پر فاطمہ جناح لکھ کر لگادیا - یہ تاریخ کا ایسا شرمناک واقعہ ہے جس کی شاید ہی کوئی مثال ملے -

لوگوں نے مزاحمت کی تو انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا - اسی واقعے کے بعد اس نیک خاتون کا انتقال ہوا -

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

1967ء میں بنگش اور اجمل خٹک جشن افغانستان میں شرکت کے لئے افغانستان گئے - وہاں ولی خان اور مہدی شاہ بھی موجود تھے - یہ سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے - اجمل خٹک غسل خانے گیا تو بنگش نے ولی خان سے کہا اجمل کو جنرل سیکرٹری ہونا چاہئے - لیکن وہ نہیں مانتا تم اسے مجبور کرو تو شاید وہ مان جائے دوسرا یہ کہ اس سال گنے کی فصل جل گئی ہے زمیندار پریشان ہیں - غلام محمد لوند خوڑ نے کسانوں کے خلاف کانفرنس بلائی ہے یہ بڑی زیادتی ہے - یہ سن کر ولی خان بولا اس کانفرنس کے لئے تو ارباب سکندر اور میں نے بھی چندہ دیا ہے -

عذر گناہ بد تر از گناہ

اگلے مہینے ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ تھی اس میں اچانک سوال کیا گیا کہ ہماری پارٹی کے لوگ لوند خوڑ سے تعاون کرتے ہیں حالانکہ وہ ہمارا سب سے بڑا مخالف ہے - جو ہمارے خلاف شب و روز پروپیگنڈہ کرتا ہے - صدیق نے کہا ہمیں لوند خوڑ کی مخالفت کرنی چاہئے اور اس کے ساتھ ہی ہمیں نیشنل پارٹی کی طرف سے کسانوں کے مسائل بھی اٹھانے چاہئیں - افضل خاموش رہا وہ چاہتا تھا

کہ پارٹی کے دائیں یا بائیں بازو کے اراکین اس کی مخالفت کریں - دوسرے دن پارٹی کی میٹنگ میں بحیثیت جنرل سیکرٹری یہ فیصلہ منظوری کے لئے بنگش نے پیش کیا جو کچھ لوگوں کی مخالفت کے باوجود منظور ہوگیا - بنگش نے پریس میں یہ خبر دے دی اور اس کی کاپی لوند خوڑ کو بھیج دی - لوند خوڑ نے ولی خان سے شکایت کی کہ یہ بنگش کا کام ہے - ولی خان نے کہا دونوں اجلاسوں میں ہم موجود تھے - بنگش نے کوئی دخل نہیں دیا یہ تو صدیق خان احمق کا کام ہے -

اس نے کہا کہ جاگیر دار و سرمایہ دار کبھی ڈی کلاس نہیں ہو سکتے - ماسک چہروں پر لگا کر عوام کو دھوکا دیا جا رہا ہے - جب ذرا ان کی دم پر پاؤں پڑے تو ان کی عوامیت کی ساری پھونک نکل جاتی ہے -

اس کے بعد افضل بنگش نے ہم سب کو بلایا اور مزدور کسان پارٹی بنا لی - اس پارٹی نے اتنی طاقت حاصل کرلی کہ مزارعین نے زمینوں پر قبضہ کرلیااور خوانین کی ساری پھونک نکال دی - جب یہ ہوا تو یہاں کے تمام جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کی ایک میٹنگ بلائی گئی جس میں انہوں نے واویلا مچایا کہ مزارعے تو ہماری زمینوں پر قبضہ کر بیٹھے ہیں - اب کیا کیا جائے اور آخر فیصلہ ہوا کہ چندہ اکٹھا کرکے اجرتی قاتلوں کو پیسہ دے کر کسانوں کو بے دخل کرنے کے لئے استعمال کیا جائے -

چنانچہ یہی ہوا کہ پارٹیوں کے جاگیردار اکٹھے ہوگئے اور اجرتی قاتلوں کو اسلحہ

سے لیس کر کے کسانوں پر ٹوٹ پڑے ہشت نگر سے لے کر سوات تک کسان متحد ہو چکے تھے خوانین کو بھگا دیا گیا اور خوانین کی حویلیوں پر کسانوں نے قبضہ کر کے اپنے ہیڈ کوارٹر بنا لیے۔

یہ بھٹو صاحب کا دور تھا۔ ہشت نگر کی تحریک نے کسانوں کو ایک نیا حوصلہ اور ولولہ دیا اور بنگش نے کسانوں کو اتنا منظم کر دیا کہ پشاور میں جب قصہ خوانی بازار میں کسانوں کی ریلی منعقد ہوئی تو دو میل تک سرخ لاٹھیاں ہاتھوں میں لئے۔ منظم کسانوں کے دستے عجیب رنگ جما رہے تھے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ افضل بنگش اور مزدور کسان پارٹی نے سرحد سے خان ازم کا جنازہ نکال دیا۔

اس دوران میں نے افضل بنگش سے کہا کہ اب عملی سیاست مجھ سے ہونی مشکل ہے میں اپنے ادبی محاذ کو ہی قابو میں رکھوں تو بڑی بات ہے۔ بنگش رضا مند ہو گیا اور اس کے بعد میں نے تقریباً عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

قمر عباس (میرا منجھلا بیٹا) اب سٹوڈنٹس پالیٹکس میں وارد ہو چکا تھا وہ بھٹو کا شیدائی اور پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ممبر (یہ مزدور کسان پارٹی کی طلبہ کی تنظیم تھی) تھا۔ حیات شیرپاؤ مرحوم سے اس کی گہری دوستی تھی اور وہ دن رات سیاست میں مصروف رہتا۔ پھر الیکشن ہوئے اور پیپلز پارٹی برسر اقتدار آگئی ۔ حیات شیرپاؤ ایک نوجوان لیڈر ابھر کر آیا اور سرحد کی سیاست پر چھانے لگا۔ ایک دن اچانک بم کا ایک دھماکہ ہوا اور شیرپاؤ شہید کر دیا گیا۔ نصر اللہ خٹک کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا اور قمر عباس کو پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن سرحد کا چیئرمین۔ لیکن شیرپاؤ گروپ میں ہونے کی وجہ سے نصر اللہ خٹک اور اس کے درمیان نہ بن سکی اور پشاور کے پی پی پی کے کنونشن میں اس نے بھٹو صاحب کے سامنے نصر اللہ خٹک کے وہ لتے لئے کہ بھٹو صاحب کے جانے کے فوری بعد اسے گرفتار

کر لیا گیا - اب عجیب صورتحال تھی پارٹی کے دور میں قمر عباس گرفتار اور کسی کو علم نہیں کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے - میں نے ہائی کورٹ میں رٹ کی تو پندرہ دن کے بعد اسے پیش کیا گیا اور پھر جیل بھیج دیا گیا - بہر حال بھٹو صاحب کو پتہ چلا تو اس کے حکم سے اسے رہا کر دیا گیا اب سیاست کا عملی میدان مستقل طور پر قمر عباس کے حوالے ہو چکا تھا - قمر عباس نے مجھے بھی دو ہاتھ پیچھے چھوڑا اور اتنی دفعہ جیل یاترا کی کہ شاید اسے بھی یاد نہ ہو -

ہاں جب ایوبی مارشل لاء کے دوران بھٹو کی تحریک شروع ہوئی تو میں نے مارشل لاء کے خلاف لکھنا شروع کیا - جنرل شیر علی خان ان دنوں وزیر اطلاعات تھا اور پیپلز پارٹی کا نوجوان اور شیردل رہنما حق نواز گنڈا پور شہید کر دیا گیا - پورے ملک میں اس کا چرچا تھا کہ اسے حکومت نے مروایا ہے میں نے ارشاد راؤ کے ترقی پسند مجلے "الفتح" میں ایک نظم لکھی - جو یوں تھی -

قاتلو حساب دو

گنڈا پور کا لہو رائیگاں نہیں جائے گا
بے گناہ کا خون ہے اپنا رنگ لائے گا
ایک دن ضرور یہ کوئی گل کھلائے گا
بانیان ظلم کو خاک میں ملائے گا

قاتلو حساب دو

ناصر و ظہیر کا مولوی فقیر کا
سانگھڑ کبیر کا جنگ کاشمیر کا
حاکم شریر کا شیر علی وزیر کا

ایک ایک زخم کا ایک ایک تیر کا
قاتلو حساب دو

قوم کے عتاب سے بچ کے جاؤ گے کہاں
حشر احتساب سے بچ کے جاؤ گے کہاں
قاتلو حساب سے بچ کے جاؤ گے کہاں
خونی انقلاب سے بچ کے جاؤ گے کہاں
قاتلو حساب دو

راستوں کے پیچ و خم کوئی دن کی بات ہے
کھل رہے گا یہ بھرم کوئی دن کی بات ہے
یہ جفائیں یہ ستم کوئی دن کی بات ہے
فیصلہ کریں گے ہم کوئی دن کی بات ہے
قاتلو جواب دو
خون کا حساب دو

اس نظم کا شائع ہونا تھا کہ پورے ملک میں قاتلو جواب - خون کا حساب دو کا نعرہ چل پڑا - مجھے گرفتار کر لیا گیا - رسالہ ضبط کر لیا گیا اور فوجی عدالت سجا لی گئی - ایک ماہ کیس چلا اور کرنل صاحب نے مجھے ایک سال قید با مشقت کی سزا سنا کر جیل بھجوا دیا - اب پورے ملک میں رہائی کے مطالبے ہونے لگے اور جلسے جلوسوں میں میری رہائی کے نعرے لگنے لگے تحریک عروج پر پہنچی - معراج محمد خان' طارق عزیز' کوثر نیازی اور کئی دوسرے لوگ بھی گرفتار کر لئے گئے لیکن بھٹو کی سحر انگیز شخصیت نے تحریک کو اختتام تک پہنچا کر دم لیا - ایوب خان چلے گئے اور یحییٰ خان برسر اقتدار آگیا - اس نے الیکشن کرایا - انتقال اقتدار

نہ ہو سکا ملک دولخت ہوا اور مغربی پاکستان بھٹو کے حوالے کر دیا گیا۔

بھٹو کے برسر اقتدار آنے کے بعد جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے ایک دفعہ پھر سازش کر کے بھٹو کی پارٹی کو ہائی جیک کیا اور وہ نظریات پس پشت چلے گئے جبکہ نعرہ روٹی، کپڑا اور مکان پر عوام نے تحریک چلائی تھی۔ بھٹو کا سب سے بڑا کارنامہ متفقہ آئین اور عوام کو شعور دینا تھا۔ شیخ رشید کے ذریعے زرعی اصلاحات میں خوانین سے جو زمینیں چھین کر کسانوں میں تقسیم کی گئیں وہ اس کی حکومت کاایک دوسرا روشن باب تھا۔ بہر حال فوجی جنتا اور سرمایہ داروں، جاگیرداروں کو یہ کم سے کم بھی گوارا نہ تھا انہوں نے پارٹی پر قبضہ کرنے کے بعد شاطرانہ چالیں چلیں اور اس عظیم لیڈر کو پھانسی چڑھا دیا۔

پھر ملک پر ایک عفریت کی طرح ضیاء الحق مسلط ہوا۔ یہ دروغ گوئی، ڈکیٹیٹر شپ، ظلم، جبر اور قہر کی علامت بن کر ملک پر نازل ہوا۔ امریکہ کو افغانستان میں روس سے بدلہ لینا تھا اور ضیاء الحق اس کا ایسا مہرہ بنا جس نے بارہ سال کوڑوں، پھانسیوں، جیلوں کو محب وطن اور جمہوریت پسندوں کی آماجگاہ بنا دیا۔ ضیاء الحق کے دور میں پیپلز پارٹی اور ترقی پسندوں کی جدوجہد ایک علیحدہ باب ہے جس پر ملک بھر میں ہزاروں کتابیں شائع ہوئیں۔ لیکن میرا خاندان قمر عباس کی وجہ سے ان بارہ سالوں میں انگاروں میں دہکتا رہا۔ پانچ سال تک قمر عباس کو جیل میں رکھا گیا۔ روزانہ ملٹری کورٹس سے اس کی پیشیاں مجھے بھگتنی پڑیں اور کئی دفعہ اسے قید اور کوڑوں کی سزائیں سنائی گئیں۔ گھر پر آئے دن چھاپے پڑتے اور سی آئی ڈی کے اہلکاروں کے مستقل ڈیرے ہمارے گھر میں لگ گئے۔ ان تمام مصائب میں ایک ایسا واقعہ ہوا۔ جسے میں زندگی بھر نہ بھلا سکوں گا۔

یہ 1981ء کی بات ہے قمر عباس آٹھ فروری 81ء سے انڈر گراؤنڈ تھا

اس کے روپوش ہونے کا ہمیں علم تھا لیکن ہم بھی اس بات سے لاعلم تھے کہ وہ کہاں ہے - دراصل ایم آر ڈی کے تحت پیپلز پارٹی کے ساتھ ملک کی چند سیاسی جماعتوں نے متحد ہو کر فیصلہ کیا کہ ملک سے مارشل لاء ہٹانے' جمہوریت بحال کرنے اور 73ء کے آئین کے تحت انتخابات کرانے کے لئے تئیس مارچ 1981ء کو پورے ملک میں تحریک کا آغاز کیا جائے -

تئیس مارچ وہ اہم تاریخ ہے جب لاہور میں قیام پاکستان کی قرارداد پاس کی گئی تھی - اس سیاسی اتحاد میں پیپلز پارٹی کے علاوہ نیشنل عوامی پارٹی - تحریک استقلال نوابزادہ نصر اللہ خان کی پارٹی' مزدور کسان پارٹی' معراج محمد خان کی پارٹی' سردار ابراہیم کی پارٹی اور سردار عبدالقیوم کی پارٹی شامل تھی -

مارشل لاء گورنمنٹ کی ایم آر ڈی پر کڑی نظر تھی۔ جس کا انتخاب ہوتے ہی تمام سرکردہ سیاسی زعماء کو نظر بند کر دیا گیا - اس کے باوجود ان کے اجلاس بڑے پر اسرار طور پر ہوتے رہے' تحریک چلانے کے تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے -

مارشل لاء گورنمنٹ کو بڑی تشویش تھی اور وہ تحریک کو سبو تاژ کرنے کے لئے منصوبے بنانے میں مصروف تھی - آٹھ فروری کو صوبائی اور مرکزی سطح پر تمام پیپلز پارٹی کے صف اول کے لیڈروں کو حراست میں لے کر تین ماہ کے لئے جیلوں میں بھیج دیا گیا - قمر کا انڈر گراؤنڈ ہونا اسی سلسلے کی کڑی تھی وہ تحریک شروع ہونے پر جلسے جلوس میں گرفتاری دینا چاہتا تھا - پولیس کا دباؤ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا - روزانہ ایس پی' ڈی ایس پی گھر پر دن میں دو دو تین تین بار چھاپے مارتے - بعد میں وہ ناکام ہونے پر مجھے اور طاہر عباس کو گرفتار کرنے کی دھمکیاں دیتے رہتے - دن گزرتے گئے وہ روپوش رہا - پولیس اپنے تمام ذرائع اور کوششوں کے باوجود اس کا کھوج نہ لگا سکی - فضل حق گورنر تھا اس

نے حکم دے رکھا تھا کہ ہر قیمت پر قمر عباس کو گرفتار کیا جائے۔
اسی اثناء میں ایک ناخوشگوار واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ پاکستان کا پی آئی اے کا ایک پسنجر طیارہ جو شام کی پرواز لے کر کراچی سے پشاور آرہا تھا۔ تین ہائی جیکروں نے اغواء کر کے کابل پہنچا دیا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ کچھ قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ اس طیارے میں سوار ایک مسافر کو جو سابق فوجی تھا قتل کر دیا گیا پھر وہ طیارے کو شام لے گئے حکومت سے سودا بازی جاری تھی آخر چون قیدیوں کو رہا کر کے مارشل لاء حکومت نے مسافروں اور طیارے کو واگزار کرالیا
۔

یہ کارروائی کن لوگوں کی تھی اور ایسے نازک موقع پر جبکہ ایک نہایت قومی اور موثر تحریک شروع ہو رہی تھی یہ قدم کیوں اٹھایا گیا یہ سب باتیں بڑی حیران کن تھیں۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ اگر وہ سیاسی لوگ ہوتے تو جمہوریت' انتخابات اور مارشل لاء ہٹانے کا مطالبہ کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کو تحریک کچلنے کا بہانہ ہاتھ آگیا اور اس نے بڑی قوت اور بے رحمی سے وسیع پیمانے پر گرفتاریاں کر کے تحریک کو ختم کر دیا۔
اب قمر کے انڈر گراؤنڈ رہنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا۔ تیئس مارچ کو لوھر لاہور میں ہماری اہل قلم برادری کا نہایت وسیع پیمانے پر کنونشن ہو رہا تھا میری شمولیت ضروری تھی اور خطرہ بھی تھا کہ ہم لوگ وہاں گرفتار ہو جائیں گے۔ میں اکیس مارچ کو لاہور چلا گیا میرے جاتے ہی پولیس نے میرے چھوٹے بیٹے طاہر عباس کو گرفتار کرلیا قمر کو پتہ چلا تو اس نے گرفتاری دے دی۔
چوبیس مارچ کو کرنل نصر اللہ کی ملٹری کورٹ سے اس کا چھ دن کا جسمانی ریمانڈ لے لیا گیا اور اس کو قلعہ بالا حصار کے عقوبت خانے میں انٹیروگیشن کے لئے لے جایا گیا۔ اکتیس مارچ کو اسے پھر ریمانڈ کے لئے پیش کیا

گیا اور ملٹری کورٹ نے انہیں مزید سات روز کا ریمانڈ ۔ ۔ دیا اور پھر قلعے پہنچا دیا گیا - سات اپریل کو ریمانڈ کا یہ ہفتہ بھی ختم ہونے پر اسے مارشل لاء کورٹ لایا گیا اور تین دن کا اور ریمانڈ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس دوران قمر کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی اور اصولاً چودہ روز سے زیادہ ریمانڈ بھی ضابطے کے خلاف تھا اس لئے کرنل نصر اللہ نے مزید ریمانڈ نہیں دیا اور اسے جیل بھجوا دیا گیا - جب سے وہ گرفتار ہوا خاندان کا کوئی فرد اس سے ملنا تو کجا اسے دیکھ بھی نہ سکا - اس کے متعلق نہایت تشویش ناک خبریں آتی رہیں -

اسے عقوبت خانوں میں شدید اذیت پہنچائی جا رہی ہے -

اس نے پانچ دن سے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے -

اسے چار دن تک سونے نہیں دیا گیا -

اسے شدید ضربات پہنچائی گئی ہیں -

لیکن ہم بے بس تھے - انصاف کے تمام دروازے بند تھے - کوئی فریاد سننے والا نہ تھا - کوئی انصاف دینے والا نہ تھا - ہمارا سارا خاندان سولی پر لٹکا ہوا تھا - وہ ایک ہر دلعزیز سیاسی لیڈر تھا - بے لوث، مخلص، عوام کا محبوب - اسی لئے سارا پشاور اس کے لئے اداس تھا -

اس دوران اکتیس مارچ کو پولیس نے بھاری تعداد میں گھر پر چھاپہ مارا - میں جب گل بہار میں داخل ہوا تو لوگوں نے گھبرا کر مجھے گھر نہ جانے کو کہا - میں نے سوچا گھر اکیلا ہے اس لئے فوراً پہنچا دیکھا کہ میری بیگم دروازے میں دونوں ہاتھوں سے دروازہ پکڑے کھڑی ہے اور پوری پولیس کی گارڈ کو کہہ رہی ہے کہ زنانہ پولیس کے بغیر وہ انہیں گھر میں گھسنے نہیں دے گی اس اثناء میں ایک اے ایس آئی نے اس کے پیٹ میں بندوق کا بٹ مارا اور جب وہ گری تو میں وہاں پہنچا پولیس اس اثناء میں اندر داخل ہو چکی تھی - چھ گھنٹے تک گھر کی

تلاشی لیتے رہے لیکن کچھ بر آمد نہ ہوا۔

چھ اپریل کو پورے شہر میں خبر گرم تھی کہ قمر کو رات لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں لایا گیا۔ وہ بے ہوش تھا اور زخمی تھا او رخون بہہ رہا تھا۔ ظاہر ہے اس خبر پر ہم بہت پریشان ہوئے لیکن ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسی رات بی بی سی نے پورا خبر نامہ قمر پر نشر کیا اور تبصرہ بھی اسی پر تھا۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس نے خون کی قے کی ہے اور اسے مسلسل ٹارچر کیا جا رہا ہے اور ہسپتال میں ڈاکٹر کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ غسل خانے میں گر گیا تھا۔ بی بی سی کی یہی خبر وائس آف امریکہ۔ وائس آف جرمنی اور انڈیا سے بھی نشر کی گئی۔ تہران اور آسٹریلیا کی خبریں زیادہ تشویش ناک تھیں یعنی یہ کہ اسے زہر دیا گیا ہے اور وہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔

ہمارے پاس اصل صورت حال حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ پھر ٹیلی فون پر پورے ملک سے افسوس کی خبریں آنے لگیں۔ پشاور میں اس کی موت کی خبر پھیل گئی۔ زن و مرد گھر پر ٹوٹ پڑے اسی دوران گیارہ مارچ کو اسے پشاور ہسپتال بھیجا گیا کیونکہ جیل کے ڈاکٹر نے اس کی نازک صورت حال کی وجہ سے اسے جیل میں رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے سر پر زخم تھے۔ اس کی انتڑیوں میں زخم ہو چکے تھے غرض جسم کا کوئی حصہ ٹھیک حالت میں نہ تھا۔

پشاور بار ایسوسی ایشن اور بیگم نسیم ولی خان نے قرارداد مذمت اور بیان دیا جسمیں تمام قانون دانوں اور سیاست دانوں نے اس بہیمانہ رویئے پر افسوس کا اظہار کیا۔ بہر حال ایک سال تک قمر جیل کے ہسپتال میں رہا۔

اس دوران اٹھارہ جولائی کو میرے داماد ممتاز علی آخونزادہ کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ حادثے کا شکار ہوا۔ یہ ہم سب کے لئے عظیم المیہ تھا لیکن قمر کو اس کا منہ دیکھنے کی اجازت بھی نہ مل سکی۔

ان پے در پے حادثات سے میں ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اگست میں میں نے اپنی بچی طاہرہ کی شادی امریکہ سے آئے ہوئے دولہا شہزاد کاظمی سے کی اور قمر کی غیر حاضری میں ہی اس کی رخصتی کر دی۔ تاکہ اس آخری فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔

ایک سال بعد قمر جیل سے رہا ہوا تو چھ ماہ تک گھر میں بستر پر پڑا رہا۔ اب اس کے علاج کی مجھے فکر تھی میں نے اس کا پاسپورٹ بنوایا اور اسے امریکہ بھائی ظفر عباس کے پاس علاج کے لئے بھجوا دیا۔ پولیس اور ادارے میرے پیچھے لگ گئے اب میں ان حالات میں پاکستان سے باہر جانا چاہتا تھا اس لئے لندن چلا آیا اور پھر جلا وطنی کے دن شروع ہوئے۔ ایسی جلا وطنی جس میں میری قسمت میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی منانے کا کارنامہ لکھا ہوا تھا۔

زندگی کے مشہور واقعات

یوں تو میری زندگی کے لا تعداد واقعات ایسے ہیں جن سے قارئین خاصے لطف اندوز ہو سکتے ہیں لیکن طوالت کی وجہ سے چند ایک آپ کو سنائے دیتا ہوں۔

لندن میں جب میں جلا وطنی کے دن گزار رہا تھا میں وقت گزارنے کے لئے اکثر پکاڈلی چلا جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہاں میرا ایک سوسائٹی گرل "لورا" سے تعارف ہوا۔ وہ ادب و شعر کی رسیہ تھی اور سوسائٹی گرل ہونے کے باوجود اس میں اور مجھ میں قدر مشترک یہ تھی کہ اسے بھی کھیتوں میں لہلہاتے سبزے سے عشق تھا اسے بھی ٹیولپ کے پھول اچھے لگتے تھے۔ اسے بھی سپیدہ سحر کے ساتھ چڑیوں کا چہچہانا پسند تھا۔ اسے بھی چاندنی راتوں میں چاند کے بادلوں کے پیچھے چھپ جانے سے عشق تھا۔ اسے بھی بھوک سے کراہتی انسانیت بری لگتی تھی اسے بھی نام نہاد سچائی کے معیار (جو اکثر بعض چالاک لوگ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اپنے ارد گرد بکھرے کمزور لوگوں کا استحصال کرنے کے لئے تراشتے تھے) سے نفرت تھی اور مجھے بھی یہی وجہ تھی جس نے ایک بیس سالہ خاتون کو ایک 68 سالہ بوڑھے سے جوڑ دیا۔ پیکاڈلی کے مقام پر نیم شب میں ٹہلتے ہوئے فٹ پاتھ پر ملنے والی یہ خاتون جب تک میں لندن میں رہا میری گرویدہ رہی یہاں تک کہ وطن واپس آتے وقت میں ڈر کے مارے اسے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ میں واپس جا رہا ہوں لیکن واپس آتے وقت ایئر پورٹ چھوڑتے وقت مجھے دکھ ہوا کہ لورا آج یقیناً" مجھے بھی ان سینکڑوں انسانوں کی

طرح سمجھ رہی ہوگی جو اس کی نظروں سے گر چکے تھے ۔ لورا انگریزی میں لکھتی
اور میں اردو میں اس نے ایک دن ایک نظم لکھی ۔

دوسرا واقعہ میری صحافتی زندگی کے آغاز کا ہے یہ حادثہ یوں ہوا کہ میرا
ایک سکھ کلاس فیلو تھا جس کا نام سردار سوہن سنگھ تھا اس کے باپ سردار
موہن سنگھ کا پشاور میں ایک پریس تھا ۔ ایک دن (جب کہ میں ان دنوں ہائی
سکول کا طالب علم تھا) اپنے دوست کے ہمراہ ایک غزل لے کر اس کے باپ
کے پاس پہنچا کہ وہ اسے اپنے پریس کے ہفت روزہ "کیسر کیاری" میں شائع کر
دیں ۔ اس وقت پرچے کا پروف پریس میں جانے والا تھا میرے دوست کے باپ
نے مجھے کہا کہ ذرا پروف چیک کر دو میں نے پروف دیکھا تو اس میں بہت سی
غلطیاں تھیں ۔ میں نے صحیح کر دیں سردار موہن سنگھ حیران رہ گیا اور کہا کہ
اچھا اس پروف میں اتنی غلطیاں تھیں اب وہ مجھ سے بولا کہ اس ہفت روزہ کا
پروف ہر بار میں چیک کیا کروں اس کے عوض اس نے مجھے اٹھارہ روپے ماہانہ
کی آفر کی ۔ میں جب وہاں سے روانہ ہونے لگا تو سردار جی نے کہا کہ چلو تم
بیس روپے لے لو میں تمہیں اس رسالے کا ایڈیٹر ہی بنا دیتا ہوں میں بدحواس
ہوگیا اور کہا کہ چاچا جی میں تو صحافت کی ابجد بھی نہیں جانتا ۔ پرچہ کیسے نکال
سکتا ہوں ۔ سردار جی کہنے لگا کوئی بات نہیں تم میں کافی صلاحیتیں موجود ہیں خود
ہی سیکھ جاؤ گے اور یوں میں صحافی بن گیا ۔

میں ایک ماضی کی ہمسائی خاصی بزرگ عورت تھی ۔ میں اکثر جب
رمضان میں اس کے گھر جاتا وہ کچھ نہ کچھ کھا رہی ہوتی اور مجھے دیکھتے ہی کہتی
ہائے برا ہو اس حافظے کا روزے کا خیال ہی نہیں رہا اور ساتھ ہی کہتی خیر
ہے بھول چوک سے روزہ نہیں ٹوٹتا اس طرح وہ نجانے کتنی بار روزہ توڑتی اور

پھر بھول چوک کا بہانہ بنا کر روزے کا روزہ رکھتی اور خوجے کا خوجا ہوتا - پھر تماشہ یہ کہ جب آخری روزے کے دن وہ ماں سے باتیں کر رہی ہوتی تو کہتی بس اس بار تو روزوں کا پتہ ہی نہیں چلا میں کہتا ماسی تم نے تمام روزے بھول چوک کے بہانے اتنا کھایا ہے کہ تمہیں بھلا کیا پتہ چلے گا اور وہ ڈنڈا لے کر میرے پیچھے بھاگ کھڑی ہوتی -

منٹو سے میری پہلی ملاقات بھی دلچسپ واقعہ ہے - یہ ملاقات قیام پاکستان کے بعد محمد طفیل مدیر نقوش کی ایک چھوٹی سی دکان ادارہ فروغ اردو میں ہوئی جو ایبٹ روڈ پر واقع ہے میں طفیل کے پاس بیٹھا تھا کہ منٹو جھومتا جھامتا آنکلا - طفیل نے میرا تعارف کرایا لیکن اس نے کوئی لفٹ نہیں دی مجھے بڑی مایوسی ہوئی اور میرا پہلا تاثر اس کے متعلق یہ تھا کہ وہ بڑا مغرور شخص ہے اور بری طرح احساس برتری کا شکار ہے کچھ دنوں بعد ہی گوشہ ادب (انار کلی) میں ملک مبارک علی سے باتیں کر رہا تھا کہ منٹو آن نکلا میں اسے دیکھتے ہی سلام دعا کے بغیر نکل آیا - تھوڑی دیر بعد میں نے اسے بڑے اشتعال میں دکان سے نکل کر جاتے دیکھا - میں نے ملک مبارک علی سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن اس نے خود ہی بتا دیا کہ وہ ایک سو روپیہ مانگنے آیا تھا میں نے انکار کر دیا اور وہ غصے ہو کر چلا گیا - میں نے لعنت' ملامت کی کہ ملک صاحب اسے ضرورت ہوگی تم نے کیوں انکار کیا وہ کہنے لگا ابھی کتاب چھپی نہیں اور ڈیڑھ سو لے جا چکا ہے اور کہاں سے دیتا میں تیزی سے منٹو کے پیچھے لپکا -

وہ ٹانگے میں بیٹھ رہا تھا کہ میں نے اسے جا لیا اپنا تعارف کرایا اس نے پہچان لیا بولا ہاں یاد آیا اس روز عقیل کے ہاں ملاقات ہوئی تھی - میں نے اسے کچھ پیسے دینے چاہے اس نے لینے سے انکار کر دیا میں نے زیادہ اصرار کیا تو

اپنے ساتھ ٹانگے پر بٹھا لیا اور شراب کی دکان پر پہنچ کر ایک بوتل وسکی لی اور کہا اس کو پیسے دو میں نے دے دیئے - رخصت ہونے لگا تو کہا ابھی تمہیں کوئی ضروری کام نہیں تو ہمارے ساتھ چلو میں ساتھ ہو لیا بوتل بغل میں دابتے ہی اس کا موڈ ہرا ہو گیا تھا وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا فضول بکواس بند کرو او رانسانوں کی طرح اپنی پنجابی زبان میں باتیں کرو پھر لکشمی چوک کی بغل کی گلی میں ایک دکان سے شاو امرتسری کو نکالا - شاو کی مختصر بیٹھک میں چند کرسیاں' میز' پانی کا جگ پڑا تھا - منٹو نے بوتل میز پر ٹکا دی اور کہا لو بیٹا جی بھر کے پیئو آج ہم پٹھان کے مہمان ہیں -

ایک دفعہ منٹو ترقی پسند تحریک کے مخالف گروہ میں شامل ہو کر ہمارے خلاف ایک محاذ کھول بیٹھا - احمد ندیم قاسمی جو انجمن کے سیکرٹری جنرل تھے نے منٹو کے نام کھلا خط سنگ میل میں شائع کر دیا - منٹو بگڑ گیا اور مجھ سے خط و کتابت بند کر دی - سنگ میل کے لئے لکھنا بھی چھوڑ دیا میں لاہور گیا تو تنیل شفائی کے ساتھ رائل پارک کے قریب وہ مجھے ملا اور مجھے دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیر لیا مجھے بڑا غصہ آیا - غالباً" دو ماہ بعد اس کا خط آیا کہ سنگ میل کا وہ پرچہ جس میں قاسمی صاحب کا کھلا خط شائع ہوا ہے مجھے بھیج دو میں نے پرچہ ارسال کر دیا - کچھ عرصہ بعد میں ادب لطیف کے دفتر میں مرزا ادیب کے پاس بیٹھا تھا کہ وہ آگیا اور دیکھتے ہی مجھے گلے لگا لیا - سابقہ حرکت پر معافی مانگی اور بتایا کہ مجھے لوگوں نے گمراہ کر دیا تھا - قاسمی سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تم نے وہ خط پڑھا ہے میں نے کہا نہیں اب جو منگوا کر پڑھا تو اس میں کوئی ایسی بری بات نہ تھی پھر کہنے لگا یار میں کانوں کا بڑا کچا ہوں مجھے معاف کر دو -

فیض صاحب کا ایک واقعہ سنئے - یہ غالباً" 71ء کا واقعہ ہے گورنمنٹ کالج پشاور کی سوڈنٹس یونین نے کالج کے مشاعرے میں فیض اور حفیظ جالندھری کو بلوانے کا فیصلہ کیا - میرے بھتیجے مرتضٰی سید نے جو وہاں لیکچرر تھا مجھے کہا کہ آپ فیض صاحب سے بات کریں میں نے فیض صاحب سے بات کی اور انہوں نے وعدہ کر لیا - بڑی ٹھاٹھ کا مشاعرہ ہوا اب بچوں نے فیض صاحب کو جہاز کے واپسی ٹکٹ کے پیسے دینے چاہے تو انہوں نے انکار کر دیا - ادھر حفیظ جالندھری جو ان دنوں حکومت کی طرف سے اسی کام پر مامور تھا کہ وہ تعلیمی اداروں میں جائے اور بچوں کو سیاست سے دور رکھے - بچوں سے کہنے لگاکہ آیا تو میں سرکاری خرچ پر ہوں - کمشنر میرا دوست تھا اس کے پاس قیام کیا - اگر میں وہاں نہ ٹھہرتا تو کسی اعلیٰ ہوٹل میں ٹھہرتا اور اس کا خرچ کم از کم روز کا پانچ سو روپے ہوتا اس لئے تم مجھے پانچ سو کی ادائیگی کر دو اس طرح وہ بلا وجہ پانچ سو روپے لے کر چلتا بنا اب پرنسپل اور سٹاف ان دونوں کا موازنہ کرنے لگے کہ شاہنامہ اسلام کے خالق کا کیا کردار ہے او رایک سوشلسٹ قلم کار فیض کا کیا کردار ہے -

ایک اور واقعہ جو فیض کے آہنی کردار کا آئینہ دار ہے خاصا دلچسپ ہے لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ہو رہی تھی - سٹیج پر پانچ صوبوں کی صدارتی کرسیوں میں سے ایک پر میں بھی فیض صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا - کارروائی ختم ہونے والی تھی کہ شورش کاشمیری مرحوم غنڈوں کا جلوس لے کر جلسے کو درہم برہم کرنے کو آن پہنچا وہ پنڈال کے باہر اشتعال انگیز نعرے لگا رہے

تھے اور دھمکیاں دے رہے تھے - انہوں نے پنڈال میں داخل ہو کر حملہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن رضا کاروں نے مزاحمت کر کے انہیں روک دیا - تھوڑی دیر بعد کانفرنس ختم ہو گئی - باہر مظاہرین کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی دوسرے دوستوں کی طرح ہم بھی ہراساں تھے کہ باہر نکلے تو کوئی تصادم نہ ہو جائے میں نے فیض کی طرف دیکھا وہ ہمیشہ کی طرح خاموش کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا اس کا چہرہ کسی قسم کے جذبات سے بالکل عاری تھا - جیسے اس کے نزدیک یہ کوئی خاص بات ہی نہ ہو - اتنے میں ظہیر کاشمیری گھبرایا ہوا آیا - اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں - چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور رنگ زرد پڑ گیا تھا اس نے فیض کی منت کی کہ مجھے اپنے ساتھ موٹر میں لے جایئے ورنہ میں مارا جاؤں گا فیض نے مسکرا کر کہا میرے ساتھ یہ بھی ہیں لیکن خیر کوئی بات نہیں تمہیں لے جاؤں گا -

فیض صاحب کا ایک واقعہ یہ ہے ایک زمانے میں فیض پوسٹ مین یونین کا صدر تھا یونین کی کانفرنس پشاور میں ہو رہی تھی جس میں فیض کو آنا تھا اس نے مجھے اطلاع دی کہ فلاں تاریخ صبح ریل گاڑی سے پشاور پہنچ رہا ہوں - گرین ہوٹل میں قیام ہوگا - میں مقررہ دن سٹیشن پر پہنچا اور اسے لے کر ہوٹل آیا یہ غالباً لیاقت علی خان کے دور حکومت کی بات ہے - یہ بڑی گھٹن کے دن تھے - انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگ چکی تھی - ہر ترقی پسند دانشور کے پیچھے سی آئی ڈی سائے کی طرح لگی رہتی تھی کچھ دیر بعد فیض کی نظر کھڑکی سے ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص پر پڑی مجھے بلا کر دکھاتے ہوئے پوچھا یہ کون ہے میں نے کہا کرام الکاتبین میں سے کوئی ہوگا اور کون ہو سکتا ہے - فیض مسکرا

کر خاموش ہوگیا - مجھ سے کہا کھڑکی بند کر دو - ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر یونین کے لوگ آگئے ہم ان کے ساتھ پنڈال میں گئے سارا دن کانفرنس کے اجلاس ہوتے رہے شام کو ہم ہوٹل پہنچے وہ شخص بری طرح ہمارا تعاقب کر رہا تھا - کھانا کھانے لگے تو فیض نے کہا اسے بلا لو سارے دن کا بھوکا ہوگا کھانا کھا لے - میں نے اسے جا کر فیض کا پیغام دیا وہ آکر کھانے میں شریک ہوگیا۔ فیض کا شکریہ ادا کیا اور بولا صبح سے پانی تک نہیں پیا کیا کریں جی نوکری ہی ایسی ہے -

احمد ندیم قاسمی صاحب کا ایک واقعہ ہے کہ جس دن قیام پاکستان کا اعلان ہوا اس دن قاسمی صاحب میرے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے وہ بے حد خوش تھے اس وقت ان کا لکھا ہوا ترانہ ریڈیو پاکستان پشاور سے نشر ہوا جسے پہلا پاکستانی ترانہ ہونے کا شرف حاصل ہوا - صوبہ سرحد کے مشہور مسلم لیگی لیڈر عبدالقیوم خان میرے پڑوس میں محلہ خداداد ہی میں رہتے تھے - صبح میں نے قاسمی صاحب سے کہا کہ چلئے قیوم خان کو مبارک باد دے آئیں وہ میرے ساتھ ہو لئے - قیوم خان ایک ہجوم میں گھرے، اپنے حجرے میں بیٹھے، لوگوں سے مبارک باد وصول کر رہے تھے ہم کافی دیر تک انتظار کرتے رہے جب ان کو ملنے والوں سے ذرا فرصت ہوئی تو میں نے قاسمی صاحب کا ان سے تعارف کراتے ہوئے کہا یہ آپ کو مبارک باد دینے آئے ہیں - اس نے کوئی خاص لفٹ ہی نہ دی میں قاسمی صاحب کو وہاں لے جا کر سخت نادم ہوا - اس بد ذوق انسان کو احساس ہی نہ ہوا کہ وہ ملک کے کتنے عظیم ادیب سے مل رہا ہے - ہم اب تک اس واقعے کو یاد کرکے اپنی حماقت پر ہنستے ہیں -

ضیاء جعفری صاحب کے ان گنت واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ ہم سرگودھا سے مشاعرہ پڑھ کر آ رہے تھے نذیر مرزا برلاس ۔ رضا ہمدانی ۔ مرزا محمود سرحدی ۔ خاطر غزنوی ۔ احمد فراز ۔ ضیاء صاحب اور میں انٹر کلاس میں تھے ۔ ایک ڈبے پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے کہ چند نستعلیق قسم کے بزرگ آدھمکے ۔ ضیاء صاحب سیاسی موضوع پر ہم سے متوجہ تھے وہ حضرات ضیاء صاحب کی باتوں سے متاثر ہو کر گفتگو میں شریک ہو گئے ۔ مرزا محمود نے پشتو میں ضیاء صاحب سے کہا یہ کیا مصیبت ہے کمبختوں نے رنگ میں بھنگ ڈال دی ۔ سفر کا سارا مزہ کرکرا کر دیا ۔ ضیاء صاحب پشتو ہی میں بولے بھگا دوں انہیں ۔ ہم نے کہا یہ کمال دکھائیں تو سبحان اللہ ۔ بولے اچھا تو پھر دیکھو ۔ یہ کہہ کر پھر ان سے مخاطب ہوئے ۔ آپ کہاں جا رہے ہیں مشغلہ کیا ہے انہوں نے تفصیل سے اپنے متعلق بتانے کے بعد ضیاء صاحب سے پوچھا آپ کہاں جا رہے ہیں اور کیا کام کرتے ہیں ۔

ضیاء صاحب کے چہرے پر شرارت کی پھول جھڑیاں چھوٹنے لگیں ۔ بولے ہم پشاور کے مشہور قوال ہیں اور سرگودھا میں ایک شادی پر قوالی کر کے آ رہے ہیں ۔ ہم سب سوٹ بوٹ پہنے ہوئے تھے انہوں نے حیرت سے پوچھا آپ قوال ہیں؟ جی ہاں آپ نے نام تو سنا ہو گا " برلاس اینڈ پارٹی " کہئے تو آپ کو کچھ سنائیں ۔ انہوں نے کہا بسم اللہ نیکی اور پوچھ پوچھ ضیاء صاحب بولے سازوں کو تو اب کھولنا مشکل ہے ان کے بغیر ہی کچھ سن لیجئے یہ کہہ کر ہمیں آنکھ ماری اور کان پر ہاتھ رکھ کر اپنی بھدی آواز میں ایک لمبی تان کھینچی اور پھر مصرع اٹھایا ۔

یا محمدؐ تیرے در کے چاکر ہیں ہم

ہم سب نے ان کی آواز میں آواز ملائی اور تالیوں کی گونج میں وہ دھما چوکڑی مچائی کہ وہ بدحواس ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے یہاں تک کہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بس بس شکریہ شکریہ کی رٹ لگا دی۔ لیکن ہم کہاں چپ ہونے والے تھے۔ ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری قوالی اور ساتھ وہ سمع خراش تانیں کہ الامان و الحفیظ۔ اگلے سٹیشن پر گاڑی رکتے ہی وہ شریف لوگ غالباً ہمیں پاگل سمجھتے ہوئے سامان اٹھا کر دوسرے ڈبے کی طرف بھاگے اور ہماری یہ حالت کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

مرزا ادیب کا ایک لطیفہ ہے کہ مشرقی پاکستان ڈھاکہ میں رائٹرز گلڈ کے اجلاس میں جا رہے تھے۔ مرزا کا جہاز میں غالباً یہ پہلا سفر تھا۔ جہاز میں میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ چائے پینے کے بعد انہیں پیشاب کی حاجت ہوئی تو میں نے ان کو غسل خانہ بتادیا۔ وہ گئے اور پھر واپس آکر بیٹھ گئے میرے پوچھنے پر کہا " اندر کوئی ہے " تھوڑی دیر بعد دوبارہ گئے اور پھر لوٹ آئے کہ اندر کوئی ہے۔ مجھے شک ہوا میں انہیں ساتھ لے کر گیا دروازہ کھولا اندر کوئی نہیں تھا۔ دراصل اندر بڑا شیشہ لگا ہوا تھا مرزا صاحب اپنی ہی شکل دیکھ کر واپس آجاتے اور کہتے اندر کوئی ہے۔ بعد میں یہ مرزا صاحب کی چڑ بن گئی " اندر کوئی ہے "

جیسا کہ سب کو معلوم ہے احمد فراز کی بذلہ سنجی اس کے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔ وہ اپنے چٹکلوں، لطیفوں اور فقرہ بازی سے محفل کو زعفران زار بنا دیتا ہے اور بڑے بڑے منہ پھٹ حضرات کا قافیہ تنگ کر دیتا ہے۔ کوئٹہ میں ایک مشاعرہ تھا اور ایک بے سرا شاعر نہایت ہی بھونڈے ترنم سے اپنی غزل بنا

رہا تھا۔ حاضرین اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ صدر جلسہ نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ پوری غزل سنا کر ہی ٹلا۔ مشاعرہ ختم ہوا تو فراز نے اسے بلا کر کہا "آپ کے خلاف" "ترنم" لکھیں رجسٹرڈ ہو گیا ہے۔ جو لوگ کراچی کے مشہور ترنم لکھیں کے پس منظر سے واقف ہیں وہ اس کی بلاغت کو سمجھ گئے ہوں گے۔

خاطر غزنوی چین سے چینی زبان کا ماہر بن کر آیا تو یونیورسٹی میں چینی زبان سکھانا بھی اس کی ذمہ داریوں میں سے ایک بن گئی ایک دفعہ قصہ خوانی میں اپنے ایک دوست کی دکان پر بیٹھا تھا کہ دوست کسی کام کے لئے اٹھ کر باہر گیا اور یہ حسب عادت دکانداری میں دلچسپی لینے لگا اسی اثناء میں دکان کے باہر ایک شخص اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ خاطر نے ایک ماہر دکاندار کی طرح اس سے پوچھا کیا چاہئے وہ قریب ہو کر کہنے لگا چاہئے تو کچھ نہیں ایک بات پوچھتا ہوں آپ کا کوئی بڑا بھائی ہے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا کتنی عجیب بات ہے میرے بچے کا چینی کا پروفیسر ہو بہو آپ کی شکل کا ہے۔

جوش ملیح آبادی صاحب کی آخری ملاقات مجھے زندگی بھر نہ بھولے گی۔ ہوا یوں کہ قتیل شفائی پشاور آیا تو بولا جوش صاحب سے مل کر آ رہا ہوں گھٹنوں نے معذور کر دیا ہے۔ چلنے پھرنے کے نہیں رہے۔ قتیل جانے لگا تو میں بھی جوش صاحب کو دیکھنے پنڈی چلا گیا وہاں اگلے دن پہنچا اور تقریباً" تین گھنٹے ان کے پاس بیٹھا رہا' احمد فراز بھی میری تلاش میں وہاں آ پہنچا۔ جوش صاحب کو دیکھ کر بڑی پریشانی ہوئی۔ سماعت نہیں رہی تھی۔ بہت مشکل سے سنتے تھے۔ بینائی کمزور ہو گئی تھی اور یادداشت نے جواب دے دیا تھا۔ گھٹنوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بے ساکھیوں کے سہارے رفع حاجت کے لئے جاتے تھے۔ لیکن رنگ و روغن میں ذرا فرق نہ آیا تھا۔ مہاتما بدھ کے مجسمے کی طرح تخت پر

سنگھاسن جمائے بیٹھے تھے۔ ان کی بیٹی بیٹا اور داماد بھی موجود تھے۔ اس حالت میں بھی خوش طبعی اس قدر برقرار تھی کہ ہمیں دیکھ کر کھل اٹھے۔ خوب چہکتے رہے۔ میں نے حسب عادت کچھ پوچھنا چاہا لیکن ان کی ہمشیرہ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ شاید اس لئے کہ وہ ٹی وی والے جوش کے انٹرویو کی پہلے ہی کافی سزا بھگت چکے تھے۔ وہ انٹرویو کسی نیاز مند نے اس یقین دہانی پر لیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد نشر کیا جائے گا لیکن ہوا یہ کہ وہ مخالفین کے ہتھے چڑھ گیا جو ان سے اختلاف رکھنے والے انسانوں کا دانہ پانی بند کرکے انہیں بھوکوں مارنا عین اسلام سمجھتے ہیں۔ اسے کچھ ہی دن پہلے نشر کرکے مخالف پریس میں ان پر خوب کیچڑ اچھالا گیا اور حکومت کو اکسایا گیا کہ اس اسلامی ملک میں وہ ایک ملحد کو کیوں پال رہی ہے۔ فوراً اس کا وظیفہ بند کیا جائے بنگلہ خالی کرایا جائے اور اسے اور اس کے بچوں کو ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لئے فٹ پاتھ پر ڈال دیا جائے۔ بہر حال بیٹی کے کہنے پر میں خاموش ہوگیا۔ اس اثناء میں وہ خاموشی سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے غالباً وہ معاملے کی تہہ پر پہنچ گئے تھے کیونکہ اچانک انہوں نے ہمیں مخاطب کرکے فارسی میں صائب کا یہ بر محل شعر پڑھا۔

گفتار صدق مایہ آزار می شود
چوں حرف حق بلند شود دار می شود

میرا اور فراز کا دل بھر آیا اور ہم وہاں سے چلے آئے۔

پشتو کے عظیم شاعر، سمندر خان سمندر سے ایک دفعہ میں نے پوچھا آپ نے جادوگری یا مداری کا کام کیسے سیکھا۔ وہ کہنے لگے کہ ایک دفعہ جادوگری کا ماہر "ہنڈ کف کنگ" جو آسٹریلین تھا پشاور آیا ہوا تھا میں نے خانسامے کے

طور پر اس کے پاس ملازمت کی اس نے مجھے سارے کرتب بتا دیئے - اس کے جانے کے بعد میں میجک کا کام کرتا رہا ایک دن اپنے ایک نئے شاگرد کو میں نے ایک ہی قسم کی دو انگوٹھیوں میں سے ایک دی کہ وہ اسے اپنی قمیض کی جیب میں ڈال لے اور میں اپنے پاس والی انگوٹھی غائب کرکے اس کی جیب میں سے انگوٹھی نکال لوں گا - جب میں نے انگوٹھی کا کام شروع کیا اور اپنی والی انگوٹھی بتا کر کہا کہ یہ انگوٹھی سب لوگ دیکھ لیں اسے سب کے سامنے میں غائب کرکے آپ حضرات میں سے کسی کی جیب سے نکال لوں گا - عین اسی وقت اس لڑکے کا باپ اسے ڈھونڈتا ہوا آیا اور اسے کان سے پکڑ کر لے جانے لگا تو جاتے جاتے اس نے مجھے آواز دی کہ اپنی انگوٹھی سنبھالو میں جا رہا ہوں اس سے بڑی کرکری ہوئی کہ سارے مجمع نے فساد مچا دیا اور میرا سارا سامان توڑ پھوڑ دیا اس کے بعد میں نے یہ کام چھوڑ دیا -

ساحر لدھیانوی - شورش کاشمیری جو میرا یار تھا - لاہور میں میں گیا تو تین چار دن ہوٹل میں شغل ناؤ نوش میں مصروف رہے وہ ان دنوں بے کار تھا اور ہندوستان جانا چاہتا تھا - شورش نے جس کے ساتھ وہ لاہور سے ہفت روزہ چٹان نکل رہا تھا اسے بھارت بھاگ جانے پر مجبور کر دیا - جن دنوں شورش ترقی پسندوں کے خلاف ہفت روزہ چٹان میں زہر اگل رہا تھا میں نے ساحر کو لکھا :

" تمہارے دیئے ہوئے ہتھیار سے تمہارا یار شورش ہمارے خلاف جہاد میں مصروف ہے "-

ایک عرصے بعد ساحر کا خط آیا -

گھبراؤ نہیں " وہ اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گا "-

پھر واقعی ایسا وقت آیا کہ وہ خود اپنے مخالفین کے غیظ و غضب کا نشانہ بنا اور کونے کھدروں میں پناہ ڈھونڈتا پھرا - وہ اپنے ہی ہم مشرب ساتھی کوثر

نیازی کے ہاتھوں بر سر عام رسوا ہوا۔ مجھے ساحر کے الفاظ رہ رہ کر یاد آرہے تھے
ش ایک دفعہ احمد ظفر کسی بات پر مجھ سے خفا تھے۔ مجھے علم تھا کہ جب بھی ملاقات ہوگی مجھے اس کے عتاب کا ہدف بننا پڑے گا۔ اس خدشے سے میں پنڈی جا کر بھی اس سے ملنے سے گریز کرتا رہا۔ اس دوران ڈاکٹر سید عبداللہ نے پشاور یونیورسٹی میں اردو کانفرنس کا انعقاد کیا۔ احمد ظفر بھی اس کانفرنس میں شمولیت کے لئے اچانک میرے ہاں وارد ہوا۔ میں اسے دیکھ کر گھبرا گیا کہ نجانے میرا کیا حشر کرے گا۔ لیکن وہ حسب معمول بڑے تپاک سے ملا اور کوئی شکوہ شکایت کرنے کی بجائے کہا چلو کانفرنس میں نہیں جانا میں نے معذرت کی کہ ہمیں دعوت نہیں دی گئی تم جاؤ وہاں سے ہو کر آجانا۔

اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ سرحد میں اردو کانفرنس ہو اور فارغ اور رضا کو نہ بلایا جائے۔ میں نے بتایا کہ یہ ان کے انتظامی معاملات ہیں کسی وجہ سے انہوں نے ہمیں بلانا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ تم ضرور جاؤ۔ وہ ایک دم بپھر گیا نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اگر انہوں نے تمہیں نہیں بلایا تو ہم بھی نہیں جائیں گے۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ اس نے میری ایک نہ سنی اور اسی وقت کانفرنس میں شرکت کے بغیر واپس چلا گیا۔

احمد فراز، محسن احسان اور خاطر غزنوی کے ٹولے میں یوسف رجا چشتی کا اضافہ بھی عجیب تھا۔ ان چاروں کی چوکڑی جب جمتی تو عجیب ماحول بن جاتا۔ رجا جب فارغ التحصیل ہوا تو فوج میں چلا گیا۔ ہم ایسے دوستوں سے جو حکومت کے کھاتے میں کبھی نیک نام نہیں رہے۔ فوج جیسے حساس محکمے کے افسر کا میل جول کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ایک دن طلوع آفتاب کے وقت دروازے پر دستک ہوئی دروازہ کھول کر دیکھا تو اچھا بھلا معقول یوسف رجا نیکر

اور بنیان میں کھڑا ہانپ رہا تھا - حیران ہو کر پوچھا یہ کیا تماشا ہے بولا اپنے گاؤں بدھائی سے دوڑ لگاتا ہوا آرہا ہوں میں نہایت سنجیدگی سے اسے کافی دیر سمجھاتا رہا کہ ہم سے اس کا رابطہ نقصان دہ ہو سکتا ہے - لیکن وہ بڑا بے وقوف نکلا ان دنوں حالات بڑے خراب تھے آئے دن ہماری خانہ تلاشیاں ہو رہی تھیں اور افواہ گرم تھی کہ دو چار روز میں ہماری گرفتاری ہونے والی ہے ایک دن وہ اچانک فوجی وردی میں آن نازل ہوا عرصے بعد ملاقات ہوئی اس لئے بڑی خوشی ہوئی دیر تک ہنستے ہنساتے رہے اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس نے یہاں آکر بڑی حماقت کی ہے اس کا اظہار اس سے کیا تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا اور بولا تم میری فکر نہ کرو نوکری جاتی رہی تو اپنی زمینداری کر لوں گا کیا فرق پڑتا ہے یہ تھی وضع داری اور دوستی جو آج کل ناپید ہو چکی ہے -

انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام کوہاٹ میں ایک کل ہند ادبی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ جسمیں سیماب اکبر آبادی مرحوم کو صدارت کے لئے مدعو کیا گیا - سیماب مرحوم پہلے پشاور آئے چند دن دائرہ ادبیہ میں قیام کیا وہ اس وقت خاصے ضعیف ہو چکے تھے - کئی بیماریوں میں مبتلا تھے ایک ملازم صرف دوائیں اٹھانے کے لئے ہر وقت ساتھ رہتا لیکن اس کے باوجود ان کے حوصلے بلند اور ہمت جواں تھی - کوہاٹ جانے سے پہلے انہوں نے کچھ دیر کے لئے تخلیہ چاہا اور اس مختصر وقفے میں خطبہ صدارت کے علاوہ "خیبر" پر ایک طویل نظم لکھ ڈالی میں نے اپنی زندگی میں اتنا پرگو اور زود نویس قلم کار نہیں دیکھا - مشاعرے سے پہلے انہوں نے اپنا شعری نرخنامہ ہمیں جتایا جو یوں تھا - بولے کوئی شاعر اگر لکھوانا چاہئے تو اس ریٹ پر لکھ کر دے سکتا ہوں -

پورا دیوان =/300 روپے

فی غزل =/5 روپے
فی نظم =/8 روپے
رباعی یا قطعہ =/8 روپے

مرزا محمود سرحدی کی وفات کے بعد مسعود انور شفقی نے اس کا دیوان چھپوانے کے لئے اس وقت کے ڈی سی پشاور سے کہہ کر یونین کونسلوں کے فنڈ سے روپیہ قرض لیا مجھے اس کے گھر سے مسودات منگوا کر دیئے کہ اس عظیم شاعر اکبر سرحد کا دیوان مرتب کرلیا جائے تاکہ کلام محفوظ ہو سکے - میں نے شب و روز کی محنت سے دیوان مرتب کیا اور مضبوط دیباچہ لکھا اور اسے اندیشہ شہر کے نام سے شفقی نے مرزا کے انتقال کے چھ ماہ بعد شائع کروا دیا۔ جس کا صلہ ہم دونوں کو یہ ملا کر مرزا کے جاہل بھائی نے ایک مقدمہ دائر کر دیا اور دوسرا کسی اور فراڈ شخص نے دائر کرا دیا اور ہم دونوں تقریباً" تین برس تک پیشیاں بھگتتے رہے یہاں تک کہ مرزا کے بھائی سدھارے تو کہیں جا کر گلو خلاصی ہوئی - شفقی اس دوران بڑی عاجزی سے میری طرف دیکھ کر کہتا - فارغ یار آخر ہم نے کیا قصور کیا ہے میں مسکرا کر جواب دیتا "اور گنے چوپو"

ابن انشاء کو کبھی ہم نے ملول یا افسردہ نہ دیکھا - گورنمنٹ کالج میں مشاعرہ تھا وہ شروع ہونے سے تھوڑی دیر سے پہنچا تو سب دوستوں نے خوشی کا نعرہ لگایا کسی سرکاری کام سے آیا تھا - مشاعرے کا سن کر آدھمکا مشاعرے کے بعد رات بھر انشاء کے لطائف سے محفل زعفران زار بنی رہی وہ اس رات کا دولہا تھا ہمیشہ کی طرح مونگ پھلیاں کھاتا رہا اور ظرافت کے شگوفے چھوڑتا رہا تمام رات ہنس ہنس کر ہمارے پیٹوں میں بل پڑ گئے - کچھ ہی دنوں کے بعد مجھے عتیق بھائی کے خط سے معلوم ہوا کہ اسے کینسر ہوگیا ہے اور حالت تشویشناک

ناک ہے جب لندن علاج کے لئے جانے کا علم ہوا تو عتیق سے پوچھا کہ ابھی تو وہ پشاور آیا تھا ٹھیک ٹھاک تھا اس نے کہا ان دنوں اس کو یہ علم ہو چکا تھا کہ اسے کینسر ہے اور آخری سٹیج ہے میں اس کے اس رات کے قہقہے یاد کر کے رونے لگا۔

سرگودھا میں مشاعرہ تھا۔ منتظمین نے کسی حویلی میں ٹھہرایا تھا۔ مشاعرہ ختم ہونے کو آ رہا تھا کہ عدم غائب۔ تلاش میں سرگودھا کا کونہ کونہ چھان مارا آخر رات دو بجے مشاعرے کے خاتمے پر ایک سستے سے ہوٹل میں نشے میں دھت برآمد ہوئے۔ دو آدمی عدم کو سہارا دے کر سٹیج پر لائے۔ وہ رینگتا رینگتا مائک تک پہنچا اور پڑھنا شروع کیا پھر ایسا رواں ہوا کہ بیسیوں غزلیں کہہ کر مشاعرے کو گرما کر رکھ دیا۔

ایک دفعہ اسی طرح اختر شیرانی کا پتہ چلا کہ پشاور ریڈیو پر تشریف لائے ہیں ضیاء جعفری، نذیر مرزا برلاس، رضا اور میں بھاگ کر صادق نیوز ایجنسی کے مالک اور اپنے دوست لالہ وزیر محمد کے گھر پہنچے دیکھا تو اردو شاعری کا رومانوی مجتہد فرش پر مدہوش بیٹھا چھلکوں سمیت سنگترے کھا رہا ہے۔ لالے نے کہا آپ فارغ بخاری کو یاد کر رہے تھے وہ آ گئے۔ اختر نے منہ بنا کر کہا فارغ بخاری یہ کس جانور کا نام ہے۔ اگلی صبح میں مطب جا رہا تھا قصہ خوانی میں صادق نیوز ایجنسی سے گزرا تو لڑکے نے آواز دی اور کہا اختر شیرانی صاحب بلا رہے ہیں میں اندر گیا اٹھ کر بڑے پیار سے ملے رات کے واقعے پر ندامت کا اظہار کیا۔ معافیاں مانگیں اور بولے یہ سب اس ام الخبائث کا کیا دھرا ہے مجھ سے عبرت حاصل کرو اور اس کے نزدیک مت پھٹکو میں نے کہا کوئی بات نہیں ایسا ہو جاتا ہے۔ اتنے میں اختر نے سیلزمین سے بوتل مانگی اس نے کہا لالہ نے منع کیا ہوا ہے وہ بولا صرف سر دردی کے لئے ایک گھونٹ پیوں گا۔ اب جو اس نے جم

خانے کی بوتل اسے تھمائی تو اس نے منہ سے لگالی اور آدھی ختم کر دی پھر مجھ سے دو چار منٹ دوستوں کے متعلق پوچھتا رہا پھر منہ سے لگائی اور پوری ایک سانس میں ختم کر کے خالی بوتل قصہ خوانی کی مصروف سڑک پر اچھال پھینکی۔ جہاں وہ دھماکے سے کرچی کرچی ہو کر بکھر گئی۔ لوگ ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جمع ہو کر ادھر ادھر جھانکنے لگے کہ یہ کس کا کارنامہ ہے۔ شکر ہے ہم دکان میں ایک بڑے شوکیس کے پیچھے اس طرح بیٹھے تھے کہ کسی کی نظر نہ پڑی ورنہ ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔

1934ء کا واقعہ ہے۔ ایک دن گرمی کے موسم میں کوئی تین بجے میں حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کے حجرے میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا باہر دو آدمی کھڑے تھے ایک تو مولانا صاحب کی مسجد کا خادم تھا۔ دوسرا کوئی اجنبی شخص تھا۔ خادم نے کہا کہ یہ مولانا صاحب کے مہمان ہیں۔ میں انہیں مولانا صاحب کے پاس لے گیا۔ علیک سلیک ہوئی لیکن مولانا نے انہیں نہیں پہچانا اسی اثناء میں اس شخص نے نجانے کسی زبان میں کچھ کہا۔ مولانا اٹھ کر اس کے ساتھ بغل گیر ہو گئے پھر وہ بڑی دیر باتیں کرتے رہے میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا وہ بڑی پر اسرار شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے مولانا سے میری بابت پوچھا اور تسلی ہونے پر اس نے اپنی ران سے باندھا کپڑا کھولا اور اس کپڑے میں لپٹے تین لمبے لمبے لفافے نکالے ایک مولانا صاحب کے نام تھا۔ دو کسی اور کے نام۔ لفافے پر بیضوی قسم کی مہر لگی ہوئی تھی جب یہ خط مولانا نے لے لئے تو میں سمجھا پرائیویٹ خط ہوں گے۔ اس لئے وہاں سے رخصت ہوا تو انہوں نے کہا برخوردار اس شخص کے متعلق کسی سے ذکر نہ کرنا۔ اگلے روز میں نے مولانا سے اس شخص کے

متعلق پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ جا چکا ہے - آخر میں مولانا سے پوچھا تو انہوں نے متنہاری پشتو کا ترجمہ کر کے مجھے سنایا لکھا تھا -

عالی مرتبت

آپ کے بھیجے ہوئے دونوں آدمی خیرت سے پہنچ گئے ہیں - یہ بڑے بہادر اور شریف آدمی ہیں' ڈاکٹر صاحب نے قلعے کا کام سنبھال لیا ہے اور مستری صاحب بھی اپنے کام پر لگ گئے ہیں - پچھلے دنوں سے انگریز فوجیں ہماری پہاڑیوں پر گولہ باری کر رہی ہیں - جس کا ہم جواب دے رہے تھے - مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کی پارٹی ہندوستان کی رائے عامہ کو سرحدات میں برٹش گورنمنٹ کی فارورڈ پالیسی کے خلاف تیار کرنے کے لئے کانفرنسیں منعقد کر رہی ہے - کئی دنوں سے ہمیں اخبارات نہیں مل رہے - شاید راستے میں گڑ بڑ ہے - میرا آدمی جب آپ کے پاس پہنچے تو اسے فوراً واپس بھیج دیں اور دو لفافے جو بھیج رہا ہوں ایک مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرا مولانا حسین احمد مدنی کی خدمت میں جلد ارسال کر دیں یہ بہت ضروری خطوط ہیں -

عزیزی

میرا سلام ان نوجوانوں کو پہنچا دیں جنہوں نے پشاور میں گورا فوج کی ٹرین اور لارڈ ولنگڈن کی ٹرین کو بموں سے اڑانے کی کوشش کی حقیقت میں یہی وہ کام ہے جو سرحدات پر فرنگیوں سے لڑنے والے مجاہدین کو فائدہ پہنچا سکتا ہے - ایک خوش خبری سن لیں - ہمارے مجاہدین نے چھوٹی چھوٹی توپیں بنا لی ہیں آپ کبھی بنوں دورے پر آئے تو آپ سے ملاقات ہوگی -

مخلص

فقیرایپی

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی' مولانا آزاد' مولانا حسین احمد مدنی اور فقیر ایپی جیسی میری آئیڈیل سامراج دشمن شخصیتوں کے اس خفیہ رابطے اور مل کر جدوجہد کرنے کا مجھے پتہ چلا تو خوشی سے اس دن ساری رات نیند نہ آئی -

سرحد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس ہماری پالیسی کے مطابق رضا خاطر فراز کے کہنے پر شاہی باغ یا نذر باغ میں ہوتے تھے بعد میں یہ اتنے مشہور ہوئے کہ برصغیر کی مشہور ہستیاں فیض احمد فیض' عبدالحمید عدم' مولانا حسرت موہانی' چراغ حسن حسرت' تلوک چند مرحوم' سعادت حسن منٹو' مولانا تاجور نجیب آبادی کبھی کبھی سرحد اسمبلی کے سپیکر ملک خدا بخش' سردار عبدالرب نشتر اور خان عبدالقیوم خان نے بھی ان میں شرکت کی - ان ہی دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا -

تقسیم ملک کے بعد سجاد ظہیر کی شہریت بھارتی تھی لیکن وہ بوجوہ پاکستان میں تھے اور انڈر گراؤنڈ زندگی گزار رہے تھے - پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں روس کے دو ادیب شرکت کر رہے تھے اس نے ایک دن ہمارے کسی ساتھی سے پوچھا کہ "سجاد ظہیر کجا ست" سجاد ظہیر کہاں ہے - وہ بیچارا فارسی نہ جانتا تھا س نے انڈر گراؤنڈ کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا "زیر زمین است" یعنی زمین کے اندر ہے - روسی ادیبوں نے پریشان ہو کر پوچھا کہ وہ کب فوت ہوا - رضا کو ہنسی آگئی اور اس نے فوراً ان کے سامنے وضاحت کی جس پر وہ خوب قہقہے لگانے لگے -

سجاد ظہیر جب انڈر گراؤنڈ تھے تو ایک دن میرے پاس پشاور آن پہنچے عجیب ہیئت کذائی تھی - داڑھی چھوڑ رکھی تھی' سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا - قصہ

خوانی میں میری ان دنوں کتابوں کی دکان ہوا کرتی تھی وہ وہاں آئے ان کے ساتھ ہمارا دوست محمد حسین عطا بھی تھا اور یہ دونوں پنڈی سازش کیس میں ملوث تھے اور ان دنوں ان دونوں کے پیچھے پورے ملک میں پولیس سرگرداں تھی - میں انہیں گھر لے آیا لیکن بہت پریشان تھا کہ کیا کروں کیونکہ ان دنوں آئے دن میرے گھر پر بھی چھاپے پڑ رہے تھے - میں سوچتا تھا کہ اگر یہ یہاں سے پکڑے گئے تو کہیں تنظیم کے لوگ یہ نہ سوچیں کہ میں نے ان کو مخبری کروا کے پکڑوا دیا ہے - ہم نے گھر کے سب سے اوپر والے کمرے میں ان کو ٹھہرلیا اور باہر نکلنے سے منع کر دیا - ایک دن رات کو ہمیشہ کی طرح میری بیٹھک میں دوستوں کی محفل لگی ہوئی تھی کہ یہ دونوں حضرات نیچے آن دھمکے - اس سے پہلے کہ میں بول پڑتا سجاد ظہیر بولا ہم پنڈی کے فارغ کے دوست ہیں اور شاعر ہیں آج ہی پہنچے ہیں سوچا فارغ سے مل آئیں - ان کے جانے کے بعد تک، جب تک میں نے نہیں کہا کسی کو علم نہ ہوسکا کہ وہ ترقی پسند اور ادب کا مہاتما گاندھی سجاد ظہیر تھا -

کوہاٹ میں مشاعرہ تھا - قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی، رضا ہمدانی میں اکٹھے وہاں پہنچے - ایک فوجی شاعر اپنا تھرڈ کلاس مجموعہ کلام چھپا کر لایا ہوا تھا اور ہر شاعر کو پانچ پانچ کتابیں بانٹ رہا تھا - ہم آنے لگے تو اس نے ہمیں بھی پانچ پانچ مجموعے تھما دیئے اب ہم اتنا بوجھ اٹھا کر پریشان، قتیل نے لڑے پر ہم سے سب کتابیں لیں اور ایک بھکاری کو دے دیں - ساتھ ہی دو روپے بھی دے دیئے سب نے پوچھا کہ بھئی تم نے بھکاری کو کتابیں دیں یہ تو بہت اچھا کیا یہ دو روپے کس خوشی میں دیئے - قتیل مسکرا کر بولا پیسے اس خطرے کے پیش نظر دیئے کہ کہیں کتابیں واپس نہ کردے -

پشاور میں اباسین آرٹس کونسل نے ادبی کتابوں پر انعامات کا سلسلہ شروع کیا مجھے میری کتاب پر انعام ملا تو میری بیٹی سدرہ نے کہا ابو ریفریجریٹر لے لیں پھر دوسری کتاب پر ملا تو وہ آدم جی ایوارڈ تھا رقم بھی زیادہ تھی - سدرہ نے ڈرائنگ روم کا نیا فرنیچر لے لیا اب وہ میری کتابوں پر انعام کا انتظار کرتی اور گھر کی نئی چیزیں اس نے ان انعامات کی رقم سے خرید لیں - آج تک وہ اس بات کو یاد کرتی ہے اور کہتی ہے ابو ہمارے گھر میں ٹی وی سے نے لے کر کرسیوں تک آپ کے انعامات کا نتیجہ تھے اور یہ کہ اگر میں ضد نہ کرتی تو نجانے کتنی کتابیں ظہور پذیر نہ ہوتیں -

بیماری

مجھے لندن ہی سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ میری یادداشت خراب ہو گئی ہے - پاکستان آنے کے بعد یہ بیماری آہستہ آہستہ زیادہ ہونی شروع ہوئی - رضا ہمدانی کے بچوں نے حیات آباد میں نیا مکان بنا لیا اور رضا ہمدانی حیات آباد جا پہنچا - اب میرے اور اس کے درمیان بارہ میل کا فاصلہ تھا - یہاں سے ہماری دونوں کی بربادی کا آغاز ہوا - پشاور میں رہتے ہوئے ہم کئی کئی دن نہ مل سکتے- میں ساحر مصطفائی کے ساتھ وہاں جاتا کہ راستہ بھولنے کی عادت ان دنوں عام ہو چکی تھی - دو سالوں کے بعد پاکستان میں یکایک آٹھویں ترمیم کے ذریعے پھر اسمبلیاں توڑ دی گئیں - اب ایک ڈھونگ رچایا گیا اور فوجی جنتانے دھاندلی کے الیکشن کرا کے نواز شریف کو اقتدار سونپ دیا - قمر عباس اب پھر اپوزیشن میں تھا روزانہ جلسے اور جلوس، زندہ باد، مردہ باد بے مقصد سیاست جس میں نہ مجھے کوئی تبدیلی کی توقع تھی نہ عوام کا اصل راج دور دور نظر آرہا تھا اب پاکستان میں نظریات کی سیاست نے اقتدار کی سیاست کا رخ اختیار کر لیا تھا -

ایکدن میں نے لندن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ ہم مرگئے ہیں گھر والے دھاڑیں مار مار کر رو رہے ہیں، لوگوں سے گھر بھرا پڑا ہے - ہمیں غسل دیا گیا، کفن پہنایا گیا - چارپائی پر ڈال کر جنازہ اٹھایا گیا - اب جنازہ جا رہا ہے لوگوں کا ہجوم ہے - کندھے دیئے جا رہے ہیں کچھ لوگ خاموش ہیں - کچھ رشتے دار رو رہے ہیں کچھ کلمہ خیر سے یاد کر رہے ہیں کچھ اپنی باتوں میں لگے ہوئے ہیں -

یکایک مجھے احساس ہوا کہ میں تو زندہ ہوں - اٹھ کر لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں زندہ ہوں پھر سوچتا ہوں اتنا کچھ ہو چکا - لوگوں نے اتنی زحمت کی

ہے قبر بن چکی ہے - کفن ہو چکا ہے اب بیچاروں کو کیا تکلیف دینی - چھوڑو دفنانے دو اور دم سادھ کر خاموش ہو جاتا ہوں اور لوگ مجھے دفنا کر چلے جاتے ہیں -

پاکستان میں نظریات کی سیاست کے خاتمے کے ساتھ ہی عوام اسی قسم کے جنازوں میں دفنائے جا رہے ہیں - وہ زندہ ہیں لیکن کفن دفن ہو رہا ہے - میں نے ایک دن قمر عباس سے کہا کہ اس سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنا کام کاج کرو - جب اپنے خوابوں کے محل تعمیر نہ کر سکو تو دوسروں کے خواب دیکھنا چہ معنی دارد لیکن وہ اب اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ کمبل اسے نہیں چھوڑ رہا تھا -

بہر حال پھر ایک دفعہ پاکستان کی سیاست میں اقتدار کا ڈرامہ اٹھا اور منتخب اسمبلیاں توڑ دی گئیں اب پھر وہی انتخابات کا ڈھونگ رچا اور بے نظیر برسر اقتدار آگئی عوام کو کچھ نہ ملا البتہ میرا بیٹا پھر وزیر جیل خانہ جات و شہری امور و ایکشن شہری بہبود کے قلم دان لے کر جھنڈا لہراتا گھر آن پہنچا -

ایک دن میں روزانہ حسب معمول واک کر رہا تھا کہ قمر عباس نے جھنڈے والی گاڑی کھڑی کی اور باہر نکل کر مجھے کہا آئیں ابو آپ کو جہاں جانا ہے اتار دوں - میں نے کہا میں واک کر رہا ہوں وہ بولا ابو کیا بات ہے پچھلی وزارت میں بھی آپ کبھی میری گاڑی میں نہیں بیٹھے اور اس دفعہ بھی مجھے حسرت ہی رہی کہ آپ ایک دفعہ میری گاڑی میں بیٹھیں لیکن آپ ہمیشہ انکار کر دیتے ہیں - میں نے کہا بیٹے پہلی بات تو یہ کہ اگر میں چاہتا تو ساری زندگی ایسی گاڑیوں میں گزار سکتا تھا دوسری یہ کہ تم بھی اس کی عادت نہ ڈالنا یہ اقتدار تو چکلے کی طوائف کی مانند ہے آج تمہارے پاس ہے تو کل کسی اور کی گود میں بیٹھا نظر آئے گا - وہ سعادت مند بچوں کی طرح جی درست ہے کہہ کر

گاڑی میں اجازت لے کر چلا گیا۔

آہستہ آہستہ لوگوں کے بقول میری یادداشت زیادہ ہی خراب ہو گئی اب سب مجھے احساس دلانے لگے کہ آپ ایک ایک بات دس دس دفعہ کرنے لگے ہیں۔ کوئی چیز رکھتے ہیں تو پھر یاد نہیں رہتی۔ قمر عباس اور طاہر عباس نے مجھے ڈاکٹروں کے پھیرے لگوانے شروع کر دیئے۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کو بتایا معلوم ہوا کہ ڈائمینشیا کے مرض کا شکار ہو چکا ہوں۔ بہر حال میں زندگی گزار ہی رہا تھا کہ اچانک ایک دن رضا کی بیماری کی خبر آئی۔ رضا جو میرا دوست تھا۔ رضا جو میرا ساتھی تھا۔ رضا جو میرا ہم سفر تھا۔ رضا میرا ہم زاد تھا۔ میں ہسپتال گیا تو مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس کا سانس ٹھیک طریقے سے نہیں چل رہا تھا وہ مجھ سے باتیں کرنے میں تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

" فارغ میرا سانس رکنے لگتا ہے تو ڈاکٹر کو بلاتا ہوں وہ اس طرح اسے محسوس نہیں کر سکتا۔ جس طرح میں محسوس کرتا ہوں میں نے کل اسے کہا کہ ڈاکٹر جب یہ سانس رکتی ہے تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ تو شمع کی پھڑکتی لو کی طرح کسی وقت بجھ جائے گا اس کا کچھ کرو"

میرا دل پھٹنے لگا کاش میں رضا کو اپنی سانسیں دے سکتا۔ میں گھر آیا تو اپنے کمرے میں بیٹھ کر اکیلا روتا رہا کیا وہ مجھ سے جدا ہو جائے گا نہیں میں سر جھٹک دیتا۔ پھر میں اکیلا کیسے رہوں گا۔ اس نے تو آج تک کوئی کام مجھ سے پوچھے بغیر نہیں کیا۔ صبح گھر میں ایک ہل چل مچ گئی۔ سارا گھر رونے لگا اور مجھے گاڑی میں بٹھا کر رضا کی لاش کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ سب مجھے دیکھ کر رونے لگے ایک کہرام بپا ہو گیا۔ میرے پیچھے کھڑا کوئی رشتہ دار کہہ رہا تھا شاید یہ لاش دیکھ کر ان کی یادداشت لوٹ آئے لیکن میں سوچ رہا تھا کہ رضا نے تو کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑا وہ تو زندگی کی ہر سختی نرمی میں میرا سایہ بن کر میرے ساتھ رہا

اب کس دل سے اس نے مجھے چھوڑ کر موت قبول کی ہوگی۔

ایک لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ جس پر سب رو رہے تھے اور ایک لاش فارغ کی صورت کھڑی تھی جسے کوئی اس حالت میں دفن کرنے کو تیار نہ تھا کہ دفن کرنے کے اپنے لوازمات ہوتے ہیں جو میں پورے نہ کر سکا تھا۔

رضا کی موت کے بعد مجھے واقعی محسوس ہونے لگا کہ میں یادداشت کھو چکا ہوں۔ اب تو میں زندہ لاش تھا جسے اٹھا کر پھرایا جاتا وقت پر دوائیاں دی جاتیں۔ میری بہوئیں بیٹے اور بیوی نے میری بے انتہا خدمت کی بشیر اور کمال حسین دونوں نوکر میرے ساتھ ہوتے اور پھر وہ حادثہ ہوا جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

ایک دن مجھے ایک اور لاش کے سامنے کھڑا کر دیا گیا زخموں سے چور یہ لاش کس کی ہے میں سوچ رہا تھا کہ تمام گھر کیوں دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے یہ زخمی چہرے والا شخص ہاں مجھے کچھ کچھ یاد آیا یہ محاصل ہے میرا داماد لیکن یہ کیوں زخمی ہے۔ لاش کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگے میری بیٹی سدرہ چلائی ابو عذرا مر گئی۔ آپ کی بیٹی مر گئی ابو جی وہ مجھ سے چمٹ گئی۔

عذرا مر گئی وہی عذرا جسے میں کچھ دن نہ دیکھوں تو میرے دل کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ جس کی پیدائش پر رفیعہ نے میری طرف ملتجی نظروں سے دیکھا اور جب نانی چنو نے کہا خیر ہے خدا اگلی بار بیٹا دے گا تو مجھے غصہ آگیا تھا اور میں نے نانی سے کہا بیٹی تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے مجھے اس بات کی قطعاً" کوئی فکر نہیں کہ بیٹا ہوتا ہے یا نہیں آپ پھر ایسی باتیں نہ کریں۔

وہ عذرا آج میرے سامنے پلنگ پر خاموش پڑی تھی اور میں یادداشت کھو چکا تھا۔ اچھا ہے مجھے کبھی یاد آتا ہے کبھی نہیں اگر مکمل یادداشت ہوتی تو یہ منظر کون دیکھ سکتا تھا۔ مجھے ہاتھوں سے پکڑ کر بٹھا دیا گیا۔ اس کا جنازہ اٹھا تو شہر

کا ہر بچہ بوڑھا رو رہا تھا بس میں خاموش تھا کہ میری تو یادداشت ہی نہ تھی۔

اب میری عجیب حالت تھی مجھے پانی دیتے تو میں پینا چاہتا لیکن پانی کس طرح پیتے ہیں یہ مجھے یاد نہ رہا تھا۔ پانی منہ میں ہوتا اور میں نگلنا بھول چکا تھا۔ بیٹی نوالہ منہ میں ڈالتی تو بار بار کہتی ابو اسے نگل لیں اسے کھالیں۔ کیسے میں سوچتا۔ جب بشیر مجھے نہلاتا یا طاہر یا قمر یا رفیعہ نہلانے کے لئے باتھ روم لے جاتیں تو میں پانی کے نل کی طرف دیکھتا رہتا۔ یہ پانی پھوار بن کر میرے جسم پر گرتا تو مجھے بڑا اچھا لگتا لیکن خود نہا نہیں سکتا تھا کہ میں تو نہانا بھی بھول گیا تھا

اب دوست آتے تو میرا دل چاہتا کہ وہ میرے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ لگائیں خاطر شعر سنائے۔ محسن ہنستا رہے فراز قصے سناتا جائے لیکن یہ کیا میں تو بولنا بھی بھول چکا ہوں۔ محسن خاطر فراز کے ساتھ کیسے باتیں کروں۔ مجھے تو اپنا کوئی شعر یاد نہیں۔ کوئی قصہ یاد نہیں اور یہ کیا یہ سارے دوست کچھ دیر بیٹھ کر چلے کیوں جاتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو کیوں آجاتے ہیں۔ ہاں شاید وہ اس فارغ کو ڈھونڈ رہے ہیں جو کبھی ان کی محفلیں سجاتا تھا جب سب کو اکٹھا کر کے بٹھاتا اور خوش ہوتا۔ لیکن میں ان سے کیسے کہوں کہ مجھے تو دیکھ کر یہ رونے لگتے ہیں۔ بہت بڑا شاعر ہے خاطر کہتا۔ شبلی کہتا اس خطے کی تاریخ ہے۔ میں کتاب لکھوں گا آغہ جی پر اور پھر شبلی میرا یار واقعی کتاب بھی لکھ کر لے آیا وہ اس دن بڑا خوش تھا۔ دیکھیں آغہ جی میں نے آپ کی سوانح عمری لکھی ہے۔ قمریار آغہ جی کی بڑی خواہش تھی کہ اپنی سوانح حیات مکمل کرلوں میں نے اسی خیال سے یہ کتاب لکھی ہے۔ وہ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا آغہ جی کیسی ہے یہ کتاب میں نے کتاب ہاتھ میں لے لی۔ سرورق پر میری اور بے نظیر کی فوٹو تھی۔ آغہ جی ذرا دیں وہ طاہر کو اس سے

کچھ سنانا چاہتا تھا میں نے کتاب مضبوطی سے پکڑ لی وہ کتاب میری گرفت سے نہ نکل سکا - شبلی بھائی میری بیوی بولی اب تک کتابوں سے انہیں عشق ہے - کتاب یا اخبار لے لیں تو پھر کسی کو نہیں دیتے - شبلی ہنسنے لگا اور میں کتاب کی طرف دیکھ رہا تھا یہ لڑکی کون ہے میں سرورق پر اپنے ساتھ بیٹھی بے نظیر کو دیکھ کر سوچنے لگا - لورا - نہیں برما کے مولانا عبدالرؤف کی بیٹی نہیں وہ تو ایسی نہ تھی کہیں یہ کلکتے میں میرے فلیٹ کے سامنے رہنے والی میری ہندو دوست چاندنی تو نہیں - مجھے کچھ یاد نہ آرہا تھا - شبلی چلا گیا میری بہو فرحت نے مجھے دوائی دی دوسری بہو نیلو نے مجھے روٹی کھلائی قمر اور طاہر نے میرے ہاتھ پیر دبائے اور رفیعہ نے کہا اب انہیں سلا دینا چاہئے پھر نیند نہیں آئے گی - انہوں نے مجھے فوم پر لٹایا اور کمبل ڈال کر بتی بجھا دی - اندھیرا میرے چاروں طرف اندھیرا ہے - مجھے کچھ کچھ یاد آرہا ہے - لندن - ایک اکیلا فلیٹ رات کی تنہائی - کلکتہ ایک کمرہ کونے میں بچھا ہوا ایک بستر رات کا اندھیرا بھجن کے گانے کی آواز' کب تک یہ اندھیرا کمرہ ہوگا - کب تک رات کو میں اکیلا سوتا رہوں گا - ہاں وہ جیل کا تاریک کمرہ ہر رات کو باہر سے سب اچھا کی آوازیں' جنگلے' لوہے کی سلاخیں' آزادی کی تڑپ - میں سو گیا -

ابو کو کل ہسپتال لے جانا ہے ان کے ہاتھ پیروں پر سوجن ہو رہی ہے سارے بچے قمر' طاہر' سدرہ ان کے بچے رفیعہ بیٹھ کر فیصلہ کر رہے تھے - اب تو بیٹا انہوں نے کھانا بالکل چھوڑ دیا ہے - رفیعہ بولی - امی ڈاکٹر نے جو ڈبے والی خوراک دی ہے وہ ضرور دیا کریں اس میں تمام وٹامن موجود ہیں یہ خصوصی طور پر ایسے مریضوں کے لئے بنائی گئی ہے طاہر بولا قمران کو کچھ ڈرپ لگوا لیں - تاکہ ذرا طاقت بحال ہو - سدرہ بولی' فرحت' بشیر صبح ان کو نیچے گلی میں لے کر جاتا ہے یا نہیں یہ بہت ضروری ہے - قمر نے بیوی سے پوچھا جی ہاں روزانہ

لے کر جاتا ہے اس نے کہا۔

میں سوچنے لگا میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں بس یاد کچھ نہیں رہا اور بول نہیں سکتا پھر یہ سب اس قدر پریشان کیوں ہیں کمرے میں انیس اور نفیس داخل ہوئے میرے رضا کے بیٹے) آموں (وہ مجھے فارسی زبان کا لفظ آموں سے یاد کرتے ہیں (کیا حال ہے؟ میں بمشکل بول سکا ٹھیک اے وہ بڑے خوش ہوئے سب کے چہرے کھل اٹھے - انیس نے مجھے رضا کی تصویر بتائی آموں یہ کون ہے رضا میں نے بڑی مشکل سے لفظ ادا کیا۔ سب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ابھی تک رضا کو نہیں بھول سکے رفیعہ کہنے لگی - مجھے بڑا دکھ ہوا کیسے بھول سکتا ہوں اس کا لاشہ تو مجھے ابھی تک یاد ہے - بس تم بھول گئے ہو اسے دفن کر دیا اور میرا لاشہ لئے ڈاکٹروں کے پاس پھر رہے ہو -

دوسرے دن میں ہسپتال میں تھا مجھے ہوش آیا تو سب میرے سرہانے کھڑے تھے سب کی جان میں جان آئی - ان لوگوں نے پھر مجھے زندہ کردیا - مجھے انتہائی افسوس ہوا ان کے چہرے کی کھلاہٹ مجھے کچھ اچھی نہ لگی - رضا میرا انتظار کر رہا ہے - عذرا میری راہ تک رہی ہے - ممتاز راستے میں بیٹھا ہے - مجھے اپنی ماں یاد آئی وہ پرہیز گاری کا مجسمہ - جھریوں بھرے چہرے پر نور کا ہالہ - سینکڑوں آیات پڑھ کر دم کی ہوئی چینی، جس کی ایک خوراک سے اس کی بڑی سے بڑی بیماری ٹھیک ہو جایا کرتی تھی - مجھے پچاس سال کی عمر میں بھی بچہ سمجھنے والی مجھے بھائی یاد آرہا تھا لعل بادشاہ - رزق حلال سے جس کے چہرے پر بشاشت کا سمندر موجزن رہتا - مجھے ہر کتاب کے پھاڑنے پر نئی کتاب لا کر دیتا اور مصنوعی غصے سے کہتا اب اگر تم نے جان بوجھ کر پھاڑی یا گم کردی تو بہت ماروں گا - مجھے چمن بادشاہ اپنا بھائی یاد آیا جس نے ساری عمر مجھے دیس دیس گھمایا - سید بادشاہ بھائی یاد آرہے تھے جس کے بھرے بھرے بازوؤں میں میں

نے دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی تھی۔

یہ مجھے کیوں روک رہے ہیں اب تو وہ فارغ نہیں رہا جو ملک کے ترقی پسند ادب کی پہچان تھا۔ اب تو میں اس ملک کے کچلے ہوئے مزدوروں، کسانوں کے لئے ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا۔ اب تو میں پختونوں کے ادب کو پوری دنیا میں روشناس کرا چکا ہوں۔ اب تو وہ انقلاب میرے لئے ایک خواب بن چکا ہے جس میں مساوات ہو۔ کوئی وڈیرا نہ ہو کوئی لوٹنے والا نہ ہو نہ کوئی لٹنے والا ہو۔ نہ ظالم کی زنجیروں کی جھنکار ہو نہ مظلوموں کی سسکیوں کی آواز۔ نہ ملوں میں مزدوروں کے خون سے بننے والے ریشم کے کپڑے ہوں نہ ان کی مزدوری سے پلنے والے موٹے پیٹوں والے سیٹھ۔ اب کیا رہ گیا ہے۔ میں تو ناکامی کا ایک پتلا ہوں میں تو ہارنے والا وہ جواری ہوں جو ساری عمر کی پونجی ہار کر جوار خانے کے باہر ایک کرسی پر صرف اس لئے بیٹھا ہے کہ جوار خانے میں کتنے نئے جواری آرہے ہیں کتنے جا رہے ہیں۔ اب مجھے زندہ رکھنے کا فائدہ۔ کاکا صنوبر حسین نہ رہا جو انگریزوں سے ملک آزاد کرکے بھی قید خانے سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ باچا خان نہ رہا جو ساری عمر جدوجہد کرکے بھی دس اصلی خدائی خدمتگار نہ بنا سکا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نہ رہا جو ملک کو آزاد کرا کے بھی ہندو، مسلم، فسادات بند نہ کرا سکا۔ بھگت سنگھ نہ رہا جو تمام انسانوں کے مقدس آدرش کی خاطر لڑتا ہوا سولی چڑھ گیا لیکن دنیا اسے سکھ کی نظر سے دیکھتی رہی۔ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی نہ رہے جو ساری زندگی صعوبتیں سہہ کر بھی اجالے کو نہ دیکھ سکے۔ پھر فارغ کے زندہ رہنے کا کیا جواز؟

بہر حال مجھے بچا لیا گیا تمام بچے خوشی خوشی مجھے پھر گھر لے آئے مجھے سامنے بٹھا کر محفل سجا لی گئی تمام خاندان جمع ہوا۔ وہ مصطفیٰ شاہ، مجتبیٰ شاہ، بشیر، فرزند، منصور میرے بھتیجے میرے مجسمے کو سامنے بٹھا کر خوش ہیں۔ وہ

چچا کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ ان کے خاندان کا سب سے بڑا بزرگ ہے۔
مختار علی نیر، انور علی آخونزادہ، اقبال آخونزادہ بھی بیٹھے ہیں وہ میرے گزرے ہوئے واقعات بیان کر رہے ہیں۔ مختار کہہ رہا ہے مصطفیٰ وہ وقت یاد ہے جب سنگ میل پر پابندی لگی تو راتوں رات فارغ صاحب نے پولیس سے بچنے والے رسالے ہمیں دیئے کہ ان کو چھپا دو کل بانٹتے ہیں۔ مصطفیٰ کہنے لگا ہماری تربیت میں چچا کا بہت بڑا ہاتھ رہا آج ہم جو کچھ ہیں ان کی محبت بھری توجہ کی وجہ سے ہیں۔ قمر کہنے لگا مجھے تو اپنا سارا ورثہ دے گئے ہیں جیلیں، قید و بند، سیاست، یارانے، دوستانے سب کچھ ہی میرے حوالے کر دیا ہے۔
میں سن رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا بول نہ سکتا تھا۔ شناخت نہ کر سکتا تھا لیکن سب کو اکٹھا بیٹھے دیکھ کر اچھا اچھا لگ رہا تھا۔ اپنی باتیں سن کر سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی ایسا تھا۔ کب تھا یہ مجھے کچھ یاد نہ تھا۔
اسی طرح دن گزرتے گئے اب مجھے صبح نہلا دیا جاتا۔ بستر پر لٹا دیا جاتا وقت پر بہو کھانا کھلاتی۔ کپڑے پہنائے جاتے رفیعہ دوسرے بستر پر بیٹھ کر سارا دن قرآن اور نمازیں پڑھتی اور مجھے دیکھتی رہتی ایک آدھ دن کے لئے اگر وہ کہیں چلی جاتی تو کمرہ مجھے عجیب سا لگتا۔ وہ آ جاتی تو میرے اندر روشنی سی پھوٹ جاتی۔ میں نے اسے بڑے دکھ دیئے ہر اس شخص کو جو دنیا میں کچھ کرنا چاہتا ہے ایسی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔
پھر۔ پھر ایک دن اچانک کچھ لوگ گھبرائے ہوئے آئے۔ سارا گھر گھبرایا ہوا تھا۔ ملک میں پھر الیکشن ہو رہے تھے۔ قمر قومی اسمبلی کا الیکشن لڑ رہا تھا۔ دوپہر کے وقت گھر میں ہنگامہ سا ہو گیا۔ لڑائی ہو گئی کوئی بولا۔ گولیاں چل گئیں۔ دوسرا بولا قمر اور سدرہ کے بیٹے کو گولیاں لگی ہیں حالات خراب ہیں۔ ہسپتال میں آپریشن کیا جا رہا ہے تین افراد مر گئے ہیں مخالف امیدوار غلام بلور کا جواں

سال بیٹا بیچارا بھی مر گیا - دوسرا بولا ایک انجینئر بھی موقع پر مر گیا - تیسرا بولا وہ تھانیدار امان اللہ قمر کو بچاتے بچاتے خود گولیوں کی نذر ہو گیا -

میرا سر چکرانے لگا - بس بس اب مجھ سے اور لاشیں نہیں دیکھی جاتیں - اب میں کسی رضا کی لاش دیکھنے کو تیار نہیں - اب کوئی کسی عذرا کی لاش میرے سامنے نہ لائے - میں ممتاز کا جنازہ نہیں دیکھ سکتا -

قمر میرا چہیتا بیٹا - میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا - میری بیوہ بیٹی سدرہ نے کن مشکلوں سے اسد علی بلو کو پالا ہے - میں نہیں دیکھ سکتا - میں نہیں دیکھوں گا -

لوگ میرے گھر جمع ہیں وہ رو رہے ہیں مجھے نہلایا جا رہا ہے کفن پہنایا جا رہا ہے کندھا دیا جا رہا ہے ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہیں - خطرے کی وجہ سے چاروں طرف پولیس ہے زندہ بھی وہی ساتھ تھی مر کر بھی پولیس کا پہرہ موجود ہے - اب نماز جنازہ پڑھی گئی - میں لندن میں دیکھے گئے خواب کی طرح زندہ ہوں لیکن اب اٹھ کر کسی کو بتانا نہیں چاہتا - دفنا دو مجھے کہ اس کے بعد کچھ دیکھنے کی ہمت نہیں اچانک مجھے یاد آیا کہ میں تو سادات گھرانے کا چشم و چراغ ہوں - میرے جنازے میں ذکر بھی ہو گا - اسی دوران میرے کانوں میں ذکر کے یہ اشعار گونجنے لگے -

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو برائے تماشا چی آمدی

تصانیف و تالیفات فارغ بخاری

(1)	آیات زندگی	مراثی و منقبت	1940
(2)	پشتو لوک گیت	تحقیق	1951
(3)	زیر و بم	شعری مجموعہ	1952
(4)	اٹک کے اس پار بہ اشتراک رضا ہمدانی	انتخاب نظم و نثر	
(5)	ایک مشاعرہ	روداد	1955
(6)	صلاح الدین ایوبی	بچوں کیلئے	1955
(7)	عورت کا گناہ	افسانے (جلد دوم)	1955
(8)	انتساب	افسانے	1955
(9)	ادبیات سرحد	تحقیق	1955
(10)	رحمان بابا کے افکار (بہ اشتراک رضا ہمدانی)		1956
(11)	خوشحال کے افکار	ایضاً"	1956
(12)	منتخب ادب	ایضاً"	1956
(13)	باچہ خان	سوانح	1957
(14)	برات عاشقاں	رپورتاژ	1960
(15)	سرحد میں اردو	مقالہ	1960
(16)	نویاں راھواں	ہندکو شعری انتخاب	1965
(17)	پشتو شاعری	انتخاب پشتو شاعری	1956
(18)	شیشے کے پیرہن	شعری مجوعہ	1971

(19)	البم (اول)	خاکے	1978
(20)	البم (دوم)	خاکے	1978
(21)	خوشبو کا سفر	شعری مجموعہ	1978
(22)	غزلیہ	شاعری	1979
(23)	خوشحال خان خٹک	تحقیق	1980
(24)	آئینے صدیوں کے	شاعری	1985
(25)	محبتوں کے نگارخانے	شاعری	1987
(26)	بے چہرہ سوال	شاعری	1987
(27)	لوح غیر محفوظ	رپورتاژ	1987

سید فارغ بخاری، ایک بلیغ ادبی حوالہ

☆ فارغ میری رائے میں اپنے دوستوں رضا ہمدانی اور خاطر غزنوی کے ہمراہ اردو میں پشتو شعر و ادب کے نہایت ہی بلیغ ترجمان تھے پھر خود فارغ کی شاعری کو ہم اعلیٰ درجے کی شاعری قرار دے سکتے ہیں۔ فارغ بخاری کی صورت میں ہم محض ایک نہایت عزیز دوست ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے بلیغ ترین حوالے سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔

(احمد ندیم قاسمی)

☆ فارغ بخاری ہم سے جدا ہو گیا ہے۔ لیکن ہمارے دلوں میں وہ اس وقت تک آباد رہے گا جب تک ان دلوں کی دھڑکنیں زندہ ہیں۔ شعراء کے ایک بڑے گروہ کو انہوں نے ذہنی تربیت بخشی۔ ان کی محفلوں میں بیٹھ کر میں نے بھی اور میرے دوسرے ہم عصروں نے بہت کچھ سیکھا۔

(احمد فراز)

☆ فارغ اس ہراول نسل کا نمائندہ تھا جو گزشتہ پچاس برس سے ہماری ادبی زندگی پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اس نے ترقی پسند سوچ کو فروغ دیا۔ ترقی پسندی ایک ایسا جذبہ ہے جس کی ہر پل اور ہر وقت ضرورت محسوس ہوتی رہے گی۔ فارغ بخاری کے چلے جانے سے اس میدان میں ایک خلا محسوس ہوگا۔ ہمیں اس کی ضرورت محسوس ہوتی رہے گی وہ نہیں ہے لیکن اس کی آواز زندہ رہے گی۔

(امجد اسلام امجد)

☆ فارغ بخاری مرحوم برصغیر پاک و ہند کے نامور شاعر اور ادیب تھے اور پشتو ادب، تاریخ اور ثقافت کو متعارف کرانے کے لئے انہوں نے نمایاں اور گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں

(اجمل خٹک)

☆ فارغ بخاری نے قلم کی حرمت اور لفظوں کے وقار کو جس طرح زندہ رکھا وہ ان ہی کا ہنر ہے۔

(سجاد بابر)

☆ فارغ میرا یار تھا۔ ظالم کیا گزرا مجھے مار ہی گیا۔ ہماری دوستی ذاتی ہی نہیں نظریاتی بھی تھی۔ مجھے اردو زبان میں اپنی تحریریں شائع کرنے کا موقع فارغ کے سنگ میل ہی سے میسر آیا۔ وہ کیا گیا اس سے وابستہ وہ یادیں چھوڑ گیا جن میں ہماری محبتیں، ہماری لڑائیاں، ہمارا روٹھنا منانا، مشورے اور پیار آگے بڑھانے کی روایات شامل ہیں۔

(قلندر مومند)

☆ محبتوں کا شاعر محبتوں کا آدمی، فارغ بخاری ہماری سینئر نسل کا ایک اہم شاعر جس نے سرحد کے ادبی افق پر نمایاں ادبی کارکردگی سے ماحول کو جگمگا دیا۔ اس کی شاعری وطن کی محبت انسانیت سے محبت اور امن عالم کی تمنا اور پیار سے عبارت ہے۔ اس کے فکر و فن میں جذبے اور خیال کی دل آویز آمیزش ملتی ہے۔ اس نے ایک بڑی نسل کو اپنے کلام سے متاثر کیا۔

(محسن احسان)